انیس امروہوی
وہ جن کی یاد آتی ہے

انیس امروہوی

وہ جِن کی یاد آتی ہے

(فلمی شخصیات)

وہ جن کی یاد آتی ہے

(فلمی شخصیات)

مصنف:

انیس امروہوی

زیراہتمام:

تخلیق کار پبلشرز

163، سیکنڈ فلور، جے۔ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

نام کتاب : وہ جن کی یاد آتی ہے (فلمی شخصیات)
ناشر و مصنف : انیس امروہوی
رابطہ : 09811612373, qissey@rediffmail.com
تعداد : ۵۰۰

زیر اہتمام : انیس امروہوی
○ تخلیق کار پبلشرز
163، سیکنڈ فلور، گلی نمبر۔۵، جے۔ ایکسٹینشن، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲

سر وَرق : مسعود التمش
کمپوژنگ : رچنا کار پروڈکشنز، لکشمی نگر، دہلی۔۱۱۰۰۹۲
مطبع : روشن پرنٹرس، چوڑی والا، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶

ملنے کے پتے:

- بک امپوریم، اُردو بازار، سبزی باغ، پٹنہ۔۸۰۰۰۰۴
- کتاب والا، پہاڑی بھوجلہ، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- مکتبہ جامعہ لمٹیڈ، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتب خانہ انجمن ترقی اردو، اردو بازار، جامع مسجد، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، گلی وکیل، کوچہ پنڈت، لال کنواں، دہلی۔۱۱۰۰۰۶
- کتاب دار، جلال منزل، ٹیمکر اسٹریٹ، نزد جے۔ جے۔ اسپتال، ممبئی۔۴۰۰۰۰۸

T.P.: 0290 ISBN-978-93-85258-08-4
WO JINKI YAAD AATI HAI *(Film Personalities)* 2015
By ANEES AMROHVI ₹ 300.00
TAKHLEEQKAR PUBLISHERS
163, 2nd Floor, J - Extension, Laxmi Nagar, DELHI-110092
Ph.:011-22442572, 9811612373 E-mail: qissey@rediffmail.com

○

اداکار **فاروق شیخ**

ہدایت کار **ساگر سرحدی**

شاعر **حفیظ آتش**

قلمکار **ولی محمد چودھری**

............دیگر مخلص ادبی و فلمی دوستوں

کے نام

○○

فہرس

وہ جن کی یاد آتی ہے ....

پیش گفتار

ایک زمانہ تھا جب فلموں میں کام کرنا یا فلموں سے وابستگی رکھنا معیوب سمجھا جاتا تھا، اور ہمارے ہندوستانی معاشرے میں ایسے لوگوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا تھا جو کسی بھی طور فلموں سے تعلق رکھتے ہوں۔ اُنیسویں صدی کی اس عظیم ایجاد سے اس قدر نفرت یا بے تعلقی کی کوئی مدلل وجہ نہیں تھی، بلکہ ہمارے معاشرے کا نظام اور اس کی اخلاقی قدریں ایسی ہی تھیں کہ ہمارے سماج کا ایک بڑا طبقہ سنیما کو معیوب سمجھتا تھا۔ ۱۹۳۱ء سے باقاعدہ متکلم فلموں کا آغاز ہو جانے سے اس طرف لوگوں کی توجہ دھیرے دھیرے بڑھنے لگی اور آج عالم یہ ہے کہ فلمیں ہماری زندگی کا ایک اہم حصہ بن گئی ہیں۔

آج تمام دُنیا میں فلم کو ایک زبردست میڈیا کے طور پر تسلیم کیا جا چکا ہے۔ ہمارے ملک میں فلموں کی تاریخ سو برس مکمل کر چکی ہے۔ ان دس دہائیوں میں فلمی صنعت نے بہت سی زمانہ ساز شخصیات کو جنم دیا ہے، جنہوں نے اس میڈیم کو بتدریج ترقی دے کر آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ اب ہمارا سماج فلموں سے وابستہ اشخاص کو عزت کی نگاہ سے دیکھنے لگا ہے۔

فلمیں انسانی جذبات اور اس کی سوچ کے اظہار کا ایک زبردست ذریعہ بن چکی ہیں اور اپنے ابتدائی دور سے ہی فلموں کے مختلف شعبوں میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں رہی

جو یا تو باکمال تھے یا گہری سوچ وفکر رکھتے تھے۔ ایسے لوگوں نے نہ صرف اچھی فلمیں بنائیں بلکہ گزشتہ صدی کے اس سب سے طاقتور میڈیا میں نت نئے تجربات کر کے آج اس مقام پر پہنچا دیا ہے کہ فلم ہمارے سماج اور ہماری زندگیوں میں رچ بس گئی ہے۔

اُردو زبان کو عوام الناس تک پہنچانے اور عام ہندوستانی لوگوں میں اردو کو مقبول بنانے میں ہماری فلموں نے بھی گراں قدر خدمات انجام دی ہیں۔ فلموں کے مختلف شعبوں میں بہتر کارکردگی نبھانے اور عوام میں اس پُراثر میڈیا کو مقبول بنانے میں جن لوگوں نے انتھک محنت کی ہے، ان کی شخصیات اور ان کے فن پر اردو میں کتابی شکل میں بہت کم کام ہوا ہے۔

اداکاری، فلمسازی، ہدایتکاری، موسیقی، فوٹوگرافی، رقص، مکالمہ نویسی، منظرنامہ نگاری، کہانی کاری اور نغمہ نگاری، غرض فلم کے ہر شعبہ میں ایسے لوگ ہوئے ہیں اور ابھی بھی ہیں جنہوں نے فلموں کو موجودہ شکل تک پہنچانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ایسے لوگوں کے فن اور شخصیت پر اردو ادب میں بہت کم لکھا گیا ہے۔ زیر نظر کتاب ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' ایسی ہی قدآور فلمی شخصیات کے فن اور ان کی شخصیت پر میرے مضامین کا دُوسرا مجموعہ ہے۔ اس سے قبل اس موضوع پر میری کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' ۲۰۰۷ء میں شائع ہوکر مقبولیت حاصل کر چکی ہے۔ اس کتاب میں فلمی صنعت کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والے بہت سے باکمال فنکاروں کی زندگی اور اُن کے فن پر روشنی ڈالی گئی تھی اور یہ کتاب اردو ادب میں فلم سے متعلق ایک تاریخی دستاویز کی حیثیت سے قبول کی گئی۔ زیرنظر کتاب ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' میں بھی ایسے ہی لوگوں کی شخصیت اور فن پر تحقیقی اور معلوماتی مضامین شامل ہیں جو اب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں، مگر اُن کے فن اور اُن کی شخصیت

نے نہ صرف ملک کے عوام کو بلکہ غیر ممالک کے لوگوں کو بھی متاثر کیا ہے۔ ایسے لوگوں کی اب صرف یادیں ہی باقی رہ گئی ہیں۔

میں نے ان مضامین میں ان اشخاص کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ہی ان لوگوں کی زندگی کے اہم واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے، جس سے نہ صرف یہ مضامین دلچسپ بن گئے ہیں، بلکہ زیادہ معلوماتی بھی ہو گئے ہیں۔ اس کاوش سے میرا ایک خاص مقصد یہ بھی ہے کہ ان شخصیات کی حیات اور کارنامے اردو ادب میں کتابی شکل میں ایک دستاویز بن کر محفوظ ہو جائیں اور موجودہ نسل اور آنے والی نسلوں کے لئے کارآمد اور مشعل راہ بھی ثابت ہوں۔

فلمی شخصیات پر مضامین لکھنے کا یہ سلسلہ تقریباً چالیس برس قبل اُس وقت شروع ہوا تھا، جب ۱۹۷۲ء میں اداکارہ مینا کماری کے انتقال پر میں نے ایک مضمون ''......کہ فسانہ بن گئی ہے'' لکھا تھا، اور جب میں ۱۹۸۳ء میں دہلی سے شائع ہونے والے ایک فلمی جریدے ''مووی اسٹار'' کی ادارت سے باقاعدہ طور پر وابستہ ہوا تو اس قسم کے مضامین کا یہ سلسلہ کئی برس تک مستقل چلتا رہا۔ بعد میں ایک ہندی فلمی ماہنامہ ''مینکا'' کی ادارت کے وقت بھی یہ سلسلہ ہندی میں جاری رہا۔ اردو اور ہندی میں ان مضامین کے قارئین کی ایک بہت بڑی تعداد ہے، جو اِن مضامین کو نہ صرف دلچسپی سے پڑھتے ہیں بلکہ اپنے ریکارڈ میں محفوظ بھی رکھتے ہیں۔

میں نے بہت سی فلمی ہستیوں سے ذاتی تعلقات اور اپنی فلمی صحافت کے مشاہدات کی وجہ سے ان مضامین کو زیادہ سے زیادہ معلوماتی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مضامین فلموں کے حوالے سے اردو ادب و فلم کے قارئین کے لئے ایک بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوں گے۔ میں نے اپنی تقریباً ۴۲ر برس کی فلمی

صحافتی زندگی کا ماحصل ان مضامین کی شکل میں اکٹھا کیا ہے۔ کیونکہ بنیادی طور پر میں ایک افسانہ نگار ہوں، اس لئے ان تحریروں میں میرے قارئین کو کہیں کہیں افسانوی رنگ بھی دیکھنے کو ملے گا۔

اس کتاب میں آپ کو کئی اہم شخصیات پر مضامین کی کمی ضرور محسوس ہوگی۔ اس کی ایک خاص وجہ تو یہ ہے کہ میں نے زیرنظر کتاب میں اُن ہی شخصیات پر مضامین شامل کیے ہیں جو اَب ہمارے درمیان نہیں رہے ہیں۔ مگر یہ میرا وعدہ ہے کہ اس کتاب کی تیسری جلد میں ان تمام دیگر اہم شخصیات کو بھی شامل کروں گا، جو پہلی اور دوسری جلدوں میں شامل نہیں ہو سکے ہیں۔ اس ایک کتاب میں تمام لوگوں پر مضامین کی گنجائش بھی نہیں ہے، پھر بھی میں نے کوشش کی ہے کہ زیادہ سے زیادہ اہم شخصیات کو اس میں شامل کرسکوں۔

OO

—انیس امروہوی

انیس امروہوی: ایک تعارف

انیس امروہوی کو میں کب سے جانتا ہوں............؟

۹/ اکتوبر ۱۹۵۳ء بروز جمعہ۔

جی ہاں! یہ وہی دن ہے جب اُتر پردیش کے مردم خیز اور مشہورِ زمانہ شہر امروہہ میں انیس امروہوی کا جنم ہوا۔ اِن کی ابتدائی تعلیم امروہہ کے ہی اسکولوں اور کالجوں میں ہوئی۔ والد جناب صوفی شریف احمد صاحبؒ صابری (مرحوم) مذہبی رجحان اور عقائد تصوف میں دلچسپی رکھنے والے ایک باذوق قاری تھے۔ تالیف وتصنیف کا شوق تو نہ تھا، مگر مطالعہ پابندی سے کرتے تھے اور شاید لاشعوری طور پر انیس امروہوی کو مطالعہ کا شوق اُن سے وراثت میں ملا ہے۔ انیس نے جب شعوری طور پر اردو ادب کا مطالعہ شروع کیا تو محسوس کیا ہوگا کہ اظہارِ خیال کے لئے لکھنا بھی چاہیے...... اور صرف پندرہ برس کی عمر میں پہلی کہانی ''دھندلا عکس'' لکھی جو کانپور سے شائع ہونے والے ایک ادبی رسالہ ''رگِ سنگ'' میں شائع ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں صحافتی سرگرمیاں شروع کر ڈالیں اور زمانۂ طالب علمی میں ہی ایک مقامی ہفت روزہ ''کمالِ مشرق'' سے وابستگی رہی۔ صحافتی زندگی میں انیس امروہوی کا یہ پہلا عملی قدم تھا۔

فلم ''پاکیزہ'' کے ریلیز ہونے کے بعد مارچ ۱۹۷۴ء میں فلمساز وہدایتکار کمال امروہوی صاحب سے ایک طویل انٹرویو لیا، جو بمبئی سے شائع ہونے والے فلمی رسالہ ''سب رنگ'' میں بڑے سائز کے آٹھ صفحات پر شائع ہوا۔ شاید انیس امروہوی کی کسی قدآور فلمی شخصیت سے یہ پہلی صحافتی ملاقات تھی۔ کمال امروہوی صاحب نے بھی کمالِ

شفقت کا ثبوت دیتے ہوئے اِن کے سوالات کا نہ صرف بالتفصیل جواب دیا، بلکہ سوالات کی بہت تعریف بھی کی، جس سے اِن کو بہت حوصلہ ملا اور کاروانِ نقدِ تحریر آگے بڑھتا رہا۔

لکھنے کا یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے، مگر اس میں نئی جہتیں شامل ہو گئی ہیں۔ کہانی کے علاوہ فلمی و سیاسی مضامین اور ٹی۔وی اسکرپٹ بھی لکھے ہیں۔ ٹی۔وی اسکرین پر اداکاری کو بھی انہوں نے اظہارِ خیال کا ذریعہ بنایا ہے اور اردو کے ناشر کی حیثیت سے بھی اپنی پہچان کرائی ہے۔ ان سب مشاغل و مصروفیات کے باوجود لاشعوری طور پر پڑی ہوئی مطالعہ کی عادت جو پہلے تھی، سو اَب بھی ہے اور اِن سب پر غالب ہے۔

۳۱ر دسمبر ۱۹۷۳ء کو انیس امروہوی کی شادی ہوئی، اُس وقت یہ گیارہویں کلاس میں زیرِ تعلیم تھے۔ علم حاصل کرنے کا اتنا شوق تھا کہ اِس حادثے کے بعد بھی سلسلۂ تعلیم جاری رکھا۔ اس سلسلے کا ایک دلچسپ پہلو یہ بھی ہے کہ جب انیس امروہوی ایم۔کام کے آخری سال میں تھے تو اُن کی بڑی بیٹی شبانہ انیس نے کے۔جی کلاس میں جانا شروع کر دیا تھا۔

۱۹۷۸ء میں مرادآباد کے ہندو ڈگری کالج سے ایم۔کام کی سند حاصل کرنے کے بعد کچھ عرصہ بمبئی کے فلمی حلقوں میں بھی گزرا۔ ۱۹۸۱ء میں جب مستقل طور پر دہلی میں سکونت اختیار کرنے کی غرض سے وطنِ عزیز امروہہ میں اپنی کشتیاں جلاکر دہلی آئے تو شروع میں پارٹ ٹائم اکاؤنٹس کا کام کیا۔ مگر یہ کام مزاج سے میل نہیں کھاتا تھا، اس لئے ۱۴ر ستمبر ۱۹۸۲ء کو دہلی کے ایک بہت بڑے اشاعتی ادارے ''اسٹار پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ'' کے شعبۂ اردو میں انچارج کی حیثیت سے ملازمت شروع کر دی اور ۱۹۸۳ء میں اِسی ادارے سے شائع ہونے والے فلمی ماہنامہ ''مووی اسٹار'' کی ادارت بھی سنبھال لی۔ اِس کے ساتھ ہی ۱۹۸۴ء میں ہندی ماہنامہ ''ہندی اسٹار'' اور ''اسٹار ساہتیہ'' کی ادارت سے بھی وابستہ ہو گئے۔

۱۹۸۸ء میں ملازمت ترک کر دی اور دُوردرشن کے لئے بننے والی ایک ٹیلی فلم

''مٹی دھند، جگ چانن ہویا'' میں بحیثیت چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر وابستہ ہو گئے۔ اِس کے بعد اِسی حیثیت سے بچوں کے لئے ایک سائنس فکشن ٹیلی سیریل ''راجو اور اُڑن طشتری'' اور ایک سماجی سیریل ''اپنا جہاں'' مکمل کئے۔ اِسی درمیان کئی اشتہاری فلموں، ٹیلی فلموں اور سیریلوں میں بحیثیت اداکار بھی کام کیا۔ دُوردرشن کے لئے ۱۹۹۷ء میں ایک دستاویزی سیریل ''اردو تھیئٹر : آزادی کے بعد'' پروڈیوس کیا اور سن ۲۰۰۰ عیسوی میں کشمیر کے حالات پر ایک ٹیلی فلم ''ایک نئی صبح'' بحیثیت فلمساز بنائی۔ بعد ازاں ۲۰۰۵ء میں دُوردرشن کے لئے ۵ رقسطوں کا ایک دستاویزی سیریل ''واپسی سے پہلے'' بحیثیت فلمساز، مصنف و ہدایتکار بنایا۔ یہ سیریل اُن کشمیری مہاجرین کے مسائل پر مبنی تھا جو کشمیر کی دہشت گردی کے نتیجے میں ملک کے مختلف شہروں میں کسمپرسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

۱۹۸۴ء میں افسانوں کا ایک انتخاب ''اردو کے بہترین افسانے'' مرتب کر کے شائع کرایا، جو بہت مقبول ہوا۔ ہندی میں غزلوں کا انتخاب ''اردو شاعری آپ کی پسند'' اور سعادت حسن منٹو کی کہانیوں کا انتخاب ''ٹھنڈا گوشت'' مرتب کر کے شائع کرائے۔
۱۹۸۶ء میں ایک سیاسی کتاب ''جنرل ضیاء کا نیا شکار...... بے نظیر بھٹو'' بھی شائع ہوئی۔
۱۹۹۰ء میں اردو افسانوں کا نیا انتخاب ''افسانہ ۸۹ء'' شائع ہوا، جو بے حد مقبول ہوا۔
۲۰۰۷ء میں فلمی شخصیات کی زندگی اور فن سے متعلق انیس امروہوی کی ایک اہم کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' شائع ہوئی جو اُردو ادب میں فلموں سے متعلق ایک اہم دستاویزی کتاب کی حیثیت رکھتی ہے۔ ۲۰۱۰ء میں ہندوستانی فلموں سے متعلق مختلف موضوعات پر انیس امروہوی کی دوسری کتاب بعنوان ''پس پردہ'' شائع ہو کر مقبول ہوئی اور اس کتاب کو اُترپردیش اُردو اکیڈمی اور دہلی اُردو اکیڈمی نے انعامات سے نوازا۔ اسی سلسلے کی تیسری کتاب ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' زیرِ طبع ہے۔ ایک انتخاب ''صدی کا افسانہ'' اور اردو نظموں کا انتخاب ''دو زاویے'' بھی زیرِ ترتیب ہیں۔
ہندوستان و پاکستان کے لگ بھگ سبھی اُردو اور ہندی کے مقبول رسائل وجرائد میں انیس امروہوی کی تخلیقات اور مضامین شائع ہو چکے ہیں۔

دہلی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت ہندی فلمی ماہنامہ ''مینکا'' میں مئی ۱۹۹۰ء سے بحیثیت مدیر بھی کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ہندی میں ماہنامہ ''سسپنس کہانیاں'' کا اجراء کرایا اور ادارت کے فرائض بھی انجام دیئے۔

۱۹۸۸ء میں اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ ''تخلیق کار پبلشرز'' کے نام سے شروع کیا اور اب تک اس ادارے سے تقریباً تین سو زائد انتہائی خوبصورت ومعیاری کتابیں شائع کر چکے ہیں اور کئی زیرِ طباعت ہیں۔ اُردو میں بہترین معیاری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں تین بار دہلی اُردو اکیڈمی، حکومت دہلی انیس امروہوی ''منشی نول کشور ایوارڈ برائے بہترین ناشر'' سے بھی نواز چکی ہے۔ اس کے علاوہ ۲۰۱۰ء میں ''ساہس ڈگری کالج''، نوگاواں سادات (ضلع امروہہ) کی جانب سے انیس امروہوی کی مجموعی ادبی و اشاعتی خدمات کے اعتراف میں ''مینارِ علم'' ایوارڈ سے بھی نوازا جا چکا ہے۔ انہوں نے اپنے اشاعتی ادارے ''تخلیق کار پبلشرز'' سے ادبی سہ ماہی رسالہ ''قصے'' کا اجراء بھی کیا، جو ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی بے حد مقبول ہوا۔

انیس امروہوی لکھنے کے مقابلے میں پڑھنے کو زیادہ ترجیح دیتے ہیں۔ وہ ہر موضوع پر دلچسپی سے مطالعہ کرتے ہیں۔ لکھنے کے معاملے میں گو کہ اُن کا خاص میدان فلم ہے، فلموں سے متعلق دستاویزی معلومات سے بھرپور اُن کے مضامین بطور خاص پسند کئے جاتے ہیں۔ ممبئی سے شائع ہونے والے کثیر الاشاعت اُردو اخبار ''انقلاب'' میں انیس امروہوی کے فلمی شخصیات سے متعلق مضامین تقریباً چار برس تک تواتر کے ساتھ شائع ہوتے رہے ہیں۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس، اُردو مجلس اور آکاشوانی کے نیشنل چینل سے ان کے فلمی مضامین سیکڑوں کی تعداد میں نشر ہو چکے ہیں۔

انیس امروہوی نے دہن اور ذہن رسا پایا ہے۔ صاف بات نہ لکھنے سے چوکتے ہیں اور نہ کہنے سے۔ اساتذہ کا احترام، نوآموزوں کی حوصلہ افزائی اور ساتھیوں پر بے لاگ تنقید و تبصرے میں قلم بھی استعمال کر لیتے ہیں اور زبان بھی۔ البتہ تیکھی بات پر بھی نہ قلم زہر اُگلتا ہے اور نہ زبان ترش ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مزاح کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں

چھوٹا۔ اپنی ذاتی زندگی میں ''سیلف میڈ'' قسم کے آدمی ہیں اور نظریاتی طور پر علامہ اقبال کے اس شعر کے قائل ہیں......

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتحِ عالم
جہادِ زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

۱۶رجنوری ۲۰۰۰ء کو انیس امروہوی کی بڑی بیٹی شبانہ انیس کی شادی مرادآباد کے ایک خاندان میں ہوئی اور اُسی برس ۱۶رمارچ ۲۰۰۰ء کو اُن کی اہلیہ ستارہ بیگم کا انتقال ہو گیا۔ زندگی کی تنہائی سے گھبرا کر اور ایک خاص قسم کی ادبی فضا اپنے اطراف میں محسوس کرنے کے لئے انیس امروہوی نے ۱۴ردسمبر ۲۰۰۲ء کو ڈاکٹر نیر جہاں سے شادی کر لی، جو خود بھی دو بار صاحبِ کتاب بن چکی ہیں۔ ڈاکٹر نیر جہاں کی ایک کتاب ''مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ'' ہے، جس پر انہیں جامعہ ملیہ اسلامیہ، دہلی سے پی۔ایچ۔ ڈی کی ڈگری تفویض کی گئی تھی، اور دُوسری کتاب مختلف مضامین کا مجموعہ ''تنقیحات'' شائع ہو چکی ہے۔ نیز کئی کتابیں زیرِ ترتیب ہیں، جن میں ایک کتاب ''گلستان بیت بازی'' عنقریب شائع ہونے والی ہے۔

انیس امروہوی کی زیرِ نظر کتاب ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' کے مطالعہ سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ موصوف فلمی دنیا سے کس قدر شغف رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اُردو میں اُن کی یہ تیسری کتاب بھی دستاویزی حیثیت کی حامل ہے۔

OO

—نسیم احمد صدیقی
C-4/211، یمنا وہار، نئی دہلی۔

انیس امروہوی اور اُن کی فلمی تحقیقات

(۱)

فلمی شخصیات اور اُن کے فن سے متعلق انیس امروہوی کی تصنیف کردہ تازہ کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' میرے پیشِ نظر ہے۔ یہ کتاب تین سو سے زائد صفحوں پر محیط ہے اور اِس کا موضوع ہے ہندوستانی فلمیں اور اُن سے تعلق رکھنے والے افراد، آغاز سے بیسویں صدی تک۔ جب عنوان کشش انگیز، موضوع لذّت آفریں، اور مصنف، محقق کے درجے کا واقف کار، جستجو پسند اور اہلِ قلم ودوات ہو، اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کتاب حقائق کی قاموس ہوگی اور اسے ٹھہر ٹھہر کر یعنی رفتہ رفتہ پڑھنا چاہیے تاکہ اس کے ہر صفحے پر جو انکشافات ہوتے ہیں وہ آپ کو متحیر کرنے، محظوظ کرنے اور اگر آپ کو فلم سے لگاؤ، رغبت اور معقول حد تک عشق ہے تو یہ کتاب آپ کو محو کر دینے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے۔ اب تو ہم لوگوں نے بصری اور سماعی معاملات میں اتنی ترقی کرلی ہے کہ رات ختم ہو جاتی ہے لیکن ٹیلی ویژن سے ہماری قربت اور ہم نشینی جاری رہتی ہے۔ خبریں تو خیر سننا ضروری ہے لیکن طرح طرح کی فلمیں اور سیریل دیکھنے کا شوق ہمارے خون میں سرایت کر گیا ہے اور شاید ہمارے اس کتاب کے فاضل اور ہوشمند مصنف نے اسی لیے کتاب کا عنوان ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' رکھا ہے، اور ہم جیسے کہن سال اور سن رسیدہ قارئین کو وہ زمانہ یاد آتا ہے (اور ہم دل مسوس کر رہ جاتے ہیں) کہ کیا زمانہ تھا جب ہم اپنے محبوب اداکاروں کو دیکھنے اور سننے کے لیے دیوانہ وار نگار خانوں اور سنیما گھروں کے چکر لگاتے تھے۔ ملی جلی صحبتوں میں بھی دیویکا رانی،

سہگل، پرتھوی راج کپور، اشوک کمار، کے۔ آصف اور پھر گیتا بالی، مینا کماری اور مدھوبالا کا ذکر کرکے خوش ہوتے تھے۔ وہ صرف فلمی باتیں تھیں لیکن انیس امروہوی نے (جنھیں ہم صرف امروہی کہنا چاہیں گے وہ کیوں اپنے قاریوں کو زحمت میں مبتلا کرنے پر مصر ہیں، امروہی میں صوتی حسن کا خیال کریں) اس کتاب کو فلمی ہوتے ہوئے بھی علمی بنا دیا ہے اور کتاب میں وقار و وقعت کے خوشبودار پھول کھلا دیے ہیں۔ یہ کتاب صرف اداکاری کے محدود پہلوؤں اور اداکاراؤں کے حسن، ہنر اور فن کا احاطہ نہیں کرتی، ان کی ابتداء تا آخر زندگی کا بایوڈاٹا بھی فراہم کرتی ہے اور اس احوال نامے میں ایسے ایسے واقعات کی تفصیل پیش کرتی ہے کہ قاری کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ مثلاً مدھوبالا کی زندگی کی کہانی آپ پڑھیں گے تو آپ پر رقت طاری ہو جائے گی۔ اس کہانی میں دلیپ کمار کا بھی ذکر آ گیا ہے۔ میرا خیال ہے آپ اس کتاب کے چار صفحے (۱۶۴ تا ۱۶۷) نہ پڑھیں تو اچھا ہے۔ چاروں صفحے آنسوؤں سے بھیگے ہوئے ہیں، اور اگر پڑھ ہی چکے ہیں تو فی الفور جانی واکر کی کہانی پڑھ لیجیے، تاکہ آپ کو پتہ چلے کہ جانی واکر کام کی تلاش میں آئے اور گرودت کے ''اجلاس'' پر حاضر ہوئے، وہ بھی کس حال اور حلیے میں۔ وہی اداکار جسے گرودت نے (جانی واکر کو) بے حال بلکہ بدحال دیکھ کر اپنے ملازموں سے کہا تھا کہ اس لڑکے کو اُٹھا کر باہر پھینک دو، وہی لڑکا جب اداکار بن کر پردۂ سیمیں پر آیا تو لوگوں نے اُسے سر آنکھوں پر بٹھایا۔ یہی کہانی نوشاد کی بھی ہے اور ساحر کی بھی۔ موسیقار اعظم نوشاد علی کا آبائی مکان لکھنؤ میں تھا۔ ان کے والد ماجد واحد علی کو نوشاد کی موسیقی سے دیوانگی کی حد تک دلچسپی نے اتنا برافروختہ کر دیا کہ انہوں نے ان کا باجا اُٹھا کر باہر پھینک دیا اور کہا کہ تم ابھی یہ فیصلہ کر لو کہ تمہیں گھر چاہیے یا گانا بجانا۔ نوشاد علی نے گھر چھوڑ کر موسیقی کو اپنا لیا (ص:۱۳۴)۔ اس کتاب کو آپ دل لگا کر پڑھیں گے تو آپ اس حقیقت کے قائل ہو جائیں گے کہ نہ صرف تاریخ ہی اپنے آپ کو دوہراتی ہے بلکہ گھریلو واقعات بھی اسکرپٹ بدل بدل کر ایک جیسے نظر آتے ہیں۔ ساحر لدھیانوی کی سحر انگیز اور پریت در آغوش کہانی پڑھئے اور دیکھئے کہ

معمولی واقعات کیسے شاہکار داستانوں کا روپ اختیار کر لیتے ہیں۔ ساحر کے والد کو اپنے بیٹے کو اپنی حفاظت کہیے یا حراست میں لینے کے لیے عدالت کے دروازے پر دستک دینی پڑی تھی۔ جب ان کے سات سالہ بیٹے عبدالحئی نے ماں کی سرپرستی میں رہنا پسند کیا تو چودھری فضل محمد کو عدالت سے تنہا لوٹنا پڑا۔ ساحر لدھیانوی نے بمبئی آکر فلمی دنیا کو زیر کر لیا۔ اقلیم شاعری میں تو ان کا سکہ پہلے ہی رائج ہو چکا تھا۔ دیگر واقعات میں سے چند دلچسپ قصے: کندن لعل سہگل نے جب محمد رفیع کو پہلی بار سنا تھا تو اسٹیج پر موجود سہگل نے خود رفیع کے گانے سے متاثر ہو کر انہیں شاباشی دی اور دعا بھی دی کہ تم ایک دن بہت بڑے گلوکار بنو گے (ص:۳۰)۔ محمد رفیع کی عمر صرف چودہ سال تھی۔ یہ کندن لعل سہگل کی مردم شناسی ہی تھی اور لحن شناسی بھی، اور محمد رفیع تو تھے ہی مقدر کے سکندر۔ اب مجروح سلطانپوری کی حیات کا مطالعہ کیجیے اور داد دیجیے مصنف کو کہ اس نے ابتداء سے آخر تک سچ کہا ہے، سچ لکھا ہے اور سچ پر اپنا بیان ختم کیا ہے۔

خاکسار کی مشکل یہ ہے کہ زیر نظر کتاب کے چالیس ممدوحین میں سے کم سے کم دس بلند پایہ اور معروف فنکاروں اور شاعروں سے میں بھی نہ صرف شخصی طور پر واقف رہا ہوں بلکہ ان میں سے چند کرم فرماؤں کا قریبی دوست بھی رہا ہوں اور اپنی دفتری زندگی میں کے۔ آصف جیسے ''مغل اعظم'' کی آن بان رکھنے والے ڈائریکٹر سے اپنے دفتر میں ایک مصالحانہ کارروائی میں محو تکلم بھی رہا ہوں، اس لیے اس سے پہلے کہ میں کسی اور طرف نکل جاؤں، اپنے اس بکھرے بکھرے تبصرے کو اس فرمائش پر ختم کرنا پسند کروں گا کہ آپ کو موضوع سے دلچسپی ہو نہ ہو، اپنے ممدوحین میں سے کم سے کم دو یا چار فنکاروں کے تو آپ پرستار رہے ہوں گے، ان کے حالات سے آگاہی حاصل کرنے کے لیے آپ کو اس کتاب کا خرید کر پڑھنا آپ پر فرض ہے، اور جب آپ کتاب ہاتھ میں لیں گے تو آپ کو اس بات پر ایمان لانا ہوگا کہ انیس امروہوی صرف تاجر کتب ہی نہیں، خود یعنی اندر سے باضابطہ ادیب بھی ہیں۔ ایسی نثر نگاری کے نمونے کم ہی ملتے ہیں۔ پاپڑ بیلنا مردوں کا کام نہیں ہے لیکن اس کتاب کے لکھنے کے لیے

انہوں نے تین سو زیادہ پاپڑ بیلے اور لوہے کے کتنے چنے نوش فرمائے ہیں، اس کا مجھے علم نہیں ہے...... اور کمال یہ ہے کہ (کتاب کا انتساب کمال امروہوی کے نام ہے) دوران تصنیف انیس امروہوی نے انیسؔ ہی کے مصرعے کو پیش نظر رکھا ہے کہ......

انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

......مبارک ہو۔ یہ مبارکباد کس کے لیے ہے آپ جانتے ہیں۔

(۲)

عجیب و غریب کتاب ہے کہ ہاتھ سے چھوٹتی ہی نہیں ہے۔ یہ ہے تو فلمی دُنیا کی داستان، لیکن مصنف کے علم و اطلاع کے بغیر ۷۵ر فیصد علمی ہو گئی ہے، کیونکہ یہ ایک افسانہ نگار کے قلم سے برآمد ہوئی ہے۔ مصنف نے آج سے کوئی چالیس برس پہلے یعنی ۱۹۷۲ء میں فلم "پاکیزہ" کی ہیروئن مینا کماری کی رحلت پر ایک تاثراتی مضمون "......کہ فسانہ بن گئی ہے" لکھا تھا، اور اسی مضمون نے یقین مانیے، ان انیس امروہوی کو، جو دو طرح سے کام کے آدمی ہیں، یعنی ایم۔ کام بھی ہیں، فلمی دُنیا سے اس طرح منسلک کر دیا کہ وہ اس کے پبلک ری لیشن آفیسر (پی۔ آر۔ او) بن گئے لیکن مفتی (شہر ممبئی میں پولیس کی لغت میں مفتی اس شخص کو کہا جاتا ہے جو پولیس وردی میں نہیں، سادہ لباس میں ملبوس فرائض منصبی انجام دیتا ہے اور مفت میں یعنی بغیر تنخواہ کے خدمات انجام دیتا ہے۔) اور پی۔ آر۔ او کا تو کام ہی ہر طرح کی معلومات سے مسلح ہونا (مسلح کا لفظ پولیس کا شناخت نامہ ہے۔) اور بروقت ان کا استعمال کرنا ہے۔ انیس امروہوی نے اپنی تین سو اٹھارہ صفحوں پر پھیلی ہوئی کتاب میں فلمی دنیا سے تعلق رکھنے والے فنکاروں، فلمسازوں، ان میں سرمایہ لگانے اور سرپرستی کرنے والوں کے وہ (سچے) واقعات درج کر دیئے ہیں کہ قاری مسحور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کتاب کی اعلانیہ خوبی یہ ہے کہ یہ فلمی ہونے کے باوجود علمی، ادبی اور قلمی کی خصوصیات سے مزین اور مرصع ہے۔ آپ جب کتاب پڑھیں گے تو میرے اس بیان کی صحت کی داد دیں گے۔ مجھے

اگر مبالغہ کرنا ہوتا تو میں فاضل مصنف کو فلمی دنیا کے محمد حسین آزاد کے لقب سے یاد کرتا، جن کی کتاب ''آبِ حیات'' نے ادبی دنیا کے معتقدین کو زندہ رکھا ہے۔ یہی کام ہمارے انیس امروہوی صاحب نے انجام دیا ہے۔

فلم کے نام سے ایک زمانہ تھا جب لوگ کانوں پر ہاتھ دھرتے تھے۔ اپنے بچوں کو فلمیں دیکھنے سے صرف منع نہیں کرتے تھے بلکہ بسااوقات تنبیہ، فہمائش اور سرزنش کے مدارج طے کرتے ہوئے زد و کوب سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے۔ اس زمانے میں نوجوان نسل سے متعلق نابالغ و بالغ افراد کا چھپ چھپ کر فلمیں دیکھنا اس طرح عام تھا جس طرح چھپ کر سگریٹ پینا۔ انیس امروہوی جب پیدا ہوئے (۱۹۵۳ء) تو حالات کا پورا جغرافیہ ہی بدل چکا تھا، اور انہیں کھل کر فلمیں دیکھنے، فلمکاروں سے ملاقاتیں کرنے اور ان کے بارے میں لکھنے (لیکن صرف اچھے اور معلوماتی مضامین لکھنے) کا بھرپور موقع ملا اور موصوف نے چند فنکاروں کے گھروں میں نہ صرف تاک جھانک کی، بلکہ باضابطہ یلغار کی۔ ملاحظہ کیجیے یہ اقتباس...... ''جب بھی میں امرتا پریتم کے گھر گیا، میں نے ہر بار چاروں طرف وہاں کے در و دیوار پر، ڈرائنگ روم میں اور امروز کی پینٹنگز، سجاوٹ اور فرنیچر میں، غرض ہر جگہ ساحر کی موجودگی کو محسوس کیا۔ ایک بار میں نے امرتا پریتم سے یادگار کے طور پر آٹوگراف کی فرمائش کی تو انہوں نے پنجابی زبان میں لکھا...... ''پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والو! سینے میں جو آگ سلگتی ہے، اس کی کوئی پرچھائیں نہیں ہوتی۔'' اس اقتباس سے محترمہ امرتا پریتم کی علمی قابلیت و شعری حکایت مجسم ہوکر نظروں کے سامنے آگئی اور اندازہ ہوگیا کہ پنجاب یونیورسٹی نے امرتا پریتم کو ڈاکٹریٹ کی باوقار ڈگری عطا کرکے ایک غیر سیاسی کارنامہ انجام دیا تھا۔ اس کتاب میں ایسے کتنے ہی افراد و واقعات ہیں جن سے خاکسار کو قریب رہنے کا موقع ملا ہے، خاص طور پر ان لوگوں سے جو اپنی ادبی شہرت اپنے جلو میں لے کر فلم سے وابستہ ہوئے، جیسے مجروح سلطان پوری، اختر الایمان، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی، شکیل بدایونی، نوشاد، راجندر سنگھ بیدی، امجد خان اور محمود وغیرہ، اور پھر دلیپ کمار

بھی۔ (مینا کماری کی صدارت میں تو خاکسار نے ایک مشاعرہ بھی پڑھا تھا۔) اس کتاب میں ایسے ایسے اقتباسات ہیں جو شاید آپ کو استعجاب میں اتنا محو کر دیں کہ آپ بھول جائیں کہ آپ نے ابھی ناشتہ تک نہیں کیا ہے اور اگر خاکسار ان ہی اقتباس کو یہاں پیش کرتا رہا تو آپ یقیناً کہیں گے کہ یہ تبصرہ کہاں ہے، اقتباس نامہ ہے۔

میں انیس امروہوی سے غائبانہ ہی سہی، لیکن اچھی طرح واقف ہوں، لیکن سچ عرض کرتا ہوں کہ میں ان کے اس پہلو سے قطعی واقف نہ تھا کہ وہ ایک الگ کینڈے کے محقق ہیں۔ یہ کتاب صحیح معنوں میں تحقیقی کتاب ہے اور فاضل مصنف نے جو ادب کے میدان میں اشہب قلم کو دوڑاتا رہا ہے، چالیس سے زیادہ فنکاروں کو اپنی گرفت میں لیا ہے۔ تحقیق جاں سوزی کا نام ہے۔ خاص طور پر ایسی تحقیق جو شخصیت سے متعلق ہو۔ اس کتاب کی ایک اور خوبی ہے جو کمیاب ہے، کہ اس میں ''زیب داستاں'' نام کی کوئی شئے نہیں ہے، جو ہے وہ سراسر واقعاتی ہے۔ انیس امروہوی نثر نگار ہیں، صحافی ہیں، شاعر ہیں، ایک ادبی رسالے ''قصے'' کے مدیر ہیں اور کئی ہندی اردو رسالوں سے برسوں جڑے رہے ہیں، اور ادارتی فرائض (بحسن وخوبی) ادا کرتے رہے ہیں۔ ان تمام احوال و افعال کے باعث کتاب میں ادبی شان (جس کا کوئی گمان نہیں تھا) مایہ ناز فنکاروں کو پوری سج دھج کے ساتھ سیلِ رواں کی طرح در آئی ہے۔ انیس امروہوی خدا کرے اور طرح کے بھی دھنی ہوں، لیکن یہ مجھے معلوم ہے کہ وہ قلم کے دھنی ضرور ہیں۔ وہ کتابوں کے ناشر بھی ہیں اور تاجر بھی، اور تاجر کا خوش مزاج اور ہنس مکھ ہونا تجارت کی لازمی شرط ہے۔ میں نے ان کا مکھ تو نہیں دیکھا ہے لیکن ان کی خوش مزاجی (جو قہقہہ در آغوش ہوتی ہے) سنی ضرور ہے، اور یہ پیشہ ورانہ نہیں بلکہ مخلصانہ ہے۔

جی نہیں چاہتا کہ چند اقتباسات ''درج ذیل'' کیے بغیر اپنے اس تبصرے کو ادھورا چھوڑ دوں......

۱۔ مدھوبالا کی شخصیت کا سب سے روشن پہلو تھا ان کا کھلا ہوا مسکراتا چہرہ۔ (میں نے کھلا ہوا کے لفظ کو زیر سے بھی پڑھا اور پیش سے بھی،

آپ بھی یہی کیجیے۔) موتیوں کی وہ مسکراہٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی اور اس کے پرستار اسی موتیوں والی مسکراہٹ پر فدا ہو کر اس کی فلمیں دیکھنے بار بار جاتے تھے...... مدھوبالا کے انتقال کے بعد ایک فلمی صحافی نے لکھا تھا...... ''انارکلی پھر پیدا ہو سکتی ہے مگر مدھوبالا پھر جنم نہیں لے گی۔'' (ص:۱۶۶)

۲۔ پنکج ملک خود کہا کرتے تھے کہ ''رابندر سنگیت میری زندگی ہے، اور اسی میں میری نجات ہے۔ یہ سنگیت مجھے اس دنیا سے کہیں دور، بہت دور، چاند، سورج اور ستاروں سے بھی آگے لے جاتا ہے۔ (ص:۱۳۲)، ۱۹۷۸ء میں جب ان کا انتقال ہوا تو ایک روزنامہ اخبار نے ان کے حوالے سے لکھا...... ''آج ٹیگور کی دوبارہ موت ہوگئی ہے۔''

۳۔ کے۔ ایل۔ سہگل کسی بھی زبان کا گیت آسانی سے گا لیا کرتے تھے اور سازوں میں انہیں صرف طبلہ اور ہارمونیم کی ضرورت پڑتی تھی۔ سہگل نے اردو، ہندی، بنگلہ، فارسی اور پنجابی زبانوں کے گیت تو گائے ہی ہیں، مگر یہ بات بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ انہوں نے تامل زبان کے گیت بھی گائے تھے۔ (ص:۳۷)

اب بس...... آج کل کی فلموں میں ایک مکالمہ بار بار سننے میں آتا ہے...... ''اور میرا وعدہ ہے۔'' اور اندازِ بیان جارحانہ ہوتا ہے۔ اس لفظ سے متاثر ہو کر میں بھی عرض کرتا ہوں کہ...... یہ میرا وعدہ ہے کہ یہ کتاب (خرید کر) پڑھنے کے بعد آپ قائل ہو جائیں گے کہ بعض تبصرے بھی قابل لحاظ ہوتے ہیں۔

رہا ''وعدے'' کا معاملہ تو غالباً یہ دعوے کی جگہ استعمال ہوتا ہے جو برجستہ معلوم ہوتا ہے۔

—یوسف ناظم
ممبئی

ایک کمیاب شخصیت:

انیس امروہوی

انیس امروہوی کے بارے میں جب میں سوچتا ہوں تو کچھ غیر معمولی سے احساسات مجھے اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔ اس گرفت میں جذباتیت کی جگہ حق پرستی کی شدت میں نے خود محسوس کی ہے۔ چونکہ میں خود قلمکار ہوں، اس لیے دُوسرے قلمکار کے کرب سے ناآشنا نہیں ہوں۔ بظاہر انیس امروہوی کہانی کار، مضمون نگار، تھوڑے سے شاعر اور بڑے سے پبلشر ہیں۔ انہوں نے لاتعداد ادبی کتابیں شائع کی ہیں جو کھلے عام بڑی دلچسپی سے پڑھی جاتی ہیں، مگر یہ خود بند کتاب کی طرح ہیں۔ ایک ایسی بند کتاب جو کبھی کبھی اور کہیں کہیں سے ہی کھلتی ہے۔ اس لیے میری دلچسپی اُن میں کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک عام سے چہرے والی یہ شخصیت اتنی پُر تجسس بھی ہو سکتی ہے، پہلے میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔

یوں تو میری ملاقات دلّی میں انیس امروہوی سے تیس بتیس برس پُرانی ہے، لیکن اب بھی پُرانے پن کا احساس قطعی نہیں ہوتا۔ شاید اس کی وجہ اُن کے اندر کی شخصیت کے مختلف رنگ ہیں جو اُنہیں بے رنگ نہیں ہونے دیتے۔ جب بھی اُن سے ملاقات ہوتی ہے، کوئی نہ کوئی نئی بات ضرور سامنے آتی ہے۔ اُن کے اندر ایک بڑی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ سامنے والے کو بولنے کا پورا پورا موقع دیتے ہیں اور اُسے پوری

توجہ سے خود بھی سنتے ہیں۔ میرے خیال میں کوئی بھی فنکار، خواہ وہ شاعر ہو، ادیب ہو، یا کہانی کار، تب تک اچھا فنکار نہیں کہلا سکتا جب تک وہ خود اچھا سامع نہ ہو۔ مگر اچھا سامع بننے کے لیے بڑے صبر و تحمل اور سوجھ بوجھ کی ضرورت ہوتی ہے، اور یہ غیر معمولی خوبی انیس امروہوی میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ تو پھر اُن سے ملنے کو، اُن کو پڑھنے کو اور اُن کو سمجھنے کو کس کافر کا جی نہ چاہے گا، کہ ایسے لوگ بڑے کمیاب ہیں اور بڑی مشکل سے ملتے ہیں۔ بقول امتیاز علی خاں عرشی...... ''اچھے لوگوں کو ہاتھوں ہاتھ لینا چاہیے کہ یہ قسمت والوں کو ملتے ہیں۔'' اور طالبؔ رامپوری یقیناً قسمت والا ہے کہ اُسے انیس امروہوی کی ہم نشینی حاصل ہے۔

مندرجہ بالا میری حق بیانی سے یہ نتیجہ ہرگز نہ نکالا جانا چاہیے کہ انیس امروہوی حلیے سے کوئی داڑھی ٹوپی والے صوفی بزرگ ہوں گے۔ صوفیت اور بزرگی تو انہیں ورثے میں ملی ہے اور اُن کے اقوال و افعال میں رچی بسی ہے، کیونکہ اُن کے والد محترم صوفی شریف احمد صابری (مرحوم) خود پائے کے ایک بزرگ تھے۔ مگر بظاہر وہ (انیس امروہوی) کوٹ پینٹ والے آدمی ہیں اور بغیر کسی دکھاوٹ کے بڑی شان سے زندگی گزارتے ہوئے آئے ہیں۔

میں نے اسٹار پبلی کیشنز اور مووی اسٹار سے لے کر ہندی رسالہ ''مینکا'' اور ''سسپنس کہانیاں'' تک اُن کا شاہانہ اور پُر وقار انداز دیکھا ہے۔ اُنہوں نے ہندی اور اردو، دونوں میدانوں میں اپنی ذہانت و قابلیت کے خوبصورت نشان چھوڑے ہیں۔ چاہے وہ بزنس مینجمنٹ کا معاملہ ہو یا مدیرانہ قیادت کا، اُنہوں نے پوری ذمہ داری اور ایمانداری سے اپنا کردار انجام دیا ہے۔ کتنے ہی لوگوں کو اُنہوں نے اپنی پُر خلوص طبیعت اور اثر دار معاونت سے نواز کر ناموری کا موقعہ دیا اور دھندلے ستاروں کو چمکنے کی راہ دکھائی ہے۔ اُن میں سے ایک میں بھی ہوں۔ یہ اُن کی خاص محبت ہی تھی کہ انہوں نے اُردو ''مووی اسٹار'' میں ہمیشہ مجھے خاص جگہ دی اور ''مینکا''، ''سسپنس کہانیاں'' اور ''ہندی اسٹار'' کے تقریباً ہر اُس صفحے پر، جہاں کسی فلمی ستارے یا ماڈل کی تصویر ہوتی تھی،

کے نیچے میرا ایک شعر چپکا کر مجھے معروف و مشرف کیا۔ عام مدیروں کی طرح انیس امروہوی نے کبھی نہ تو جانبداری سے کام لیا اور نہ ہی کسی کی اہمیت کو نظر انداز کیا۔ اس کا ثبوت میں ہی نہیں، بہت سے ایسے قلمکار ہیں جن کے قلم کو انیس امروہوی نے روانی دی ہے۔ خود اُن کی تحریر اور اُن کے قلم سے نکلے ہوئے مضامین اور کہانیاں انتہائی با مقصد اور اچھوتی ہوتی ہیں جو بیشتر اخبار و رسائل میں نظر نواز ہوتی رہتی ہیں۔

انیس امروہوی تقریباً پندرہ برس سے صحافتی ملازمت ترک کر کے اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ ''تخلیق کار پبلشرز'' باعزت طریقے سے چلا رہے ہیں اور یہ ادارہ مضامین کی دلچسپی اور مقصدیت کے اعتبار سے پاک و صاف اور خوبصورت طباعت و اشاعت کے لیے بھی معروف و مقبول ہے۔ اُن کی بہترین اُردو طباعت و اشاعت کی خدمات کے لیے اُردو اکادمی، حکومت دہلی کی طرف سے تین بار منشی نول کشور ایوارڈ سے اُن کو نوازا جا چکا ہے۔ انیس امروہوی کتابوں کے معاملے میں کسی طرح کی لاپروائی سے سمجھوتہ کبھی نہیں کرتے۔ ایک ایک لفظ پوری سنجیدگی اور حاضر دماغی سے نظر گزار کرنے کے بعد زیور طباعت سے آراستہ کرتے ہیں اور نامناسب معاوضہ بھی وصول نہیں کرتے۔ اِسی لیے اُن کے ادارے سے نکلنے والی کتابیں اغلاط سے پاک ہوتی ہیں اور سادگی و خوش سلیقگی کا بہترین نمونہ بھی۔ انیس امروہوی اپنے کام کو عبادت سمجھتے ہیں اور عبادت میں خباثت اُنہیں کسی قیمت پر بھی منظور نہیں۔ اگر انیس امروہوی کی سرشت میں نیکی، ایمانداری اور حوصلہ افضائی نہ ہوتی تو شاید میری بکھری ہوئی پرزہ پرزہ شاعری کبھی کتابی شکل اختیار نہ کرتی۔ یہ اُن ہی کے خلوص کا کمال ہے کہ اب میں بھی صاحب کتاب ہو گیا ہوں۔

انیس امروہوی اُتر پردیش کے گہوارۂ علم و ادب شہر امروہہ میں ۹/اکتوبر ۱۹۵۳ء کو پیدا ہوئے اور نہایت نامساعد حالات میں سلسلۂ تعلیم جاری رکھتے ہوئے ۱۹۷۸ء میں ایم۔کام کرنے کے بعد تلاش معاش میں بمبئی چلے گئے۔ بمبئی کے فلمی حلقوں اور نگارخانوں کی سیر کرتے ہوئے یہاں ان کے تعلقات تو کئی فلمی اور ادبی ہستیوں سے بنے، مگر وہ معاشی طور پر یہاں کے معاملات سے مطمئن نہ ہو سکے اور واپس امروہہ

آ گئے۔ ۱۹۸۱ء میں انہوں نے اپنے وطن میں ساری کشتیاں جلا کر دہلی کی راہ لی اور یہیں کے ہو رہے۔ دہلی میں سٹار پبلی کیشنز سے وابستگی کے بعد ان کا قلمی اور فلمی سفر پھر شروع ہو گیا اور مووی اسٹار اور ہندی اسٹار جیسے فلمی پرچوں کی ادارتی ذمہ داریوں کو انہوں نے بخوبی نبھایا۔

انیس امروہوی اہل زبان ہیں اور اُن کی اُردو بہت اچھی ہے، حالانکہ وہ معاشیات یعنی کامرس کے آدمی ہیں اور انہوں نے مرادآباد کے ہندو ڈگری کالج سے ایم۔کام۔ کیا ہے۔ مگر اردو کے عشق نے اُنہیں کہانی کار، شاعر، ادیب، صحافی اور فلمی تاریخ نویس کے ساتھ ساتھ ایک کامیاب اور مقبول پبلشر بھی بنا دیا ہے۔ ہندوستانی فلموں کے موضوع پر اُن کی دو کتابیں ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' اور ''پس پردہ'' منظر عام پر آ کر مقبولیت حاصل کر چکی ہیں۔ تیسری کتاب ''وہ جن کی یاد آتی ہے'' زیر طبع ہے۔ ان کے علاوہ ''افسانہ۔۸۹'' (مرتب: ۱۹۹۰ء)، ''اُردو کے بہترین افسانے'' (مرتب: ۱۹۸۶ء)، ''اُردو شاعری آپ کی پسند'' (مرتب: ۱۹۸۶ء، ہندی) اور ''بے نظیر بھٹو: جنرل ضیاء کا نیا شکار'' (مصنف: ۱۹۸۴ء) کتابیں بھی ان کے خلاق ذہن کے بہترین ثبوت ہیں۔ وہ ہندی بک سینٹر کے ماہنامہ اسٹار ساہتیہ کے مدیر بھی رہے اور بچوں کے لیے ہندوستان میں پہلا تھری ڈی کامک ''اسٹار کامکس'' بھی ان کی نگرانی میں شائع ہوا تھا۔

اپنے فلمی مضامین کی وجہ سے انیس امروہوی خاصی اکلوتی اہمیت رکھتے ہیں۔ ''ہندوستانی سنیما کے سو برس، سو فلمیں'' جو زیر ترتیب کتاب ہے، کی عنقریب اشاعت انیس امروہوی کو یقیناً ''ماسٹر آف سنیما'' کا خطاب دلا کر رہے گی، کیونکہ اتنی گہری فلمی معلومات کا خزانہ انیس امروہوی کے علاوہ کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ خاموش فلموں سے لے کر متکلم فلموں کی نامور شخصیات کے ساتھ ساتھ کل سے آج تک کے تمام قابل ذکر اداکاروں اور اداکاراؤں کے علاوہ دیگر فنکاروں کی زندگی کے دلچسپ واقعات و حالات تصاویر سمیت اُن کے قلم کی زینت بن چکے ہیں۔ ہر طرح کے فلمی موضوعات کی مکمل معلومات اُن کی تحریر میں آ چکی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی کسی رسالے کے

مدیر یا ٹی۔وی۔ اور ریڈیو پروڈیوسر کو کوئی فلمی معلومات کی ضرورت پیش آتی ہے تو سب سے پہلے انیس امروہوی کو پکارا جاتا ہے اور وہ نئے نئے فلمی انکشافات کرتے ہوئے سنائی اور دکھائی دیتے ہیں۔ اُن کا دلچسپ اردو ادبی انداز فلمی موضوع کو اور بھی خوبصورت بنا دیتا ہے۔

اب انیس امرہوی کا قصہ چھڑا ہے تو مجھے اُن کی زیر ادارت شائع ہونے والے سہ ماہی رسالے ''قصے'' کی یاد آرہی ہے جو اپنی مقصدیت اور دلچسپی کے اعتبار سے ایک نادر و نایاب دستاویز تھا۔ اُس کا معیار و نکھار نثر و نظم کے حوالے سے ایک یادگار حیثیت رکھتا تھا اور انیس امروہوی کی بلند ذہنی کا عکاس بھی تھا۔ مگر مالی مشکلات اور اُردو ادب کے بے ادب شائقین کی بے توجہی کا شکار ہوا اور بند کر دیا گیا۔ لیکن ماشااللہ اُن کا خودمختار ادارہ ''تخلیق کار پبلشرز'' اپنی بہترین اور بامقصد طباعت کے لیے برصغیر میں خاص طور پر پہچانا جاتا ہے اور اُس پر اللہ تعالیٰ کی برکتیں نازل ہو رہی ہیں، اور برکتیں کیوں نازل نہ ہوں کہ انیس امروہوی کاروبار میں بھی نیکیاں کمانے کا گوشہ قائم رکھتے ہیں اور پوری ایمانداری و دیانتداری کا دامن ہاتھ سے کبھی نہیں چھوڑتے۔ میں اُن سے جب بھی ملتا ہوں، ایک اپنائیت اور طمانیت کا تاثر دل میں جاگتا ہے اور میر انیسؔ کا یہ مشہور شعر ذہن میں کروٹیں لینے لگتا ہے......

خیالِ خاطرِ احباب چاہیے ہر دم
انیسؔ ٹھیس نہ لگ جائے آبگینوں کو

......مگر انیس امروہوی کے یہاں یہ احتیاط صرف احباب تک ہی محدود نہیں ہے۔ وہ تو احباب اور غیر احباب، دونوں کے لیے دل کے دروازے کھلے رکھتے ہیں۔

○○

— طالبؔ رامپوری

لکشمی نگر، دہلی۔

انیس امروہوی :

ایک ہمہ جہت قلمکار

انیس امروہوی کے فلمی مضامین عرصہ دراز سے پڑھتا رہا ہوں جو نہ صرف معلومات افزا ہوتے ہیں بلکہ اُن میں ادب کی چاشنی اور افسانویت بھی پائی جاتی ہے۔ وہ تقریباً چالیس سال سے فلمی شخصیات پر نہ صرف لکھ رہے ہیں بلکہ تقریباً تین سو ادبی کتابوں کے ناشر بھی ہیں۔ تخلیق کار پبلشرز کے نام سے مشہور اشاعت خانہ اُن کی کاوشوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے جسے معیاری کتابیں شائع کرنے کے کئی ایوارڈ بھی مل چکے ہیں۔ انیس امروہوی کی ولادت ۹؍ اکتوبر ۱۹۵۳ء کو اُتر پردیش کے مردم خیز شہر امروہہ میں ہوئی۔ ان کے والد صوفیا اور بزرگان دین سے عقیدت رکھنے والے بزرگ صوفی شریف احمد صابری ایک علم دوست انسان تھے۔ ان کے اجداد افغانستان سے آکر دہلی میں آباد ہوئے تھے اور حکومت وقت کے لیے اسلحہ سازی کا کام کیا کرتے تھے۔ صوفی صاحب پر تصوف کا رنگ گہرا چڑھا ہوا تھا۔ ان کے باقیات الصالحات میں اُن کے مزاج، ان کی انکساری و ملنساری کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ ان کی آغوش تربیت نے ان کی اولادوں کو مہذب اور باادب بنادیا جو اخلاقی اور روحانی اقدار کے بھی حامل ہیں۔

انیس امروہوی نے پندرہ برس کی عمر میں پہلی کہانی ''دھندلا عکس'' لکھی جو کانپور

کے ایک رسالہ ''رگ سنگ'' میں شائع ہوئی۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ایک مقامی ہفت روزہ ''کمال مشرق'' کی ادارت سے وابستگی اختیار کی۔ ۱۹۷۴ء میں ۲۱ رسال کی عمر میں مشہور فلمساز و ہدایتکار کمال امروہوی کا طویل ترین انٹرویو کیا جو ممبئی کے مشہور رسالہ ''سب رنگ'' میں شائع ہوا۔ اس وقت وہ گیارہویں کلاس کے طالب علم تھے۔ ۱۹۷۸ء میں مرادآباد کے ہندو ڈگری کالج سے ایم۔کام۔ کرنے کے بعد کچھ عرصہ تک بمبئی کے فلمی حلقوں میں بھی رہے۔ ۱۹۸۱ء میں دہلی آ گئے اور یہاں کچھ عرصہ تک اکاؤنٹس کا کام کرنے کے بعد اسٹار پبلی کیشنز کے شعبۂ اردو میں انچارج کی حیثیت سے ملازمت شروع کی اور دو سال بعد اسی ادارہ سے شائع ہونے والے فلمی ماہنامہ ''مووی اسٹار'' کی ادارت سنبھالی۔ اس کے ساتھ ہی ۱۹۸۴ء میں ہندی ماہنامہ ''ہندی اسٹار'' اور ''اسٹار ساہتیہ'' کی ادارت سے بھی وابستہ رہے۔

۱۹۸۸ء میں اسٹار پبلی کیشن کی ملازمت ترک کر کے دوردرشن کے لیے بننے والی ایک ٹیلی فلم ''مٹی دھند جگ چانن ہویا'' میں چیف اسسٹنٹ ڈائریکٹر کی حیثیت سے وابستہ ہوئے۔ اس کے بعد بچوں کے ایک ٹیلی سیریل ''راجو اور اُڑن طشتری'' اور ایک سماجی سیریل ''اپنا جہاں'' مکمل کیے۔ اسی درمیان کئی اشتہاری فلموں اور سیریلوں میں بحیثیت اداکار بھی کام کیا۔ دُوردرشن کے لیے ۱۹۹۷ء میں ایک دستاویزی سیریل ''اُردو تھیٹر: آزادی کے بعد'' پروڈیوس کیا اور ۲۰۰۰ء میں کشمیر کے حالات پر ایک ٹیلی فلم ''ایک نئی صبح'' بحیثیت فلمساز بنائی۔ اس کے علاوہ ۲۰۰۴ء میں کشمیری پنڈتوں کی واپسی کے مسائل پر دُوردرشن کے لیے پانچ قسطوں کا ایک دستاویزی سیریل ''واپسی سے پہلے'' بحیثیت فلمساز، مصنف و ہدایتکار بنایا۔

انیس امروہوی نے ۱۹۸۸ء میں ہی اپنا ذاتی اشاعتی ادارہ تخلیق کار پبلشرز کے نام سے شروع کیا اور اب تک اس ادارے سے زائد از تین سو انتہائی خوبصورت و معیاری کتابیں شائع کر چکے ہیں جن کی پورے ملک میں پزیرائی ہوئی ہے۔ اردو میں بہترین معیاری کتابوں کی اشاعت کے سلسلے میں تین بار دہلی اردو اکیڈمی کا منشی نول

کشور ایوارڈ بھی حاصل کر چکے ہیں۔ اپنے اشاعتی ادارے تخلیق کار پبلشرز سے ادبی سہ ماہی رسالہ ''قصے'' کا اجرا بھی کیا جو ہندوستان کے علاوہ پاکستان میں بھی بے حد مقبول ہوا۔ اُن کی تمام ادبی اور اشاعتی خدمات پر ساہس ڈگری کالج، نوگاواں سادات نے اپنے خصوصی پروگرام میں انیس امروہوی کو ''مینارِ علم'' کے اعزاز سے نوازا۔

اردو کے علاوہ ہندی میں بھی انیس امروہوی کو لکھنے میں ملکہ حاصل ہے۔ ۱۹۹۰ء میں انہوں نے فلمی ماہنامہ ''مینکا'' میں ایڈیٹر کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی ماہنامہ ''سسپنس کہانیاں'' کی بھی اشاعت شروع کرائی اور اسے بھی عرصہ تک ایڈٹ کرتے رہے۔ آل انڈیا ریڈیو کی اُردو سروس، اُردو مجلس اور آکاش وانی کے نیشنل چینل سے ان کے فلمی و ادبی مضامین سیکڑوں کی تعداد میں نشر ہو چکے ہیں۔

انیس امروہوی کی اہلیہ ڈاکٹر نیر جہاں دہلی گورنمنٹ کے ایک اسکول میں ٹیچر ہیں۔ انہوں نے جامعہ ملیہ اسلامیہ، نئی دہلی سے مولانا شبلی نعمانی پر پی۔ ایچ۔ ڈی۔ کیا تھا۔ وہ خود بھی کئی کتابوں کی مصنفہ ہیں۔ ''تنقیحات'' اور ''مولانا شبلی: ایک تنقیدی مطالعہ'' اُن کی دو مشہور کتابیں ہیں۔

انیس امروہوی کی تحریر بہت شستہ، شگفتہ اور رواں دواں ہے۔ دو چار سطریں پڑھنے کے بعد پورا مضمون پڑھے بغیر رہا نہیں جاتا۔ اس میں جہاں بھرپور معلومات فراہم کی جاتی ہے وہیں ادب کی چاشنی اور حالات و واقعات اس انداز سے ترتیب دیے ہوتے ہیں کہ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے۔ کڑی محنت اور ریاضت کے بعد ہی کسی کے قلم میں یہ جادو سماتا ہے۔ وہ آسان اور عام فہم زبان کا استعمال کرتے ہیں اور سچی بات تو یہ ہے کہ آسان اور عام فہم زبان کا استعمال آسان نہیں ہے یہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہیں اپنی سوچ اور قلم پر پوری قدرت حاصل ہو۔ ان کے یہاں زیبِ داستان کے لیے زیادہ کچھ نہیں ہے، جو کچھ ہے وہ سراسر واقعاتی ہے۔

انیس امروہوی کے مزاج، شخصیت اور طرزِ تحریر کے بارے میں اُن کی کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' میں اُن کے تعارف میں نسیم احمد صدیقی نے بہت ہی مربوط

انداز میں ایک چھوٹا سا پیراگراف لکھا ہے، ملاحظہ فرمائیں......

انیس امروہوی نے دہن اور ذہن رسا پایا ہے۔ صاف بات نہ لکھنے سے چوکتے ہیں اور نہ کہنے سے۔ اساتذہ کا احترام، نوآموزوں کی حوصلہ افزائی اور ساتھیوں پر بے لاگ تنقید و تبصرے میں قلم بھی استعمال کرتے ہیں اور زبان بھی، البتہ تیکھی بات پر بھی نہ قلم زہر اُگلتا ہے اور نہ زبان ترش ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مزاح کا دامن بھی ہاتھ سے نہیں چھوٹتا۔ اپنی ذاتی زندگی میں سیلف میڈ قسم کے آدمی ہیں اور نظریاتی طور پر علامہ اقبالؔ کے اس شعر کے قائل ہیں......

یقیں محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(وہ بھی ایک زمانہ تھا، ۲۰۰۷ء، ص: ۱۵)

مشہور مزاح نگار جناب یوسف ناظم نے انیس امروہوی کی کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' پر تبصرہ کرتے ہوئے اظہار خیال کچھ اس طرح کیا ہے......

''اس کتاب کی اعلانیہ خوبی یہ ہے کہ یہ فلمی ہوتے ہوئے بھی ادبی اور قلمی کی خصوصیات سے مزین اور مرصع ہے۔ آپ جب کتاب پڑھیں گے تو میرے اس بیان کی صحت کی داد دیں گے۔ مجھے اگر مبالغہ کرنا ہوتا تو میں فاضل مصنف کو فلمی دنیا کے محمد حسین آزادؔ کے لقب سے یاد کرتا، جن کی کتاب ''آب حیات'' نے ادبی دُنیا کے معتقدین کو زندہ رکھا ہے۔ یہی کام ہمارے انیس امروہوی نے انجام دیا ہے۔''

(پس پردہ، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۸۸)

انیس امروہوی اہل زبان ہیں، اُن کی طرز تحریر اور زبان کے بارے میں معین اعجاز نے اپنے ایک مضمون میں لکھا ہے......

''......انیس امروہوی کی زبان نہایت سلیس اور شائستہ ہے اور انداز

بیان نہ صرف دلچسپ ہے بلکہ کئی جگہ الفاظ کے ہیر پھیر سے جملوں کو دو آتشی بنا دیتے ہیں۔ انیس امروہوی نے اپنی کتاب ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' کو کمال امروہوی کے نام معنون کیا ہے اور انتساب کا جملہ یوں لکھا ہے...... ''کمال امروہوی کے نام، جنھوں نے فلم کو ادب اور ادب کو فلموں میں اہمیت دلوانے کے لیے پہل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔'' (پس پردہ، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۹۶)

اسی کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے مشہور ناقد مرغوب علی لکھتے ہیں......

''انیس امروہوی کی تحریر میں ایک خاص قسم کی دلکشی اور کاغذ کی بو سے مہکتی فضا دستیاب ہے۔ فلمی تذکرے ہوں اور زبان علمی ہو، پھر کتاب کے ساتھ قاری کی دوستی ایسے موسم کا سماں پیدا کرتی ہے جہاں گلاب کی خوشبو اور بارش کی پھوار سے مہکتی گاؤں کی کچی سڑک پر کسی بانسری کا کوئی سُر اُگ جائے۔'' (پس پردہ، ۲۰۱۰ء، ص: ۱۹۷)

انیس امروہوی نثر نگار ہیں، شاعر ہیں، صحافی ہیں، ایک ادبی رسالے کے ایڈیٹر ہیں اور سب سے بڑھ کر ایک اچھے انسان اور حق پرست قلمکار اور آرٹسٹک ذہن رکھنے والے حساس فنکار ہیں۔ ''وہ بھی ایک زمانہ تھا'' فلمی شخصیات کی زندگی اور فن پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں دادا پھالکے، کے۔ ایل۔ سہگل، سہراب مودی، اشوک کمار، مینا کماری، کمال امروہوی، کے۔ آصف، پرتھوی راجکپور، خواجہ احمد عباس، نور محمد چارلی، گرودت، نوشاد علی، رشی کیش مکھرجی، راجکپور، مدھوبالا، شکیل بدایونی، محمد رفیع، مجروحؔ سلطانپوری، مکیش، ساحرؔ لدھیانوی اور شیلندر جیسی عظیم شخصیات پر خامہ فرسائی کی گئی ہے۔ اس سلسلے میں وہ خود لکھتے ہیں کہ......

''میں نے بہت سی فلمی ہستیوں سے ذاتی تعلقات اور اپنی فلمی صحافت کے مشاہدات کی وجہ سے ان مضامین کو زیادہ سے زیادہ معلوماتی بنانے کی ہر ممکن کوشش کی ہے۔ میرا خیال ہے کہ یہ مضامین فلموں کے

حوالے سے اُردو ادب و فلم کے قارئین کے لیے ایک بیش قیمت سرمایہ ثابت ہوں گے۔ میں نے اپنی چالیس برس کی فلمی صحافت کا ماحصل ان مضامین میں اکٹھا کیا ہے کیونکہ بنیادی طور پر میں ایک افسانہ نگار ہوں اسی لیے ان تحریروں میں میرے قارئین کو کہیں کہیں افسانوی رنگ بھی دیکھنے کو ملے گا۔''

ان کی کتاب ''پس پردہ'' ۲۰۱۰ء میں شائع ہوئی ہے جس میں مختلف موضوعات پر چوبیس فلمی مضامین شامل ہیں۔ اس کتاب میں دلیپ کمار، کمال امروہوی، تحریک آزادی اور ہماری فلمیں، مسلم سوشل فلمیں، قومی یکجہتی اور ہماری فلمیں، سنیما اور ہمارا معاشرہ، ہندوستانی فلموں میں عید کا تہوار، کہاں گئی فلموں سے قوالی، عصری فلموں میں خواتین کے مسائل'' وغیرہ جیسے عنوانات سے مضامین شامل ہیں۔

انیس امروہوی نے تقریباً ایک صدی پر مشتمل ہندوستانی فلم انڈسٹری کے تمام قابل ذکر اور چند گمنام ہستیوں کی حیات وخدمات اور ان کی زندگی کے اُتار چڑھاؤ پر بہت اچھے انداز سے روشنی ڈالی ہے۔ انہوں نے ان اشخاص کے فن اور شخصیت پر روشنی ڈالنے کے ساتھ ان لوگوں کی زندگی کے بعض اہم واقعات کا تذکرہ بھی کیا ہے جس سے نہ صرف یہ مضامین دلچسپ بن گئے ہیں بلکہ زیادہ معلوماتی بھی ہو گئے ہیں اور ان شخصیات کے کارنامے کتابی شکل میں دستاویز کی طرح محفوظ ہو گئے ہیں تاکہ آنے والی نسلیں اس سے استفادہ کر سکیں۔

انیس امروہوی کا افسانہ ''کتان'' جو ماہنامہ ''شاعر'' (ممبئی) میں شائع ہوا تھا، بے حد مقبول ہوا، اور کئی دیگر زبانوں میں ترجمہ ہو کر شائع ہوا۔ اس کے علاوہ اُن کے افسانے ''عظمت کا نشان، محفوظ مقام، پرائی، گری ہوئی دیوار، باپ، ثبوت، اصلاح، خوشبو'' اور ''شب انتظار'' وغیرہ مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہو کر مقبول ہو چکے ہیں۔ افسانوں کے علاوہ انہوں نے نظمیں بھی کہی ہیں۔ ''عفریت، ایک نوجوان سے، ایک نئی صبح، مجبوری، آج کا نوحہ گر، دل کے خلاف'' جیسے مختلف عنوانات سے ان کی نظمیں شائع

ہوکر مقبول ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ بہت سے سیاسی، سماجی اور اصلاحی مضامین مختلف رسائل و جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔

انیس امروہوی کی اگلی کتاب "وہ جن کی یاد آتی ہے" عنقریب زیور طبع سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آنے والی ہے۔ اس کتاب میں تقریباً پچاس فلمی شخصیات سے متعلق مضامین شامل ہیں۔ یہ سب ایسی شخصیات ہیں جنہوں نے فلم سے متعلق کسی نہ کسی شعبہ میں اپنے فن کے ذریعہ نام کمایا ہے اور اس انڈسٹری کو فروغ دینے میں تعاون دیا ہے۔ انیس امروہوی کا ارادہ بڑے پیمانے پر فلمی دُنیا کی تاریخ اُردو میں مرتب کرنے کا ہے۔

○○

— ظفر انور شکرپوری

نئی دہلی۔

وہ جن کی یاد آتی ہے

غلام حیدر

لاہور میں گرمیوں کی ایک شام تھی۔ غلام حیدر چارپائی پر لیٹے پنکھا جھل کر پسینے کو سُکھا رہے تھے اور خیالوں میں پوری طرح غرق تھے کہ اچانک ہی رات کی خاموشی کو چیرتی ہوئی ایک فقیر کی صدا سنائی دی...... ''بابا، ایک پیسہ دے دے بابا......'' غلام حیدر ایک دم چونک کر بیٹھ گئے۔ اچانک ہی اُن کے دماغ میں بجلی سی کوندگئی۔ صدا کے ساتھ ساتھ لَے اور تال بھی اُن کے ذہن میں رینگنے لگی۔ اُنہوں نے ہارمونیم سنبھالا اور ایک دُھن ترتیب دے ڈالی۔ اگلے دِن صبح فقیر کی کربناک صدا نے راگ پہاڑی پر ترتیب دیئے ایک گانے کے مکھڑے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ گانا تھا...... ''راوی کے اُس پار سنجوا راوی کے اُس پار۔'' اس گانے کو امراؤ ضیا بیگم نے اپنی سحر طراز آواز میں گایا تھا جو بے حد مقبول ہوا۔ کچھ عرصہ بعد غلام حیدر نے امراؤ ضیا بیگم سے شادی کر لی۔

مذکورہ بالا گانے کو سن کر اس وقت کے موسیقار حیران رہ گئے کہ کس خوبصورتی اور نفاست کے ساتھ راگ، پہاڑی میں شُدھ اور کومل دھیوت ایک ساتھ استعمال کیئے گئے تھے۔ پربھات ٹاکیز، کولہاپور کے میوزک ڈائریکٹر کیشو راؤ بھولے نے لاہور ریڈیو سے یہ گانا سنا اور فوراً ہی اُسے مراٹھی روپ دے کر اپنی فلم ''مزاملگا'' (۱۹۳۸ء) میں دے دیا۔ اسی نغمے نے بہت بعد میں میوزک ڈائیریکٹر نوشاد علی کو بے حد متاثر کیا۔ انہوں نے فلم ''میلہ'' (۱۹۴۸ء) کے ناقابل فراموش نغمۂ محبت کی دھن اس پر ترتیب دی تھی۔ گانا تھا...... ''دھرتی کو آکاش پکارے۔''

یہ خوبی تھی جادوگر موسیقار غلام حیدر میں۔ اگرچہ غلام حیدر نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز کاردار کی فلم ''سورگ کی سیڑھی'' (۱۹۳۵ء) سے کیا تھا لیکن اصل شہرت انہیں دل سکھ پنچولی کی فلم ''خزانچی'' سے ملی، اور دیکھتے ہی دیکھتے لاہور کا ایک دندان ساز ۱۹۴۱ء میں سُر اور سنگیت کے پردے پر ابھر کر سامنے آگیا۔ ''خزانچی'' کی دل پذیر اور نغمہ بار دھنیں آج تک فلمی موسیقی کے قدردان نہیں بھلا پائے ہیں۔ ''خزانچی'' نے ہی دلکش آواز والی شمشاد بیگم کو ہندی سنیما سے روشناس کرایا۔ شمشاد بیگم نے فلم ''خزانچی'' کے تمام نو کے نو گانے اپنے مخصوص انداز میں گائے تھے۔ ''ساون کے نظارے ہیں'' گانا شمشاد بیگم نے غلام حیدر اور دیگر گلوکاروں کی سنگت میں گایا تھا۔ جسے فلم کے ہیرو ہیروئین ایس۔ ڈی۔ نارنگ اور رمولا پر فلمایا گیا تھا۔ اس طرح سے ''دیوالی پھر آگئی سجنی'' اور ''ایک کلی نازوں کی پلی'' نغمے بھی اتنے ہی مقبول ہوئے تھے۔

اس کے بعد ۱۹۴۲ء میں فلم ''خاندان'' سے غلام حیدر نے بی بی نورجہاں کو ہندی سنیما سے روشناس کرایا۔ نورجہاں کا پہلا گانا...... ''تو کون سی بدلی میں میرے چاند ہے آجا۔'' آج بھی نورجہاں کے عمدہ اور مقبول گانوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اسی طرح سے غمگین نغمہ...... ''میرے لئے جہاں میں چین نہ قرار ہے۔'' (پنجابی مرثیہ پر مبنی) کو سن کر لوگ ششدر رہ جاتے تھے۔ اسی برس فلم ''زمیندار'' میں غلام حیدر نے ایک نئے شاعر قمر جلال آبادی کو پیش کیا۔ قمر کا پہلا گانا ''دنیا میں غریبوں کو آرام نہیں ملتا'' شمشاد بیگم نے دل کو چھو لینے والی آواز میں گایا تھا۔ اس کے ساتھ ہی شمشاد بیگم کا ایک اور غمگین نغمہ...... ''میرے دل پر بے بسی رو رہی ہے۔'' بہت مقبول ہوا تھا۔

سُر اور سنگیت کی دنیا میں غلام حیدر کو ماسٹر جی کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ ماسٹر جی کورس گانے بنانے میں یکتا اور ماہر تھے۔ ''حسن کہتا جا رہا ہے بادشاہی کچھ نہیں'' (فلم ''ہمایوں''، ۱۹۴۵ء)، اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ یہ ماسٹر غلام حیدر کی ترتیب دی ہوئی دھنوں کا ہی کمال تھا کہ شمشاد بیگم دیکھتے ہی دیکھتے صفِ اوّل کی گلوکاراؤں میں شمار کی جانے لگیں۔ غلام حیدر اور شمشاد بیگم کی ٹیم نے ایک ساتھ

لاتعداد ایک سے بڑھ کر ایک، خوشگوار، دلکش، شگفتہ، رنجیدہ، غمگین اور اُداس نغمے فلمی دُنیا کو پیش کیے۔

ماسٹر جی فلم ''خزانچی'' سے ہندی فلمی موسیقی میں جو خوشگوار انقلاب لائے، بعد میں ہر موسیقار نے اس کی تقلید کی۔ ان کے بعد کے موسیقاروں میں بھی ماسٹر غلام حیدر کے موسیقی ریز اسلوب کی جھلک دیکھنے کو ملتی رہی۔ ماسٹر جی نے پہلی بار فلمی موسیقی میں ڈھولک سے بخوبی کام لیا تھا۔

فلمستان کی فلم ''شہید'' سے ماسٹر غلام حیدر کو جو مقبولیت حاصل ہوئی، وہ اس وقت تک کسی موسیقار کو نہ ملی تھی۔ جہاں فلم ''شہید'' نے ملک گیر کامیابی حاصل کی، وہاں اس فلم کے نغمے بھی بے حد پسند کئے گئے۔ بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ فلم ''شہید'' کی بے پناہ کامیابی میں ماسٹر غلام حیدر کی ترتیب دی ہوئی سحر طراز دھنوں کا بھی ہاتھ تھا۔ ''بچپن کی یاد دھیرے دھیرے'' (لتا دیولکر) اور ''آجا بے دردی بالما'' (گیتا رائے) کے ساتھ اس فلم میں سریندر کور نے بھی اپنا پہلا گانا ''بدنام نہ ہو جائے'' گایا تھا۔ اس سے ماسٹر غلام حیدر کے کمالِ فن کا پتہ چلتا ہے۔ گلوکار چاہے نیا ہو یا پُرانا، آواز جانی پہچانی ہو یا نئی، ماسٹر جی ہر گانے کے لئے مناسب آواز لیتے تھے۔ آپ نے ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو'' کی دھن میں کمال خوبی سے حب الوطنی کے جذبوں کو اُجاگر کیا تھا۔ اس نغمے کو سن کر آج بھی خون کی روانی بڑھ جاتی ہے۔ اس نغمے کا دوسرا حصہ، جو کومل سُر میں ہے، دھیرے دھیرے دل کی عمیق گہرائیوں میں اترتا چلا جاتا ہے۔ جادو اثر سُر اور سنگیت کے ساتھ ساتھ معیاری شاعری کی وجہ سے بھی یہ یادگار نغمہ...... ''وطن کی راہ میں'' اتنا ہی لافانی ہے، جتنا کہ ادبی اعتبار سے ڈاکٹر اقبال کا ''سارے جہاں سے اچھا......''

''شہید'' کی تکمیل کے دوران ہی نور جہاں کے نغمے ''بلبلو، مت روٴ یہاں آنسو بہانا ہے منع......'' کی ریکارڈنگ کے وقت ماسٹر غلام حیدر کو لتا منگیشکر کی آواز سننے کا موقع ملا۔ ماسٹر جی لتا کی تیکھی اور تیز طرّار آواز سے بے حد متاثر ہوئے۔ انہوں نے فلم

کے پروڈیوسر ایس۔ مکھرجی سے لتا کا ذکر کیا، لیکن ایس۔ مکھرجی کو یہ نئی اور مہین آواز پسند نہ آئی۔ انہوں نے اسے فوراً رد کر دیا، لیکن ماسٹرجی جیسے عظیم فنکار کو اپنی فنی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ وہ اپنی غلطی ماننے کو تیار نہ تھے۔ فن موسیقی سے نابلد ایک پروڈیوسر کی رائے زنی ان کے نزدیک کوئی اہمیت نہ رکھتی تھی۔ ایک لوکل ٹرین میں لتا کے ساتھ بمبئی ٹاکیز کو جاتے ہوئے اچانک ہی ماسٹرجی کے ذہن میں بجلی کی طرح ایک دھن کوندی۔ جس کو انہوں نے اپنے سگریٹ کے ڈبے کی تال دے کر لتا کو سنایا۔ یہ ایک ہلکا پھلکا گانا تھا......"دل میرا توڑ، تو نے کہیں کا نہ چھوڑا۔"

بعد میں اس گانے کو لتا کی آواز میں بمبئی ٹاکیز کی فلم "مجبور" کے لئے ریکارڈ کیا گیا۔ اس ایک گانے کے بعد لتا منگیشکر کو سُر اور سنگیت کی دنیا میں جو مقبولیت حاصل ہوئی، اس کی ایک الگ ہی تاریخ ہے۔ لتا آج بھی نورجہاں اور ماسٹر غلام حیدر کی بے پناہ عزت کرتی ہیں، اور دونوں کو اپنا گرو مانتی ہے۔ ہوسکتا ہے "بے درد تیرے" کی دھن ترتیب دیتے وقت ماسٹرجی کے ذہن میں نورجہاں ہو، لیکن لتا کی آواز میں یہ گانا ریکارڈ کروا کر ماسٹرجی کو کوئی افسوس نہیں ہوا۔

تقسیم ہند کے ساتھ ہی ماسٹرجی بھارت چھوڑ کر پاکستان چلے گئے۔ یہاں وہ ایک فلم "کنیز" کا بیک گراؤنڈ میوزک ادھورا چھوڑ گئے تھے۔ جسے ایک نئے میوزک ڈائیریکٹر او۔ پی۔ نیر نے مکمل کرایا۔ ہر نفس کی طرح اس عظیم موسیقار کو، جس نے ہندی فلم سنگیت کو تھیئٹر کے اثر سے آزاد کرایا، اجل کے سنگدل ہاتھوں نے اس وقت ۱۹۵۳ء میں ہم سے چھین لیا، جب وہ صرف سینتالیس برس کے تھے۔

OO

طلعت محمود

طلعت محمود ۲۴ر فروری ۱۹۲۴ء کو لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے۔ بچپن سے ہی موسیقی کی طرف اُن کا رُجحان صاف نظر آ رہا تھا۔ جبکہ ان کے والد منظور محمود اپنے بیٹے کو گلوکار بنتے دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ طلعت محمود میوزک کا سامان بیچنے والی دکانوں اور آل انڈیا ریڈیو کے ریکارڈنگ اسٹوڈیو کے چکر کاٹتے رہتے تھے۔ کندل لعل سہگل کی آواز اور ریگل سٹی کی طوائفوں کی آوازوں کے بیچ پھنسے ہوئے طلعت محمود نے بالآخر لکھنؤ میں میوزک کے سب سے اہم ادارے موریس کالج آف میوزک میں داخلہ لے لیا۔

ایچ۔ ایم۔ وی۔ کی ایک ٹیم لکھنؤ کے سفر پر تھی اور اُسی دوران اُس کی نظر میں طلعت محمود کسی طرح آ گئے۔ اس کے بعد ان کا لکھنؤ سے باہر کا سفر شروع ہو گیا۔ ایچ۔ ایم۔ وی۔ کی ٹیم انہیں کلکتہ لے گئی۔ وہاں سبل داس گپتا کا ایک نغمہ ''سب دن ایک سمان نہیں'' طلعت محمود کی آواز میں ریکارڈ کرایا گیا۔ یہ ان کی پہلی ریکارڈنگ تھی۔ وہاں طلعت محمود نے نیو تھیئٹر سے بھی وابستگی اختیار کی اور فلم ''سمپتی'' میں انہیں ایک چھوٹا سا کردار بھی ملا۔ اس وقت طلعت محمود کی عمر صرف ۲۰ر برس تھی اور تبھی ان پر قسمت کی دیوی مہربان ہوئی اور کلکتہ میں ہی ان کے سب سے پیارے اور آدرش سنگر کے۔ ایل۔ سہگل سے طلعت محمود کی ملاقات ہوئی۔

سبل داس گپتا کے بڑے بھائی کمل داس گپتا کو طلعت محمود کی آواز بہت پیاری لگی۔ کمل داس گپتا نے طلعت محمود کی آواز میں اپنا گیت ''تصویر تری دل میرا بہلا نہ سکے گی'' ریکارڈ کروایا۔ یہ گیت فیاض ہاشمی کے زور قلم کا نتیجہ تھا اور اسی نغمے کی

ریکارڈنگ کے ساتھ طلعت محمود کا نصیب کھل گیا۔ راتوں رات اس ایک گیت نے طلعت محمود کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ۱۹۶۰ء کی دہائی کے آخری برسوں میں ان کے اس ریکارڈ کی ایک لاکھ کاپیاں فروخت ہو گئیں۔ اس کے بعد طلعت محمود نے بہت سے گیت ریکارڈ کرائے۔ بیشتر بنگلہ زبان کے گیت تھے اور ان گیتوں کو انہوں نے تپن کمار کے نام سے ریکارڈ کروایا۔ اس وقت بنگلہ گیتوں میں طلعت محمود کے مقابلے میں ہیمنت کمار، جگموہن اور جوتیکا رائے بھی موجود تھے۔

اس کے بعد ہندی فلموں میں کیریئر بنانے کی نیت سے طلعت محمود کلکتہ سے ممبئی آگئے۔ ان کی آواز کے جادو سے مسحور ہو کر موسیقار انل بسواس نے ان کو گیت گانے کے لیے موقع دینے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۵۱ء میں فلم ''آرزو'' میں طلعت محمود کی آواز استعمال کی گئی۔ فلم ''آرزو'' میں پردے پر دلیپ کمار نے طلعت کی آواز میں ریکارڈ کیا ہوا گیت ''اے دل مجھے ایسی جگہ لے چل'' گایا اور اس گیت سے بھی طلعت محمود کو بڑی شہرت حاصل ہوئی۔ فلم ''آرزو'' میں انل بسواس اور دلیپ کمار کا جو ساتھ طلعت محمود کو حاصل ہوا، وہ برسوں تک جاری رہا۔ اس کے فوراً بعد تمام بڑے میوزک ڈائریکٹروں، جیسے نوشاد، سجاد حسین، شنکر جے کشن، ایس۔ ڈی۔ برمن، خیام اور سلیل چودھری کے ساتھ انہوں نے گانا شروع کر دیا۔

طلعت محمود کی آواز میں ایک فطری لرزش تھی جو کہ اس وقت افسانوی حیثیت اختیار کر جانے والے ہیرو دلیپ کمار کی آواز کے لیے بہت موزوں تھی۔ لہٰذا وہ دن بھی آیا جب طلعت محمود کی آواز کو دلیپ کمار کی آواز کے طور پر پہچانا جانے لگا۔ دلیپ کمار نے ایک موقع پر بڑی فراخ دلی سے اس بات کا اعتراف کیا تھا کہ وہ طلعت محمود کی آواز کے سہارے سے ہی ''شہنشاہِ المیہ'' بن سکے تھے۔ طلعت محمود نے ''فٹ پاتھ'' اور ''بابل'' میں دلیپ کمار کو اپنی آواز دی۔ یوں تو انہوں نے دیو آنند اور راج کپور کے لیے بھی گیت گائے مگر دلیپ کمار کی فلموں میں ان کے گیت زیادہ مقبول ہوئے۔

اگرچہ طلعت محمود کو محمد رفیع، منا ڈے، مکیش اور پھر کچھ آگے چل کر کشور کمار جیسے

گلوکاروں سے سخت مقابلے کا سامنا تھا، لیکن طلعت محمود اپنی جگہ برقرار رہے اور ۴۰ر کی دہائی سے ۶۰ر کی دہائی تک ان کی مقبولیت میں روز افزوں اضافہ ہوتا رہا اور ہندی فلموں کا یہی دور سنہرا دَور بھی کہلاتا ہے۔ طلعت محمود کو دوسرے گلوکاروں پر ان کے تلفظ اور لہجے کی وجہ سے بھی خاصی سبقت حاصل تھی۔ طلعت محمود کے سدابہار گیتوں میں ''شام غم کی قسم...... پھر وہی شام وہی غم وہی تنہائی ہے...... اے مرے دل کہیں اور چل...... جلتے ہیں جس کے لیے تیری آنکھوں کے دیے...... اتنا نہ مجھ سے تو پیار بڑھا کہ میں اک بادل آوارہ...... جائیں تو جائیں کہاں'' اور ''تصویر بناتا ہوں، تصویر نہیں بنتی'' جیسے گیت شامل ہیں جو آج بھی سننے والوں کے دامنِ دل کو پوری طرح اپنی گرفت میں لے لیتے ہیں۔

طلعت محمود نے روشن، مدن موہن اور او۔ پی۔ نیر کے لیے کچھ بہترین قسم کے نغمات کو اپنی آواز سے لازوال بنایا ہے۔ طلعت محمود صرف ایک بات پر مصر رہتے تھے، وہ یہ کہ ان کو جو گیت بھی گانے کو دیا جائے وہ عمدہ شاعری کا نمونہ ہو۔ کبھی کبھار تو ایسا بھی ہوا کہ کوئی نغمہ انہیں پسند نہیں آیا تو انہوں نے اُس گیت کو گانے سے اِنکار کر دیا، مگر سمجھوتہ نہیں کیا۔ طلعت محمود اکثر کہا کرتے تھے...... ''میرا خاندان روشن خیال لوگوں کا خاندان ہے اور اچھی شاعری کی پرکھ اور پہچان مجھ میں اتنی ہے کہ میں تک بندی کو اپنی آواز نہیں دے سکتا۔''

طلعت محمود نے کچھ فلموں میں گلوکار کے ساتھ ساتھ اداکاری بھی کی ہے۔ فلم ''لاوارث، دل ناداں، ڈاک بابو، ایک گاؤں کی کہانی، مالک'' اور ''سونے کی چڑیا'' میں وہ نوتن کے ہیرو تھے اور زبردست کارکردگی کا مظاہرہ کیا تھا۔ نجی زندگی میں طلعت محمود ایک نہایت شریف انسان تھے۔ دلیپ کمار کے الفاظ میں طلعت محمود ایک عمدہ گلوکار ہی نہ تھے بلکہ شریف، مہذب اور شائستہ انسان تھے۔ ''طلعت محمود ''ادب اور آداب'' کے لکھنوی کلچر کی جیتی جاگتی تصویر تھے اور وہ کم گو بھی تھے۔

گلوکاری کے آخری برسوں میں انہوں نے بہت تیزی سے بدلتے ہوئے موسیقی کے منظرنامے سے اپنی ناخوشی اور بددلی کا اظہار کیا تھا اور موسیقی کے نام پر بے ہنگم شور

شراب کا یہ نتیجہ تھا کہ انہوں نے اسٹوڈیو جانا اور نغمہ ریکارڈ کرانا بند کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اب موسیقی میں اتنا شور ہونے لگا ہے کہ وہ ان کی خیالوں میں ڈوبی ہوئی آواز سے مطابقت نہیں کر پاتی۔ موسیقی کی دنیا میں ان کی گراں قدر خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے طلعت محمود کو پدم بھوشن کے ایوارڈ سے نوازا جا چکا ہے۔

اگر چہ طلعت محمود کے بیٹے خالد نے اپنے باپ کی اہلیت ورثے میں پائی ہے اور ان کی آواز طلعت کی آواز سے بہت قریب بھی ہے، مگر یہ سچ اپنی جگہ موجود رہے گا کہ طلعت محمود کی آواز کی نقل نہیں کی جا سکتی۔ وہ اپنی مثالی اور انفرادی آوز کے ساتھ موسیقی کے دیوانوں کی یادوں میں بسے رہیں گے۔ کوئی بھی شخص یہ تصور کیسے کر سکتا ہے کہ طلعت محمود کے علاوہ کوئی اور یہ نغمہ گا رہا ہے......

مری یاد میں تم نہ آنسو بہانا

نہ دل کو جلانا............ ہمیں بھول جانا

......مگر یہ ممکن نہیں ہے۔ کم از کم جب تک یہ فلمی دنیا قائم رہے گی، یہ ممکن نہیں کہ طلعت محمود کو بھلا دیا جائے۔

ہندوستانی فلمی موسیقی کی تاریخ میں ۹ رمئی ۱۹۹۸ء کا دن یقینی طور پر ''یوم سیاہ'' کی حیثیت سے یاد رکھا جائے گا کیونکہ اس دن سنہری آواز کے مالک، مغنی اور گلوکار شہنشاہ غزل گائیک طلعت محمود اپنے شیدائیوں کو چھوڑ کر اس دارفانی سے کوچ کر گئے۔ طلعت محمود کی مقبولیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے انتقال کی خبر پھیلتے ہی لندن، ویسٹ انڈیز، ہالینڈ، لاگوس اور امریکہ سے ان کے شیدائیوں کے فون پر فون آنے لگے۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ ممبئ فلم انڈسٹری میں ان کے بہت کم شیدائیوں نے ان کی طرف دھیان دیا۔ بہت کم فلمی لوگ اس مقبول گلوکار کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے پہنچے۔

طلعت محمود نے ہندی فلموں کے رومان پسند عہد کے گیتوں کو اپنی آواز سے لازوال بنا دیا تھا۔

راجندر سنگھ بیدی

مجھے یاد ہے ۱۴/مارچ ۱۹۷۴ء کا وہ دن، جب میں فلمساز، ہدایتکار اور مصنف کمال امروہوی سے اُن کے آبائی وطن امروہہ کے اُن کے ذاتی مکان کے آنگن میں انٹرویو کر رہا تھا اور میں نے اُن سے ایک غیر فلمی سا سوال کیا تھا۔ میں نے اُن سے پوچھا تھا...... ''اردو میں آپ کا پسندیدہ ادیب کون ہے؟'' کمال صاحب نے کہا تھا...... ''میرے نقطہ نظر سے موضوع کے لحاظ سے سب سے اچھا لکھنے والے راجندر سنگھ بیدی ہیں اور ان کی کہانی ''ایک چادر میلی سی'' ایک غیر معمولی کہانی ہے۔'' یہ اتفاق ہی ہے کہ میں نے اس وقت تک بیدی صاحب کی طویل کہانی ''ایک چادر میلی سی'' پڑھی نہیں تھی۔ لہٰذا میں نے اگلے ہی دن پہلی فرصت میں ''ایک چادر میلی سی'' تلاش کر کے پڑھی اور مجھے لگا کہ میں نے اب تک بیدی کو پڑھا ہی نہیں تھا۔ یوں بھی کسی فنکار کو پڑھ لینا اتنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ مگر ''ایک چادر میلی سی'' ایک ایسی کہانی ہے کہ اگر بیدی اس کے علاوہ اور کچھ نہ بھی لکھتے تو صرف اسی طویل کہانی سے ادب میں زندہ رہتے۔

راجندر سنگھ بیدی یکم ستمبر ۱۹۱۵ء میں لاہور میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد شری ہیرا سنگھ بیدی کھتری سِکھ خاندان کے اور والدہ سیتا دیوی براہمن خاندان کی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیدی کے یہاں رنگ، مذہب، نسل وغیرہ کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ ان کے دوستوں کا ایک وسیع حلقہ تھا جس میں ہر طبقہ، فکر، نسل، رنگ اور مذہب کے لوگ موجود تھے۔ بیدی انتہائی خوش اخلاق اور زندہ دل انسان کا نام تھا۔

۱۹۳۱ء میں انہوں نے ایس۔ جی۔ بی۔ اے خالصہ اسکول، لاہور سے میٹرک

اور ۱۹۳۳ء میں ڈی۔اے۔وی کالج، لاہور سے انٹر کا امتحان پاس کیا۔مگر چند ناگزیر وجوہات کی بنا پر تعلیم جاری نہ رکھ سکے۔اُن کے والد کا جلد ہی انتقال ہو گیا اور پورے گھر کی ذمہ داری اُن کے جوان ہورہے کاندھوں پر آ گئی۔لہٰذا انہوں نے وہیں پوسٹ آفس میں ملازمت اختیار کر لی۔۱۹۳۴ء میں ۱۹ ؍برس کی عمر میں راجندر سنگھ بیدی کی شادی ستونت کور عرف سوماوتی سے ہوگئی۔اُسی زمانے میں بیدی صاحب نے کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔۱۹۴۳ء میں انہوں نے اپنی اس ملازمت سے سبکدوشی اختیار کی اور دہلی میں مرکزی حکومت میں پبلسٹی کے شعبہ میں کچھ دن کام کرنے کے بعد آل انڈیا ریڈیو لاہور میں ملازمت اختیار کرلی۔تقسیم ہند کے بعد ان کی منتقلی دہلی میں ہو گئی اور ۱۹۴۸ء میں وہ اردو ادیبوں کے ایک وفد میں شریک ہو کر کشمیر گئے۔شیخ محمد عبداللہ نے راجندر سنگھ بیدی کو جموں و کشمیر ریڈیو اسٹیشن کے ڈائریکٹر کا عہدہ سونپ دیا اور وہاں ان کی کوششوں سے سری نگر ریڈیو اسٹیشن کا قیام عمل میں آیا۔مگر وہاں بیدی زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہ سکے اور ایک سال کے قلیل عرصہ تک کام کرنے کے بعد ۱۹۴۹ء میں انہوں نے کشمیر کو خیرآباد کہا اور دہلی ہوتے ہوئے بمبئی پہنچ گئے۔اس کے بعد ان کا مستقل قیام بمبئی میں ہی رہا۔۱۹۶۵ء میں انہیں ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' کے لئے ساہتیہ اکادمی کے انعام سے نوازا گیا اور ۱۹۷۳ء میں ''پدم شری'' کے اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔۱۹۷۸ء میں انہیں غالب ایوارڈ دیا گیا۔

راجندر سنگھ بیدی کی ادبی زندگی کا آغاز ان کی شادی سے قبل ۱۹۳۲ء میں ہی ہو گیا تھا، ابتداء میں انہوں نے محسن لاہوری کے قلمی نام سے لکھنا شروع کیا اور بعد میں اپنے اصلی نام راجندر سنگھ بیدی کے نام سے باقاعدہ کہانیاں لکھنے لگے۔اُن کا پہلا افسانہ ''مہارانی کا تحفہ'' ایک رومانی افسانہ تھا جو ماہنامہ ''ادبی دنیا'' (لاہور) میں شائع ہوا تھا۔۱۹۳۳ء کے بعد بیدی کی کہانیوں میں رومانیت کے بجائے حقیقت نگاری کا رنگ اُبھر کر سامنے آیا اوران کی کہانی فکر کی گہرائیوں میں سنجیدگی کے ساتھ اُترتی چلی گئی۔ بیدی کا پہلا افسانوی مجموعہ ''دانہ ودام'' ۱۹۳۶ء میں ''مکتبہ اردو، لاہور'' سے

شائع ہوا۔ اس میں کل چودہ افسانے شامل تھے۔ ''گرہن'' ان کی کہانیوں کا دوسرا مجموعہ تھا جو ۱۹۴۶ء میں شائع ہوا تھا۔ اسی سال ان کے ڈراموں کا مجموعہ ''سات کھیل'' بھی شائع ہو کر مقبول ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں کہانیوں کا تیسرا مجموعہ ''کوکھ جلی'' شائع ہوا۔ ۱۹۶۴ء میں ''ہاتھ ہمارے قلم ہوئے'' اور ۱۹۸۲ء میں ''مکتی بودھ'' بھی ان کی کہانیوں کے مجموعے تھے۔ بیدی کی مشہور تخلیق ناولٹ ''ایک چادر میلی سی'' مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے ۱۹۶۲ء میں شائع ہوا تھا۔ اس کے علاوہ کہانیوں کا ایک مجموعہ ''اپنے دُکھ مجھے دے دو'' بھی مکتبہ جامعہ، نئی دہلی سے شائع ہوا۔ انہوں نے کئی یک بابی ڈرامے بھی لکھے جو ۱۹۴۶ء میں ''سات کھیل'' اور ۱۹۴۳ء میں ''بے جان چیزیں'' کے نام سے کتابی شکل میں منظر عام پر آئے۔

۱۹۷۷ء میں راجندر سنگھ بیدی کی بیوی ستونت کور کا انتقال ہو گیا اور محفلوں کی رونق، پُر مزاح راجندر سنگھ بیدی بجھ سے گئے۔ دو سال بعد ہی ۱۹۷۹ء میں اُن پر فالج کا حملہ ہوا اور کافی لمبے عرصے تک وہ چلنے پھرنے سے بھی معذور ہو گئے۔

بیدی صاحب نے کئی فلمیں بھی تخلیق کیں جن میں ''پھاگن، گرم کوٹ، دستک'' اور ''رنگولی'' مشہور اور بے مثال ہیں۔ مگر انہوں نے کبھی بھی کمرشیل بننے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی کبھی کاروباری فلموں کے چکر میں پڑ کر اپنے اندر کے ادیب کو مرنے دیا۔

۱۹۸۱ء کے فروری ماہ میں جب بمبئی کے لنکنگ روڈ واقع نریندر بیدی کے مکان پر میری ان سے پہلی ملاقات باقر مہدی کے توسط سے ہوئی تو اس وقت بیدی صاحب کافی بیمار تھے۔ مگر اس حالت میں بھی انہوں نے اپنی روایت کے مطابق خاصی خاطر تواضع کی۔ جب میں نے ان سے نئے افسانے کے مستقبل کے بارے میں سوال کیا تو انہوں نے نہایت اطمینان سے جواب دیا تھا...... ''میں افسانے کے مستقبل سے قطعی نااُمید نہیں ہوں۔ ادب میں تجربے ہوتے رہے ہیں اور یہ ایک اچھی علامت ہے۔''

راجندر سنگھ بیدی بے حد زندہ دل انسان تھے۔ ان کی زندگی میں بہت سے نشیب و فراز آئے مگر بیدی نے بڑی خندہ پیشانی کے ساتھ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ

کیا۔ ایک بار ایک ضرورتمند ان کے گھر گیا اور ڈاکٹر کا نسخہ دکھاتے ہوئے بیدی سے کہا کہ آپ روپے پیسے سے میری مدد نہ کریں بلکہ میرے شدید بیمار بیٹے کے لیے دوائیں دلوا دیں۔ بیدی نے اپنی کار میں اس کو بٹھایا اور کئی دُکانوں پر دوا تلاش کرنے کے بعد نسخے میں لکھی ساری دوائیں خرید کر اس کو دلوا دیں اور بعد میں گاڑی ایک کنارے لگا کر رونے لگے اور اتنا روئے کہ ان کی ہچکی بندھ گئی۔ بعد میں انہوں نے اس واقعہ کو بیان کرتے ہوئے بتایا کہ ان کے والد کی موت بھی اسی مرض میں ہوئی تھی جس کی دوائیں انہوں نے اُس ضرورتمند کو دلائی تھیں۔ اس طرح بیدی کی پُرمزاح شخصیت کے اندر ایک نہایت دردمند دل بھی دھڑکتا تھا۔

کشمیر سے آل انڈیا ریڈیو کی ملازمت ترک کر کے راجندر سنگھ بیدی جب بمبئی کی فلمی دنیا سے وابستہ ہوئے تو وہاں کا ہر شخص اُن کی انسان دوستی سے متاثر ہو کر اُن کا گرویدہ ہوتا گیا۔ کافی عرصہ تک وہ ملک راج آنند کے یہاں ٹھہرے اور زیادہ تر انجمن ترقی پسند مصنفین کے ان لوگوں سے رسم و راہ استوار ہوئی جو کمیونسٹ تحریک سے بھی عملی طور پر وابستہ تھے۔ بعد میں جب ان کا اپنا گھر ہو گیا تو وہاں کئی روپوش کمیونسٹوں کو پناہ بھی ملی۔ کیفی اعظمی اور مجروح سلطانپوری ان کے یہاں مہینوں قیام پذیر رہے۔ پھر اُن پر ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ان کے اپنے ہی بڑے بیٹے نے گھر چھوڑ دیا اور ان کے اپنے گھر کی دیواریں بھی ان کے لیے اونچی ہوتی چلی گئیں۔ وہ اکثر دوستوں کو ملنے اور دعوت وغیرہ پر بھی گھر بلانے کے بجائے ہوٹلوں میں ملنے لگے اور اپنی زندگی کی اس صورت حال پر خود ہی حسرت زدہ رہتے۔ اس درمیان اُن کو بدنامی بھی اُٹھانی پڑی اور فلم ''دستک'' (۱۹۷۰ء) کی تکمیل کے دوران اداکارہ ریحانہ سلطانہ کے ساتھ اُن کے تعلقات کو لے کر کافی چرچے ہوئے۔ فلم بڑی خوبصورت بنی، کامیاب بھی ہوئی مگر چند دنیاوی آسائشوں کے علاوہ بیدی کے ہاتھ کچھ نہ لگا۔ بیدی نے سوچا کہ ایک آخری فلم مارکیٹ کے حساب سے عام روش کے مطابق بنائیں اور سب کچھ سمیٹ کر پنجاب کی طرف نکل جائیں۔ مگر بیدی اپنی آخری سانسوں تک ایسا نہ کر سکے۔ وہ راجندر سنگھ

بیدی جو صرف پانچ روپے اپنی جیب میں لے کر بمبئی آئے تھے اور آہستہ آہستہ فلمی رائٹر کے طور پر اپنی حیثیت منوائی تھی اور اُس کے بعد خود فلمساز بھی بن گئے تھے، مگر کچھ جذباتی فیصلوں کی وجہ سے اور اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر انہوں نے خود کو برباد بھی کیا۔ اُن کی ملٹی اسٹارر فلم ''پھاگن'' فلاپ ہو چکی تھی۔ اس لیے اب کوئی بھی اُن کی فلم پر پیسہ لگانے کو تیار نہیں ہوتا تھا۔ حالانکہ اُن کا بڑا بیٹا نریندر بیدی مسالہ فلمیں بنانے والے ہدایتکار کے طور پر کامیاب ہو چکا تھا، مگر اپنے باپ کی مدد کرنے کے لیے وہ کبھی آگے نہیں آیا۔ تب بیدی اپنی جوہو والی معمولی جھونپڑی میں ہی رہتے تھے۔ ان کی بیوی سے بھی ان کے اختلافات منظر عام پر آچکے تھے اور کئی بار گھر سے باہر دفتر میں بھی جھگڑے ہو چکے تھے۔ حالانکہ بعد میں ان کا بیٹا نریندر بیدی ان کے پاس واپس لوٹ آیا۔ مگر ان کا تعلق ایک فلم رائٹر کے طور پر ہی بنا رہا۔ نریندر بیدی دولت کمانے کے چکر میں کمرشیل سنیما کی طرف زیادہ متوجہ تھا اور فارمولہ فلموں کے ذریعہ کامیابی بھی حاصل کر چکا تھا۔ مگر کم عمری میں ہی کینسر کے موذی مرض سے ۱۹۸۲ء میں نریندر بیدی کا انتقال ہو گیا اور اس طرح راجندر سنگھ بیدی اس صدمے سے ٹوٹ کر رہ گئے تھے۔

راجندر سنگھ بیدی کی فلمی زندگی کا آغاز لاہور میں ہی ہو گیا تھا جب ایک فلم رائٹر کے طور پر مہیشوری فلمز کی ''کہاں گئے'' لاہور میں بنی۔ اس کے بعد بیدی بمبئی آگئے تو انہوں نے تقریباً چالیس فلموں میں ڈائیلاگ لکھے۔ ان میں ''بڑی بہن، داغ، مرزا غالب، دیوداس، ابھیمان، مدھومتی، انورادھا'' اور ''انوپما'' کے نام قابل ذکر ہیں۔ فلم ''ساز، انورادھا، انوپما، میم دیدی، ستیہ کام'' اور ''ابھیمان'' جیسی عمدہ فلمیں بیدی کے ہی زور قلم کا نتیجہ ہیں۔ فلم ''مسافر، انورادھا'' اور ''انوپما کے لئے بیدی کو صدرِ جمہوریہ کا گولڈ اور سلور میڈل بھی عطا کیا گیا۔ اُن کی ہدایت میں بنی پہلی فلم ''دستک'' کو بھی صدر جمہوریہ کا ایوارڈ ملا۔

راجندر سنگھ بیدی بلا شبہ اردو افسانے اور ہندوستانی سنیما کے سلسلے میں ایک قدر آور شخصیت کا نام ہے۔ انہوں نے جس طرح اپنے کرداروں کو افسانے کے ذریعہ

برتا ہے، ہر کسی کے بس کی بات نہیں ہے۔ چاہے وہ لاجونتی ہو، یا ''رحمٰن کے جوتے'' والا رحمٰن ہو۔ ان کا ہر کردار اپنے آپ میں مکمل ہے، اپنی تمام تر نفسیات کے ساتھ گہرائی اور گیرائی کے ساتھ۔ ہندوستانی فلموں سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اردو ادب کی چادر کو کبھی میلا نہیں ہونے دیا۔

راجندر سنگھ بیدی علم نجوم میں بھی یقین رکھتے تھے اور انہوں نے اپنی جنم کنڈلی بھی بنوائی ہوئی تھی۔ ان کی زندگی میں کئی باتیں اتفاقیہ طور پر جنم کنڈلی میں درج باتوں کے مطابق ہوئیں۔ جیسے ان کی زندگی میں بیٹے کی موت، مگر ان کی کنڈلی کے مطابق ان کو ۷۷ر برس تک جینا تھا۔ جبکہ اُن کے انتقال کے وقت اُن کی عمر صرف ۶۹ر برس کی تھی۔ ۱۱ر نومبر ۱۹۸۴ء کو بمبئی میں راجندر سنگھ بیدی کا انتقال ہوا۔

آج جسمانی طور پر بیدی ہمارے درمیان موجود نہیں ہیں مگر ان کی روح آج بھی ان کے افسانوں کے کرداروں کے روپ میں ہمارے سامنے موجود ہے اور اب مجھے ایسا لگتا ہے کہ بیدی ایک نہیں، کئی تھے۔ صرف جسم والا بیدی ہم سے بچھڑا ہے اور وہ بیدی جو اُن کی کہانیوں کے کرداروں میں موجود ہے، وہ بیدی کی آتما ہے اور آتما کبھی نہیں مرتی، آتما امر ہوتی ہے۔

○○

کھیم چند پرکاش

نئی نسل کے سُر اور سنگیت کے شیدائیوں کو کھیم چند پرکاش کا نام، جنہیں عرف عام میں کھیم راج جی کہا جاتا تھا، بڑا انجانا سا، بڑا عجیب سا لگے...... لیکن وہ کھیم چند پرکاش ہی تھے جنہوں نے صرف ایک گانے سے لتا منگیشکر کو شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر پہنچا دیا تھا۔ فلم ''ضدی'' کے گانے 'چندا رے جا رے جا رے'' سے پہلے لتا کو بطور پلے بیک سنگر کوئی نہیں جانتا تھا۔ فلم ''محل'' کے یادگار نغمے ''آئے گا آنے والا'' کی دلکش دُھن ترتیب دینے والے میوزک ڈائیریکٹر کھیم چند پرکاش ہی تھے۔ کھیم چند پرکاش نے ہی فلم ''ضدی'' میں کشور کمار کو بطور پلے بیک سنگر پیش کیا تھا۔ اس فلم میں دیو آنند کے لیے گایا ہوا کشور کمار کا گانا ''مرنے کی دُعائیں کیوں مانگوں، جینے کی تمنا کون کرے'' آج بھی موسیقی کے شیدائیوں میں مقبول ہے۔ میوزک ڈائیریکٹر کھیم چند پرکاش، جنہیں گورو جی بھی کہا جاتا تھا، پانچویں دہائی میں فلم سنگیت پر مکمل طور پر چھائے رہے۔ میوزک ڈائیریکٹر نوشاد، بلوسی رانی، اور بھولا سریشٹھ جیسے نامور میوزک ڈائیریکٹروں نے نہ صرف گورو جی کے اسلوب کو اپنایا، بلکہ شرفِ تلمذ بھی حاصل کیا۔ کھیم چند نے ہی ہندی فلموں کو راجستھانی لوک سنگیت سے روشناس کرایا۔ ''ضدی، بھرتری ہری، سندور، تان سین'' اور ''محل''، کھیم چند پرکاش کی یادگار فلمیں کہی جاتی ہیں۔

سجان گڑھ، راجستھان کے ایک موسیقی نواز خاندان میں کھیم چند پرکاش کا جنم ہوا۔ والد درباری گائیک تھے۔ ایک طرح سے سنگیت کھیم چند کو وراثت میں ملا تھا۔ اوائل

عمر سے ہی کھیم چند نے رقص و موسیقی کا ریاض شروع کر دیا تھا اور جلد ہی کلاسکی موسیقی اور کتھک ناچ کے ماہر کہلانے لگے۔ راجستھان کا لوک سنگیت کھیم چند کے رگ و پے میں بسا ہوا تھا۔ ان کی ہر دھڑکن میں راجستھانی لوک سنگیت کی سگندھ بسی ہوئی تھی۔

کھیم چند نے دھروپد گائیکی، گووردھن پرساد سے سیکھی تھی۔ کھیم چند کے والد اُن دنوں راج گھرانے کے سب سے بڑے گائیک تھے، جہاں سے وہ مہاراجہ نیپال کے پیغام پر نیپال چلے گئے اور نیپال کے درباری گائیک بن گئے۔ کھیم چند بھی اپنے والد کے ساتھ نیپال چلے گئے۔ کھیم چند کے فلمی کیریئر کا آغاز اُن کی واپسی پر اس وقت ہوا جب آپ نے کلکتہ آکر نیو تھیٹرز میں ملازمت کر لی، اور ۱۲۰/روپے ماہانہ پر میوزک ڈائیریکٹر تمر برن کے اسسٹنٹ بن گئے۔ ۱۹۳۹ء میں جب آپ نے نیو تھیٹر کو خیر آباد کہا تو آپ وہاں سے ۵۰۰/روپے ماہانہ لیتے تھے۔

کہا جاتا ہے کہ بمل رائے کی فلم ''دیوداس'' میں میوزک ڈائیریکٹر تمر برن کے اسسٹنٹ کے طور پر ''بالم آئے بسو مورے من میں'' (راگ کافی) اور ''دکھ کے اب دن بیتے نہ ہیں' (راگ دیس) کی دھنیں کھیم چند نے ہی ترتیب دی تھیں۔ یہی نہیں، ڈائیریکٹر فنی مجمدار کی فرمائش پر کھیم چند نے فلم ''سٹریٹ سنگر'' کے ایک گانے ''لو کھالو میڈم کھانا'' کے مزاحیہ سین میں اداکاری بھی کی تھی۔

آزادانہ طور پر اپنی پہچان بنانے کے لئے کھیم چند، پرتھوی راج کپور اور کیدار شرما کے ساتھ بمبئی چلے آئے، اور رنجیت مووی ٹون میں شمولیت اختیار کر لی اور ۱۹۳۹ء میں پہلی فلم ''میری آنکھیں'' کے لئے سحر آفریں دُھنیں ترتیب دے کر اپنا آزادانہ مقام بنا لیا، اس کے بعد ۱۹۴۱ء میں ''پردیسی، شادی'' اور ''امید'' فلمیں آئیں، جن کی کامیابی میں کھیم چند کے ترتیب دئے ہوئے نغموں کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے بعد تو کھیم چند بمبئی فلم انڈسٹری میں سنگیت کے بے تاج بادشاہ کہلانے لگے۔

بمبئی میں اپنے ابتدائی فلمی کیریئر میں کھیم چند نے جو سب سے زیادہ تاثر انگیز نغمہ پیش کیا تھا، وہ تھا...... ''پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا''۔ فلم ''پردیسی'' کے لئے خورشید

کے گائے ہوئے اس نغمے کو آج بھی خورشید اور کھیم چند کے اچھے نغموں میں شمار کیا جاتا ہے۔اس نغمے کے ساتھ ایک واقعہ وابستہ ہے۔ کھیم چند کے ایک نزدیکی رشتہ دار پنڈت جگن ناتھ پرساد کا کہنا ہے کہ...... "جب خورشید کو یہ نغمہ گانے کو دیا گیا تو اس نے گانے میں آنا کانی برتی، اس پر غصہ سے آگ بگولہ ہو کر کھیم چند نے خورشید کو الٹی میٹم دیا کہ گانا گاؤ یا دفع ہو جاؤ!...... کھیم چند کو ناراض کرنے کی خورشید میں ہمت نہ تھی۔ اس لئے اس نے گانا گایا اور دل سے گایا۔ پُرسوز آواز میں دل سے گایا ہوا خورشید کا یہ نغمہ جب کھیم چند نے ریکارڈنگ کے بعد دوبارہ سُنا تو بس سُنتے ہی رہے۔ نہ معلوم کتنی بار انہوں نے اس گانے کو سنا ہوگا۔

"میں تیرا ہوں میں تیرا کانوں میں میرے کہنا
اور بھاگ کے دنیا سے آنکھوں میں میری رہنا
اتنا جو سمجھتے ہم چپکے سے تیرا کہنا
نہ دل ہی دیا ہوتا، نہ پیار کیا ہوتا،
پہلے جو محبت سے انکار کیا ہوتا

بتایا جاتا ہے کہ یہ گانا، نہ گانے کی خورشید کے پاس اپنی وجہ تھی۔ یہ نغمہ بیگم اختر کی مشہور غزل 'دیوانہ بنانا ہے' سے ملتا جلتا تھا، اور خورشید کسی طور پر بھی بیگم اختر جیسی معیاری نامور گلوکارہ سے ٹکر لینا نہیں چاہتی تھی۔ اس لئے کہ خورشید کو اپنی فنی صلاحیتوں پر اتنا اعتبار نہیں تھا کہ ایک نامور گائیکا کی ٹکر کا نغمہ پیش کر سکے، لیکن خورشید نے جب 'پہلے تو محبت سے انکار کیا ہوتا' گایا تو اسے بیگم اختر سے بھی دادِ تحسین حاصل ہوئی۔

اس گانے کو نہ گانے کی ایک وجہ یہ بھی بتائی جاتی ہے کہ اُن دنوں خورشید اور کھیم چند اپنے دل میں نرم گوشہ محسوس کر رہے تھے۔ اگرچہ ان کے پیار کی کلی کھل کر شگفتہ پھول نہیں بنی تھی، لیکن عشق کی سگندھ مشک کی طرح پھیل چکی تھی، اور اسٹوڈیو میں ان کے عشق کے چرچے ہونے لگے تھے۔ عشق و محبت کی دیوانگی کی وجہ سے ہی خورشید نے

مایوسی میں ڈوبی ہوئی اس غزل کو گانا پسند نہیں کیا۔

کھیم چند اور خورشید کے عشق کی بہت لمبی کہانی ہے۔ ۱۹۴۲ء میں کھیم چند نے "چاندنی" اور "کھلونا" جیسی کئی فلموں میں ہٹ میوزک دیا، لیکن خورشید اور سہگل کے سُریلے نغموں سے آراستہ فلم "تان سین" کے نغموں نے جو مقبولیت حاصل کی، وہ شاید ہی اب تک کسی فلم کو نصیب ہوئی ہوگی...... رم جھم رم جھم چال تمہاری...... (سہگل)، کاہے گمان کرے گوری...... (سہگل)، دیا جلاؤ جگمگ جگمگ...... (سہگل)، مورے بالا پن کے ساتھی چھیلا بھول جیئو نہ...... (سہگل، خورشید)، اب راجہ بھئے مورے بالم...... (خورشید)، برسو کارے بدروا، پیا پے برسو...... (خورشید)، او دُکھیا جیارا دیویں میکا گالی...... (خورشید)، گھٹا گھنگھور، گھور...... (خورشید)۔

OO

شریفہ بائی

ہندوستانی فلموں کا وہ دن تاریخ کا سنہرا دن تھا جب فلموں نے بولنا شروع کیا اور متحرک فلموں کو مکالمہ عطا کیا گیا۔ یہ لگ بھگ ۱۹۳۱ء کا دور تھا۔ اس دور میں اسٹیج کے اداکاروں کی فلموں میں مانگ یکدم بڑھ گئی۔ ان اداکاروں میں کچھ مشہور نام تھے...... کجن، پیشن کپور، اور شریفہ! یہ سارے نام کلکتہ کے مدن تھیئٹر کی پیداوار تھے۔

شریفہ بائی بھی مدن تھیئٹرس کی سٹار کہی جاتی تھیں، انہوں نے آغا حشر کاشمیری کے بہت سے ڈراموں میں کام کیا تھا۔ شریفہ بائی کی پہلی فلم بھی مدن تھیئٹرس کی مختصر سی متکلم فلم ''چوں چوں کا مربہ'' تھی۔ اس فلم کی تکمیل ''عالم آراء'' سے پہلے ہوئی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے ''شیریں فرہاد'' میں کچھ مزاحیہ قسم کا کردار ادا کیا تھا۔ بعد میں شریفہ بائی دو مشہور ڈراموں ''بھارتی بالک'' اور ''ہریش چندر'' پر بنی فلموں میں ہیروئن بن کر پردے پر جلوہ گر ہوئیں۔ ''ہریش چندر'' میں شریفہ بائی نے تارامتی کا کردار ادا کیا تھا اور نواب نے ہریش چندر کا۔

ان فلموں کے بعد وہ سخت بیمار ہو گئیں اور کچھ دنوں کے لیے ان کی فلمی سرگرمیاں سرد پڑ گئیں۔ صحت یاب ہونے پر انہوں نے بمبئی آنے کا فیصلہ کر لیا۔ بمبئی آنے کے بعد انہوں نے ۱۹۳۴ء میں پہلی فلم واڑیا کی ''کالا گلاب'' میں کام کیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے مختلف ڈراموں میں بھی کام جاری رکھا۔ ۱۹۳۰ء سے ۱۹۴۰ء کے درمیان انہوں نے کئی فلموں میں کام کیا تھا۔

شریفہ بائی کی قابل ذکر فلمیں تھیں...... اے بھونانی کی ''نیکڈ ٹروتھ'' (ننگا

سچ)، اور اجیت مووی ٹون کی ''سلطانہ چاند بی بی'' اور ''مدر انڈیا''۔ شریفہ بائی کی یہ تینوں فلمیں ہندوستانی فلموں کی تاریخ میں بہت اہم مانی جاتی ہیں۔

دادا گنجل کی ہدایت میں بنی فلم ''مدر انڈیا'' کی ہر طرف سے تعریف ہوئی تھی۔ یہ فلم ہندوستان میں بننے والی شروع شروع کی رنگین فلموں میں سے ایک تھی۔ اس فلم میں شریفہ بائی نے ایک ایسی عورت کا کردار ادا کیا تھا جو اپنے شوہر اور بچوں کے لیے بے پناہ دُکھ بھری زندگی گزارتی ہے۔ فلم ''مدر انڈیا'' میں شریفہ کو بہترین اداکاری کے لیے ''لارڈ لیلی تھیو'' میڈل بھی ملا تھا۔ اس زمانے کے ایک بہت بڑے تاجر ڈیوڈ سیسن نے بھی ان کو میڈل دیا تھا۔

فلمساز دریانی کی فلم ''پیاس'' میں انہوں نے اداکار نذیر کی بیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ جن دنوں شریفہ اداکارہ کے طور پر ہندوستانی فلموں میں مقبول تھیں، ان ہی دنوں میں ان کی بیٹی حسن بانو نے بھی فلموں میں چھوٹے موٹے کردار شروع کر دیے تھے اور آہستہ آہستہ اپنے قدم اسٹارڈم کی طرف بڑھانے شروع کر دیے تھے۔ حسن بانو کا اصلی نام روشن آراء تھا۔ حسن بانو کی سب سے پہلی فلم ''ڈاکو منصور'' تھی۔

فلمستان کی فلم ''سازش'' اور ''چاند کی دنیا'' میں انہوں نے زبردست کریکٹر رول ادا کیے تھے۔ فلم ''ادھیکار'' کی ہیروئن اور فلم ''آرزو'' کی معاون اداکارہ ناظمہ بھی شریفہ بائی کی نواسی ہیں۔ مگر ناظمہ کو فلمی دنیا میں وہ شہرت اور مقبولیت کبھی حاصل نہ ہو سکی جو اپنے وقت میں اُن کی نانی شریفہ کو حاصل تھی۔ ناظمہ صرف فلمی بہن بن کر ہی رہ گئی اور باصلاحیت فنکارہ ہوتے ہوئے بھی کبھی بڑی ہیروئن نہیں بن سکی۔ مسلسل ناکامیوں سے تنگ آ کر ناظمہ نے شادی کر لی اور اب مکمل طور پر ایک گھریلو عورت کی زندگی گزار رہی ہیں۔

اس طرح خاموش فلموں سے متکلم فلموں تک کے سفر میں ایک ہی خاندان کی تین اداکاراؤں، شریفہ بائی، حسن بانو عرف روشن آراء اور ناظمہ نے لگ بھگ چھ دہائیوں تک اپنے آپ کو فلموں سے وابستہ رکھا۔ شریفہ بائی کا جنوری ۱۹۸۱ء میں بمبئی میں انتقال ہو گیا تھا۔ آج بھی بمبئی کی ایک بلڈنگ کی پیشانی پر لکھا ہوا ''شریفہ مینشن'' زبانِ حال سے تین نسلوں کی داستان کہتا ہوا نظر آتا ہے۔ OO

کیفؔی اعظمی

۱۴/اکتوبر۱۹۹۵ء کی شام ٹیلی فون پر کیفؔی اعظمی کی پاٹ دار آواز سنائی دی......
''میں دہلی میں ہوں، اجے بھون میں۔ تم سے ملنا ہے اور کچھ باتیں کرنی ہیں۔ کچھ نئی کتابیں بھی لیتے آنا۔'' اور میں نے صبح آنے کا وعدہ کر کے فون رکھ دیا۔ اگلی صبح جب میں کیفؔی اعظمی سے ملنے کے لئے جانے لگا تو میرے بیٹے مسعود التمش نے بھی کیفؔی صاحب سے ملنے کی خواہش ظاہر کی۔ میں نے اپنے ادارے تخلیق کار پبلشرز سے شائع کی ہوئی کچھ نئی کتابیں لیں اور مسعود التمش کو ساتھ لے کر اجے بھون پہنچ گیا۔ کمرے کے دروازے پر دستک دینے کے ساتھ ہی اندر سے ایک سخت سی آواز سنائی دی......
''کون ہے؟'' یہ شوکت کیفی کی آواز تھی اور جب میں نے اپنا نام بتایا تو دروازہ کھولنے کے ساتھ ہی شوکت کیفی بڑے شکایتی اور اسی سخت لہجہ میں کہہ رہی تھیں...... ''انیس میاں! آنے میں بڑی دیر لگا دی۔ کیفؔی کئی بار یاد کر چکے ہیں۔ میں نے جب نئی کتابیں کیفؔی صاحب کو پیش کیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔ اس ملاقات میں بہت سی باتیں ہوئیں۔ خاص طور سے ان کی کتاب 'میری آواز سنو' کے بارے میں، جسے وہ کچھ اضافوں کے ساتھ دوبارہ چھپوانا چاہتے تھے۔ اس کی کتابت اور پروف ریڈنگ میری نگرانی میں 'ستار پبلی کیشنز' میں ہو چکی تھی۔ اس کے علاوہ کیفؔی اعظمی اپنی ایک نئی کتاب بھی میرے ادارے سے شائع کرانا چاہتے تھے۔ جب میں رخصت ہونے لگا تو مسود میاں نے کیفؔی صاحب سے آٹو گراف لینے کی فرمائش کر دی۔ مسعود التمش کے لئے اتنے بڑے شاعر اور فلمی نغمہ نگار سے ملاقات کا یہ پہلا تجربہ تھا۔ لہٰذا میں نے کیفؔی صاحب

سے کہا کہ اِن کے لئے کچھ لکھ بھی دیجئے۔ تب کیفی صاحب نے لکھا تھا...... ''مسعود میاں! اردو بہت خوبصورت زبان ہے۔ اسے زیادہ سے زیادہ پڑھا کرو۔ نیک دعاؤں کے ساتھ......'' اور کیفی صاحب نے دستخط کر کے مسعود میاں کو وہ پرچہ دے دیا، جو آج بھی اُن کے پاس کسی سرمایہ کی طرح محفوظ ہے۔

۱۹۸۱ء میں جب میں بمبئی میں تھا تو ایک بار کیفی اعظمی سے ملنے 'جانکی کٹیر' گیا تھا۔ وہاں مشہور فلمی اداکار جانکی داس سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے بتایا کہ کیفی صاحب تو بمبئی سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ اُس وقت مجھے کافی مایوسی ہوئی تھی۔

کیفی اعظمی سے میری پہلی ملاقات ۱۹۸۲ء میں اس وقت ہوئی تھی جب میں اسٹار پبلی کیشنز کے ماہنامہ 'مووی اسٹار' کا مدیر تھا اور امرناتھ جی نے اپنے کیبن میں بلا کر کیفی اعظمی سے میرا تعارف کرایا تھا۔ اس سے پہلے ہی میں پاکٹ بکس ایڈیشن میں کیفی صاحب کی شاعری کا انتخاب اردو اور ہندی میں آمنے سامنے ''کیفی کی شاعری'' کے نام سے شائع کر چکا تھا۔ اس کے بعد تو جب بھی کیفی صاحب دہلی آئے، مجھے فون کیا اور میں ان سے ملاقات کے لئے پہنچ گیا۔ ساتھ میں اپنے ادارے کی چند کتابیں بھی لے گیا۔ کیفی صاحب ہر بار کہتے...... ''تم میرے لئے سب سے قیمتی تحفہ لاتے ہو۔''

اتر پردیش کے ضلع اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں مجواں کے ایک زمیندار مسلم شیعہ خاندان میں ۱۹۱۸ء کو کیفی اعظمی پیدا ہوئے۔ والدین نے اطہر حسین رضوی نام رکھا۔ ان کے والد کا نام فتح حسین رضوی اور والدہ کا نام کنیز فاطمہ تھا۔

اطہر حسین رضوی بچپن ہی سے انتہائی حساس واقع ہوئے تھے۔ گھر میں شعر وشاعری کا ماحول رہتا تھا۔ والد بھی کبھی کبھار فارسی میں اشعار کہا کرتے تھے اور تینوں بڑے بھائی بھی باقاعدہ شاعر تھے۔ اس وقت اطہر حسین کی عمر گیارہ برس کی تھی، جب گھر کے مردانے سے زنان خانے اور زنان خانے سے مردانے کے چکر لگاتا ہوا یہ لڑکا شعر بھی کہتا جاتا تھا۔

گھر میں اس کا صرف ایک ہی دوست تھا اور وہ تھیں اس کی بڑی بہن واجدہ باجی۔

ایک دن اس لڑکے نے اپنی بہن کے سامنے عزم کیا کہ وہ ایک دن ہندوستان کا مشہور شاعر بنے گا، اور اس کامیابی سے اسے دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ صرف گیارہ برس کی عمر میں اطہر حسین نے بہرائچ کے ایک مشاعرے میں اپنی ایک غزل سنا کر اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا تھا۔ یہ ایک کامیاب غزل تھی۔ اس غزل کو بعد میں بیگم اختر نے بھی گایا تھا اور اس غزل کا ایک شعر کافی مقبول ہوا تھا......

جس طرح ہنس رہا ہوں میں پی پی کے گرم اشک
یوں دوسرا ہنسے تو کلیجہ نکل پڑے

......اس کامیاب غزل پر خوش ہو کر اطہر حسین کے والد نے ایک پارکر پین اور ایک شیروانی کے ساتھ ہی اس لڑکے کو ایک تخلص "کیفی" بھی دیا، جو بعد میں کیفی اعظمی ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی کیفی کو عربی اور فارسی کی تعلیم کے لیے سلطان المدارس، لکھنؤ بھیج دیا گیا، جہاں وہ بورڈنگ میں رہتے بھی تھے۔ مولویوں کی صحبت کیفی اعظمی سے برداشت نہ ہو سکی اور وہاں سے ان کا دل اکھڑ گیا۔ بڑی مشکل سے انہوں نے اپنی تعلیم ختم کی۔

کیفی اعظمی کی پہلی نظم "سرفراز"، لکھنؤ میں شائع ہوئی۔ اسی زمانے میں کیفی چپکے چپکے روس کی حمایت میں نظمیں لکھ کر "قومی جنگ" کو بھیجنے لگے۔ پی۔ سی۔ جوشی، سجاد ظہیر اور سردار جعفری یہ نظمیں دیکھتے اور حیران ہوتے تھے کہ یہ شخص اپنا نام اور پتہ کیوں نہیں لکھتا۔ بعد میں ایک مشاعرے میں علی سردار جعفری نے کیفی اعظمی کو تلاش کر ہی لیا اور جب سجاد ظہیر نے کیفی سے بمبئی چلنے کی فرمائش کی تو کیفی فوراً تیار ہو گئے۔ گھر میں ایک کھلبلی مچ گئی۔ سردار جعفری اور سجاد ظہیر کے ساتھ کیفی اعظمی بمبئی آ گئے اور ۱۹۴۳ء میں پارٹی کے کُل وقتی ممبر ہو گئے۔ اس زمانے میں پارٹی کے اخبارات کے پہلے صفحے پر کیفی اعظمی کی نظمیں شائع ہونا شروع ہو گئیں اور انہیں شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی گئی۔ پارٹی ہی نے کیفی کی نظموں کا پہلا مجموعہ "جھنکار" ۱۹۴۳ء میں شائع کیا تھا جو ہاتھوں ہاتھ فروخت ہو گیا۔ اس وقت ان کی ایک نظم "عورت" بہت مشہور ہوئی تھی۔

۱۹۴۷ء میں یہ وجیہہ اور جوشیلا نوجوان شاعر ایک مشاعرے میں حیدرآباد پہنچا اور وہیں شوکت خانم سے ملاقات ہوئی جو بعد میں شادی کی صورت اختیار کر گئی۔ شوکت خانم، سنّی خاندان کی دبلی پتلی سی لڑکی تھیں۔ اس شادی کی کافی مخالفت ہوئی مگر آخر میں فتح محبت کی ہوئی اور بہت سے ادیب اور شاعروں کی موجودگی میں اس لڑکی شوکت خانم کا نکاح کیفی سے پڑھا دیا گیا۔ جوشؔ ملیح آبادی، مجازؔ، علی سردار جعفری، ساحرؔ لدھیانوی اور سکندر علی وجدؔ سب نے اس شادی میں شرکت کی اور اپنی اپنی خوبصورت نظموں سے شادی کی محفل کو کامیاب اور حسین بنا دیا۔ اس زمانے میں کیفؔی اعظمی کی پارٹی سے آمدنی صرف پینتالیس روپے ماہوار تھی اور گزر اوقات بڑی مشکل سے ہو پاتی تھی۔ آمدنی بڑھانے کے لئے کیفؔی اعظمی نے ایک روزنامہ اخبار میں پانچ روپے روز پر ایک مزاحیہ نظم لکھنا شروع کر دی۔ ادھر شوکت کیفی نے ''انڈین پیوپلز تھیٹر'' میں کام شروع کر دیا۔ بعد میں کیفؔی کو ''نیا ادب'' کے ایڈیٹر کی حیثیت سے دو سو روپے ماہوار آمدنی ہونے لگی۔ اپنے قیام بمبئی کے ابتدائی دنوں میں کیفؔی اعظمی کمیونسٹ پارٹی کے ریڈ فلیگ ہال میں رہا کرتے تھے، جہاں ہر کامریڈ کو ایک کمرہ ملا ہوا تھا، غسلخانہ اور ٹوائیلٹ سب کے لئے مشترکہ تھا۔ گھر خرچ کے لئے کیفؔی کو صرف چالیس روپے ماہانہ اپنے پاس رکھنے کی اجازت تھی۔ باقی آمدنی وہ پارٹی فنڈ میں جمع کرادیا کرتے تھے۔

شوکت کیفی کے مستقل تھیٹر کرنے سے جب اُن کے اقتصادی حالات کچھ بہتر ہوئے، تب کیفؔی اعظمی اپنے دونوں بچوں اور بیوی کو لے کر جانکی کٹیر، جوہو میں آگئے۔ اس طرح پرتھوی تھیٹر جانکی کٹیر کے قریب ہونے کی وجہ سے شوکت کیفی کو بھی کچھ آسانی ہوگئی۔ شوکت کیفی اکثر پرتھوی تھیٹر کے ساتھ دوسرے شہروں میں ٹور پر جاتی تھیں اور اُن دنوں کیفؔی اعظمی اپنے بچوں کے لئے ماں کا کردار بڑی خوش اسلوبی سے ادا کیا کرتے تھے۔ وہ انہیں نہلاتے، کپڑے پہناتے، کھانا کھلاتے اور اسکول پہنچاتے تھے۔ اب ان کی بیٹی شبانہ اعظمی (اداکارہ اور پارلیمنٹ رکن) اور بیٹا بابا اعظمی سینماٹوگرافر ہیں۔

کیفی اعظمی ترقی پسند مصنفین میں رہ کر برابر ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے لئے کام کرتے رہے۔ پھر ۱۹۶۲ء میں ہندوستانی کمیونسٹ پارٹی کے بھی دو ٹکڑے ہو گئے۔ اس تقسیم سے کیفی اعظمی کو بے انتہا تکلیف پہنچی، مگر انہوں نے زبان سے کچھ نہیں کہا۔ ان ہی دنوں کیفی اعظمی نے ایک نظم ''آوارہ سجدے'' کہی جو عوام وخواص میں بے انتہا مقبول ہوئی۔

کیفی اعظمی نے مالی حالات سے تنگ آ کر اور بڑھتے ہوئے اخراجات کو مدنظر رکھتے ہوئے فلموں میں گانے لکھنے شروع کر دئے۔ فلمساز شاہد لطیف نے سب سے پہلے اپنی فلم ''بزدل'' کے لئے دو گانے کیفی اعظمی سے لکھوائے، جن کا معاوضہ ایک ہزار روپے کیفی اعظمی کو ملا۔ ان ہی دنوں ان کے یہاں شبانہ اعظمی کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ کیفی کو فلموں میں نغمہ نگاری کا کام ملنے لگا اور ان کی مالی حالت بہتر ہوتی گئی، مگر انہوں نے پارٹی کا کام پھر بھی نہیں چھوڑا۔ اس کے بعد انہوں نے گرودت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' اور موہن سہگل کی فلم ''اپنا ہاتھ جگن ناتھ'' کے لئے گانے لکھے۔ فلم ''کاغذ کے پھول'' کے گانے بے حد مقبول ہوئے اور اس کے بعد رمیش سہگل کی فلم ''شعلہ وشبنم'' کا گانا 'جانے کیا ڈھونڈتی رہتی ہیں یہ آنکھیں مجھ میں : راکھ کے ڈھیر میں شعلہ ہے نہ چنگاری ہے' بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد جب چیتن آنند نے اپنی فلم ''حقیقت'' کے گانے کیفی اعظمی سے لکھوائے تو اس فلم کے سب گانے مقبول ہوئے اور فلم بھی کافی کامیاب رہی۔ چیتن آنند کی ہی ایک فلم ''ہیر رانجھا'' تو کیفی اعظمی کا ایک کارنامہ ہے، کیوں کہ اس پوری فلم کے مکالمے کیفی اعظمی نے منظوم لکھے تھے۔

فلم ''گرم ہوا'' کی کہانی، مکالمے اور منظر نامہ بھی کیفی اعظمی کے ہی لکھے ہوئے ہیں، جس کے لئے انہیں فلم فیئر کے تین ایوارڈ ملے تھے۔ اس فلم کی کہانی کے لئے نیشنل ایوارڈ بھی کیفی اعظمی کو مل چکا ہے۔ کیفی کی اب تک پانچ کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ 'جھنکار (۱۹۴۳)، آخرِ شب (۱۹۴۷ء)، آوارہ سجدے (۱۹۷۳ء)، میری آواز سنو (۱۹۷۴ء)، اور سرمایہ (۱۹۹۴ء)۔ اس کے علاوہ ان کی ایک طویل نظم 'ابلیس کی مجلس

شورئی' بھی ۱۹۸۳ء میں ایک کتابچہ کی شکل میں شائع ہوئی۔
۹رفروری ۱۹۷۲ء کو کیفی اعظمی پر فالج کا زبردست حملہ ہوا اور ان کے زندہ رہنے کی کوئی امید نہ رہ گئی تھی۔ اس حملے میں ان کا ایک ہاتھ بے جان ہو گیا، مگر کیفی نے ہار نہیں مانی اور وہ مستقل مردانہ وقار کے ساتھ موت سے لڑتے رہے۔ ۱۹۷۴ء میں علاج کے لئے وہ روس بھی گئے۔ کیفی اعظمی زبردست قوت ارادی کے مالک تھے۔ ایک ہاتھ سے مفلوج ہونے اور چلنے پھرنے میں بے حد دقت ہونے کے باوجود ہر میٹنگ میں وہ جاتے رہے اور ہر مشاعرے میں اپنی نظمیں لوگوں تک پہنچاتے رہے۔ 'اپٹا' کو سرگرم رکھنے میں کیفی اعظمی کا، ان کی ہمت کا اور استقلال کا بے حد دخل تھا۔ وہ اپٹا کے آل انڈیا صدر کے عہدے پر برسوں کام کرتے رہے۔ گزشتہ دنوں انہوں نے ایک فلم ''نسیم'' میں خود اپنا ہی ایک بے حد پُر اثر کردار ادا کیا تھا اور جب مشترکہ تہذیب کے علمبردار اس کردار کی موت ہوتی ہے تو پورا شہر فرقہ وارانہ فسادات کے شعلوں میں گھرا ہوا ہے، اور اُسی ماحول میں اُس کا جنازہ گھر سے نکلتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح، جس طرح اصل زندگی میں کیفی اعظمی کا جنازہ اس وقت گھر سے نکلا جب انتہا پسندوں اور فاسسٹوں نے گجرات کے بہانے پورے ملک کو فرقہ وارانہ منافرت کے شعلوں میں جھلسا رکھا تھا۔
کیفی اعظمی کو اپنے گاؤں اور پھولوں سے بے حد پیار تھا۔ مستقل بیماری کی وجہ سے وہ اپنا زیادہ وقت گاؤں میں گزارنے لگے تھے۔ چھوٹے سے گاؤں مجواں میں کیفی اعظمی کی ہی کوششوں سے پختہ سڑک بنی، اسپتال بنا اور ایک ڈاکخانہ بھی قائم ہو گیا۔ کتابیں خریدنا، فاؤنٹین پین تحفے میں قبول کرنا اور پھول پودے لگوانا اُن کو بہت پسند تھا۔
کیفی اعظمی کی شاعری میں بلا کا حُسن ہے۔ اُن کی نظمیں 'تلنگانہ، مکان، عورت، بہروپنی، ماسکو، ابن مریم، دوسرا بنواس، بنگلہ دیش، اور زندگی' بے حد مقبول ہوئی ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے جو غزلیں کہی ہیں ان میں بھی کیفی اعظمی کا اپنا ہی رنگ جھلکتا ہے۔ ان کی شاعری میں ان کے ذاتی غم اور مسرتیں ان کی ذاتی

وارداتیں نہیں رہتیں، بلکہ عام انسانوں کا دکھ درد ان میں سمٹ آتا ہے، اور اس طرح غمِ جاناں بھی غمِ دوراں بن جاتا ہے۔ ان کی جد و جہد ذاتی نہ ہوکر عوامی جدوجہد کا سیل رواں بن جاتی ہے۔

کیفی اعظمی اردو کے رسم الخط کو بدلنے کے سخت مخالف تھے۔ مگر ان کی سب سے بڑی لڑائی فرقہ واریت کے خلاف تھی۔ وہ اپنی زندگی کے آخری لمحے تک اس ذہنیت کے خلاف آواز اُٹھاتے رہے۔ اپنی نظموں کے ذریعہ یا اپنی تقریروں اور مختلف وقتوں میں لئے گئے انٹرویوز میں ہمیشہ انہوں نے فرقہ واریت کے خلاف اپنی بات کو مضبوطی کے ساتھ پیش کیا۔ وہ زندگی بھر سماجواد کے لئے لڑی جانے والی جنگ کے ایک مضبوط سپاہی بنے رہے۔ کیفی اعظمی کا یقین تھا کہ ہندوستان میں ایک دن ضرور سوشلزم آئے گا۔ ان کا کہنا تھا کہ میں غلام ہندوستان میں پیدا ہوا تھا اور اب آزاد ہندوستان میں جی رہا ہوں، اور سماج وادی ہندوستان میں مروں گا۔ مگر ان کا سماجوادی ہندوستان میں مرنے کا خواب اس لئے پورا نہ ہوسکا کہ ان کے آخری دنوں میں فرقہ پرست، رجعت پسند اور مذہبی جنونیوں نے گجرات میں آگ اور خون کا جو کھیل کھیلا تھا، اس سے تمام انسانیت اب تک شرمسار ہے۔

کیفی اعظمی کے فلمی نغموں کا انداز بھی جداگانہ ہے اور آج بھی ان کے فلمی نغمے دل کے تاروں کو اسی رفتار سے چھیڑ دیتے ہیں، جیسے اس وقت میں چھیڑتے تھے جب انہوں نے فلم ''حقیقت'' کا یہ نغمہ لکھا تھا......

ہو کے مجبور مجھے اس نے بلایا ہوگا

وطن پرستی پر اُن کا اسی فلم کا دوسرا نغمہ...... ''کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو'' آج بھی ہندوستان کے لاکھوں سپاہیوں کے خون کو گرما دیتا ہے۔ اس کے علاوہ فلم ''پاکیزہ، رضیہ سلطان، کہرا، ہنستے زخم'' اور ''ارتھ'' کے گیتوں کے لئے کیفی اعظمی کو ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

یوں تو کیفی اعظمی نے تقریباً دو سو فلموں کے لئے نغمہ نگاری کی اور اس کے علاوہ

بہت سی معیاری غزلیں اور نظمیں کہیں، مگر میرا خیال ہے کہ کیفی اعظمی نے اپنی پوری زندگی میں کچھ بھی نہ کیا ہوتا، تب بھی ان کا یہ ایک ہی شعر ان کو ہمیشہ یاد رکھنے کے لیے کافی تھا......

دل کی نازک رگیں ٹوٹتی ہیں
یاد اتنا بھی کوئی نہ آئے

۱۰رمئی ۲۰۰۲ء بروز جمعہ کی صبح ابھی طلوع ہی ہوئی تھی کہ جسلوک اسپتال، بمبئی میں ۷ر بجے کیفی اعظمی نے داعی اجل کو لبیک کہا اور بہترین تخلیقی ذہن رکھنے والا یہ فنکار اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔

○○

شمشاد بیگم

کہاوت عام ہے کہ 'نظروں سے اوجھل، دل سے اوجھل'۔ فلم والوں پر تو یہ کہاوت صد فیصد صادق آتی ہے۔ یہاں کسی فنکار کے جیتے جی تو اس کی تحسین وستائش کے جھنڈے گاڑے جاتے ہیں، اس کے مرتے ہی لوگ اسے بھول جاتے ہیں اور فلمی دنیا سے ترک تعلقات کے بعد بھی لوگ اسے جیتے جی مار ڈالتے ہیں۔ ایسے بھول جاتے ہیں جیسے اس کا کبھی کوئی وجود ہی نہ تھا۔ شمشاد بیگم بھی ایک ایسی ہی ہستی کا نام ہے۔ پانچویں دہائی سے لے کر ساتویں دہائی تک اس گلوکارہ کا طوطی بولتا تھا۔ صبح وشام ریڈیو پر، ریستورانوں میں، گلی کوچوں میں، بازاروں میں بس ایک ہی آواز سنائی دیتی تھی...... شمشاد بیگم کی آواز۔ جس کی پُرکشش آواز کو سن کر چلتے ہوئے قدم رک جاتے تھے، دلوں کی دھڑکن بڑھ جاتی تھی۔

شمشاد بیگم نے آخری گانہ فلم ''قسمت'' کے لئے میوزک ڈائیریکٹر او۔ پی۔ نیر کے ترتیب دئے ہوئے سروں پر لتا منگیشکر کے ساتھ گایا تھا۔ یہ ۱۹۶۸ء کی بات ہے۔ شمشاد بیگم اس وقت پلے بیک نغموں کے نقشے پر اُبھری جب دو گلوکاراؤں، نور جہاں اور ثریا کا بول بالا تھا۔ شمشاد بیگم نے اپنے موسیقی ریز کیریئر کا آغاز لاہور میں پنجابی فلموں سے کیا۔ ان دنوں نور جہاں اور ثریا کی وجہ سے دوسرے پلے بیک سنگرز کا کیریئر ڈانواڈول رہتا تھا۔ اس لئے شمشاد بیگم کو اپنا کیریئر بنانے میں کافی جد وجہد کرنا پڑی۔ جس میں وہ کامیاب رہی، اور نور جہاں (تقسیم ہند سے قبل) اور ثریا کو (تقسیم ہند کے بعد) شمشاد بیگم کے وجہ سے خاصہ نقصان پہنچا۔

اگر چہ شمشاد بیگم نے اپنے کیریئر کا آغاز پنجابی فلموں سے کیا لیکن بعد میں وہ ہندی فلموں میں گانے لگیں۔ ''انمول گھڑی'' میں شمشاد بیگم نے زہرہ انبالہ والی کے ساتھ ایک ڈوئیٹ گایا...... ''اُڑن کھٹولے پر اُڑ جاؤں، تیرے ہاتھ نہ آؤں''، اور فلم ''شاہجہاں'' میں یہ گیت......'جب اس نے گیسو بکھرائے، ساون آیا جھوم کے'، گا کر موسیقی کے شیدائیوں کے دلوں میں اپنا مقام بنالیا تھا۔

میوزک ڈائیریکٹر نوشاد علی مکمل طور پر شمشاد بیگم پر بھروسہ کرتے تھے، لیکن بعد میں انہوں نے بھی لتا اور آشا کے مقابلے میں شمشاد بیگم کو نظر انداز کر دیا۔ حالانکہ نوشاد نے آشا بھونسلے کے بہت کم گانے لئے، لیکن نوشاد کیمپ سے شمشاد بیگم کو نکالنے میں لتا منگیشکر کامیاب رہی۔ شمشاد نے ''انداز'' میں گانے گائے، تب تک لتا منگیشکر شمشاد پر فوقیت حاصل کر چکی تھی۔ ''میلہ، بابل (اس فلم میں ''چھوڑ بابل کا گھر'' آج بھی شمشاد بیگم کا ماسٹر پیس گانا خیال کیا جاتا ہے۔) درد، انوکھی ادا، چاندنی رات'' وغیرہ، ''مدر انڈیا'' کا ہولی گیت، نیز ''آن'' اور ''کوہ نور'' کے نغمے آج بھی گیت اور سنگیت کے شیدائیوں کے کانوں میں رس گھولتے ہیں۔ لیکن ''میلہ'' واحد فلم ہے، جس میں تمام سولو اور ڈوئیٹ گانے (مکیش کے ساتھ) شمشاد بیگم نے گائے تھے۔ شاید ''مغل اعظم'' آخری فلم تھی جس میں شمشاد بیگم نے نوشاد علی کی ترتیب دی ہوئی موسیقی میں گانے گائے۔ اس فلم میں شمشاد بیگم نے لتا منگیشکر کے ساتھ ایک قوالی گائی تھی۔ اس کے بعد نوشاد علی نے شمشاد بیگم کو کوئی چانس نہیں دیا۔

اگر نوشاد کے بعد کوئی اور میوزک ڈائیریکٹر تھا، جس نے شمشاد بیگم کی آواز کا پورا پورا فائدہ اُٹھایا تھا تو وہ تھے او۔ پی۔ نیّر۔ ''آر پار'' سے لے کر اس وقت تک جبکہ او۔ پی۔ نیر نے آشا بھونسلے کو اپنا لیا، شمشاد بیگم نے ان کی ہر فلم میں گانے گائے...... ''مسٹر اینڈ مسز ۵۵'' سے لے کر ''سی۔ آئی۔ ڈی۔'' اور پھر ''نیا انداز'' تک، شمشاد بیگم نے ان کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر ہٹ نغمے دئے۔ اُن دنوں ہر پانچویں فلم میں او۔ پی۔ نیّر کا میوزک ہوتا تھا اور ان تمام فلموں میں پلے بیک نغمے شمشاد بیگم کے ہوتے

تھے۔ بعد میں وہ او۔ پی۔ نیر کی پسندیدہ سنگر بن گئیں۔

یہ شاید او۔ پی۔ نیر کا فیصلہ تھا (یا ہو سکتا ہے لتا نے ہی او۔ پی۔ نیر کے تحت گانے سے انکار کر دیا ہو) کہ انہوں نے لتا کے بعد دوسری اچھی گلوکارہ شمشاد بیگم کو اپنانا بہتر سمجھا تھا، لیکن جب نیر صاحب کو یہ احساس ہو گیا کہ اُن کے سُر اور سنگیت کے لئے آشا بھونسلے کی آواز زیادہ مناسب ہے، تو انہوں نے بھی شمشاد بیگم سے تعلقات منقطع کر لئے اور شمشاد بیگم کا او۔ پی۔ نیر کیمپ سے کوئی تعلق نہ رہا۔

ایس۔ ڈی۔ برمن نے شمشاد بیگم کو صرف فلم ''بہار'' میں لیا۔ اس فلم میں شمشاد بیگم نے وجینتی مالا کے سبھی گیت گائے تھے۔ اس کے بعد ۱۹۵۱ء میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کی فلم ''شبنم'' آئی۔ اس کے بعد ایس۔ ڈی۔ برمن نے بھی شمشاد بیگم کو چانس دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

غلام محمد نے شمشاد بیگم کو ''گرہستی، پردیس'' وغیرہ فلموں میں لیا، لیکن خود غلام محمد کے پاس کام بہت کم تھا۔ اس لئے وہ شمشاد بیگم کے لئے کچھ زیادہ نہ کر سکے۔

سی۔ رام چندر نے بھی گاہے گاہے شمشاد بیگم کو مواقع دیئے لیکن صرف کامیڈی نغموں کے لئے، جن میں ''شہنائی، پتنگا، اور سرگرم'' خاص طور سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بھی دوسرے میوزک ڈائیریکٹروں کی طرح لتا اور آشا کو اپنا لیا۔

موسیقار روی اور مدن موہن نے شمشاد بیگم کو ڈوئیٹ، کورس اور قوالیوں میں لیا تھا۔ بہت سے لوگ ناشاؔد کی دھن پر گایا ہوا نغمہ ''بڑی مشکل سے دل کی بے قراری کو قرار آیا'' شمشاد بیگم کا بہترین گانا خیال کرتے ہیں۔ خیال ہے کہ اگر ناشاؔد ہجرت کر کے پاکستان نہ چلے جاتے تو شمشاد بیگم کی آواز سے مزید فائدہ اُٹھاتے۔

شمشاد بیگم نے ہنس راج بہل اور سرول کواتڑہ کی دھنوں پر چند ایک پنجابی فلموں میں بھی گیت گائے، جن میں ''پوستی، کوڈے شاہ، اور مداری'' کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔

فلموں سے شمشاد بیگم کی وابستگی ساتویں دہائی کے وسط میں ختم ہو گئی۔ اس کے

بعد اس نامور گلوکارہ کے بارے میں کچھ نہ سنا گیا۔ حالانکہ اس کے ساتھ کے میوزک ڈائیریکٹر، روی، نوشاد وغیرہ بعد میں فلمی دنیا میں سرگرم رہے اور میوزک دیتے رہے۔

شہرت اور پبلسٹی کے ذرائع، مثلاً اخبارات ورسائل، ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بھی شمشاد بیگم کو بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔ برسوں بھی شمشاد بیگم کا کوئی انٹرویو وغیرہ یا اس کے بارے میں کہیں کوئی مضمون نہیں چھپا ہے۔ محمد رفیع کی ''یادیں'' اور ''شامیں'' تو منائی جاتی رہی ہیں، لیکن محمد رفیع کی ہمعصر گلوکارہ کو جیتے جی مار ڈالا گیا۔ اپنے وقت کی مصروف ترین پلے بیک سنگر، تمام برصغیر میں جس کی سحر آفریں، دل پذیر آواز گونجتی تھی، اس کو بالکل خاموش کر دیا گیا۔ یہاں تک کہ ریڈیو اور دوردرشن تک نے شمشاد بیگم کو نظر انداز کیا۔

مشہور سپانسرڈ پروگرام ''مورٹل مین اِم مورٹل میموریز'' سے شمشاد بیگم کا غائب رہنا ہی اپنے طور پر ایک ٹریجڈی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ شمشاد کو مدعو ہی نہیں کیا گیا تھا۔ (عین ممکن ہے کہ شمشاد نے خود ہی منع کر دیا ہو۔) حالانکہ شمشاد کی ہمعصر سنگر راج کماری اور نرملا دیوی نے اس پروگرام میں حصّہ لیا تھا۔

یہی نہیں، ہز ماسٹرس وائس نے شمشاد بیگم کو وہ عزت نہیں بخشی جس کی یہ عظیم گلوکارہ حقدار تھی۔ آج بازار میں شمشاد بیگم کے نغموں کے ریکارڈ اور کیسٹ ڈھونڈنے سے نہیں ملتے۔ جبکہ ان کی کافی مانگ موجود ہے۔ شمشاد بیگم نے فلمی موسیقی کے انداز میں اور رجحان کو بدلنے میں جو تعاون دیا ہے، اسے فراموش نہیں کیا جا سکتا۔ شمشاد بیگم کا دَور ایک عہد کی عکاسی کرتا ہے۔ فلمی موسیقی کی تاریخ لکھتے وقت شمشاد بیگم کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن آج اس فلم انڈسٹری نے جس کے لئے شمشاد بیگم جیسی سحر طراز گلوکارہ نے اپنی زندگی کے قیمتی و نایاب برس وقف کر دئے تھے، اُسے بالکل فراموش کر دیا ہے۔

OO
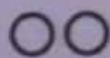
کلیان جی آنند جی

۲۰۱۳ء میں ہندوستان سنیما کے سو سال مکمل ہو چکے ہیں۔ ۳ر مئی ۱۹۱۳ء کو جب دادا صاحب پھالکے نے مکمل طور پر ہندوستان میں بنائی گئی پہلی فیچر فلم نمائش کے لیے بمبئی کے کارونیشن تھیئٹر میں پیش کی تو ہمارے سماج میں ایک بڑے انقلاب نے دستک دی۔ اب سو برس مکمل ہونے پر ہم اس انقلاب کو بخوبی محسوس کر سکتے ہیں۔ آج ہندوستان میں دُنیا بھر سے زیادہ فلمیں بنتی ہیں اور ہندوستان غیر ملکی فلموں کا بھی ایک بڑا بازار ثابت ہو رہا ہے۔

ہندوستانی سنیما کی دُنیا میں دوسرا بڑا انقلاب اُس وقت آیا جب ۱۹۳۱ء میں ہندوستانی سنیما کو بولنا آ گیا، اور فلمساز و ہدایتکار آرڈیشر ایرانی نے ہندوستان کی پہلی متکلم فیچر فلم ''عالم آراء'' نمائش کے لئے پیش کی۔ آواز کو سلولائیڈ پر منتقل کرنے کا تجربہ کامیاب ہو چکا تھا اور اب ہندوستانی فلموں میں نہ صرف کرداروں کی آوازوں کو فلمی شائقین تک پہنچانے کا عمل شروع ہو چکا تھا بلکہ عوام کی دلچسپی بڑھانے اور فلم کی طرف زیادہ سے زیادہ توجہ مبذول کرانے کے لیے بیک گراؤنڈ موسیقی کا سہارا بھی لیا جانے لگا اور مختلف قسموں کی آوازوں کو منظر کے مطابق استعمال کر کے اس کو زیادہ پُر اثر بنانے کا کام بھی شروع ہو گیا۔

اس کے ساتھ ہی ہندوستانی مزاج کے مطابق موسیقی کے ساتھ شاعری کو شامل کر کے فلمی نغمہ نگاری کا رواج بھی زور پکڑتا چلا گیا۔ ایک وقت ایسا بھی آیا کہ کسی کسی فلم میں نو دس گانوں سے لے کر چودہ پندرہ گانے تک ہوا کرتے تھے،

جو کبھی کبھی فلم کی کامیابی کی ضمانت بھی بن جایا کرتے تھے۔ فلم ''رتن'' میں نوشاد علی کی موسیقی سے ترتیب دیے ہوئے گانے تھے جن کی وجہ سے یہ فلم خوب چلی اور فلمساز کو بہت بڑا مالی فائدہ ہوا۔

گزشتہ صدی کی چھٹی، ساتویں اور آٹھویں دہائی کے لگ بھگ آخری دَور تک ہماری فلموں میں بہترین نغمے لکھے گئے اور بے مثال موسیقی ترتیب دی گئی۔ یہی وجہ ہے کہ لگ بھگ تیس برس پر محیط اِس عرصے کو فلمی دُنیا کا سنہرا دَور کہا جاتا ہے۔ فلمی موسیقی کے اس سنہری دَور میں ایک سے بڑھ کر ایک بہترین موسیقار ہوئے ہیں۔ حسن لال بھگت رام، نوشاد علی، غلام محمد، کھیم چند پرکاش، سلیل چودھری، روی، روشن، سی۔ رام چندر، ایس۔ ڈی۔ برمن، او۔ پی نیر، انل بسواس، پنکج ملک، لکشمی کانت پیارے لال، شنکر جے کشن اور خیام جیسے موسیقاروں نے ہر لحاظ سے بہترین اور مقبول دھنوں سے ہماری فلموں کو سجایا ہے۔ ایسے ہی بہترین موسیقاروں میں ایک مقبول ترین موسیقار جوڑی کلیان جی آنند جی کی بھی رہی ہے۔ جس طرح ہمارے سماج میں ''ایک جان دو قالب'' کا محاورہ مشہور ہے، ٹھیک اُسی طرح یہ دو بھائیوں کی ایک ٹیم تھی جو ایک ہی نام سے مشہور تھی۔ کلیان جی آنند جی نے اس وقت میں اپنے آپ کو ثابت کر کے دکھایا جب فلمی دنیا میں کئی بہترین اور مقبول موسیقار موجود تھے۔

۱۹۵۴ء میں ہیمنت کمار کی موسیقی والی فلم ''ناگن'' بن رہی تھی۔ بھارت بھوشن اور مدھو بالا پر فلمائے جانے والے ایک گانے کے لیے کلیان جی نے ہیمنت کمار کی ہدایت میں کلے وائیلن پر بین بجائی تھی۔ یہیں سے کلیان جی وِیر جی شاہ کی پہچان بنی اور ان کی بجائی یہ بین آج ساٹھ برس بعد بھی اتنی ہی مقبول ہے۔ یہ گانا لتا منگیشکر کی آواز میں ریکارڈ ہوا تھا...... ''تن ڈولے میرا من ڈولے'' گانے پر بجائی گئی بین آج بھی میل کا پتھر بنی ہوئی ہے۔ حالانکہ اس سے قبل ۱۹۵۳ء کلیان جی نے فلم ''ناگ پنچمی'' کے موسیقار چتر گپت کی ہدایت میں الیکٹرانک ساز پر بین بجائی تھی

مگر اُس کا خاص نوٹس نہیں لیا گیا تھا۔

۱۹۵۸ء میں فلمساز سبھاش ڈیسائی نے فلم ''سمراٹ چندر گپت'' کے لیے کلیان جی ویر جی شاہ کو مکمل طور پر فلم کی موسیقی ترتیب دینے کے لیے ذمہ داری سونپ دی۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد کلیان جی نے اپنے بھائی آنند جی کو ساتھ میں شامل کر کے کلیان جی آنند جی کے نام سے موسیقار جوڑی بنائی اور کامیابی کے راستے پر آگے بڑھتے چلے گئے۔

کلیان جی اور آنند جی صوبہ گجرات کے 'کچھ' کے رہنے والے ایک کاروباری شخص ویر جی شاہ کے بیٹے تھے۔ ویر جی شاہ نے اپنا کاروبار کچھ سے بمبئ منتقل کر لیا تھا اور اپنی فیملی کے ساتھ یہ دونوں بھائی بھی بمبئ آ گئے تھے۔ کلیان جی کو بچپن سے ہی موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ لہٰذا انہوں نے ایک ٹیچر سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا شروع کر دی اور ایک خاص الیکٹرانک ساز کلے وائلن بجانے میں مہارت حاصل کر لی۔

کلیان جی نے اپنے بھائی آنند جی کے ساتھ ایک میوزیکل آرکیسٹرا بنایا اور بمبئ اور اس کے اطراف میں کئی میوزیکل شوز کیے جو بہت مقبول ہوئے۔ فلم ''سمراٹ چندگپت'' کا نغمہ...... ''چاہے رہو دُور، چاہے رہو پاس'' بہت مقبول ہوا، جو محمد رفیع اور لتا منگیشکر کی آوازوں میں تھا اور بھارت بھوشن اور نروپا رائے پر فلمایا گیا تھا۔

کلیان جی آنند جی نے تقریباً دو سو پچاس سے زائد فلموں کے لیے موسیقی ترتیب دی جن میں سے ۱۷رفلموں نے گولڈن اور ۳۹رفلموں نے سلور جوبلی منائی۔ کلیان جی آنند جی کی کامیابی میں ان کی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اپنے کام سے ایمانداری، لگن اور محنت کو زیادہ دخل رہا ہے۔ انہوں نے اخلاقی قدروں کی ہمیشہ دل سے عزت کی اور بہت سے سماجی، فلاحی کاموں میں پیش پیش رہے۔ کلیان جی آنند جی نے ہمیشہ نئے نئے لوگوں کو سراہا اور ان کی ہر طرح سے مدد کی۔ منہر اُدھاس، کمار

شانو، الکا یاگنک، سادھنا سرگم، سپنا مکرجی، اُدت نارائن، سُندھی چوہان جیسے آج کے کئی مقبول گلوکاروں کو متعارف کرانے میں کلیان جی آنند جی نے پہل کی۔ اسی طرح قمر جلال آبادی، آنند بخشی، گلشن باورا، انجان، ورما ملک اور ایم۔ جی۔ حشمت جیسے فلمی نغمہ نگاروں کو کلیان جی آنند جی نے ہمیشہ سراہا اور بھرپور مدد کی۔

کلیان جی آنند جی کی موسیقی کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ انہوں نے کلاسیکل موسیقی کی بنیاد پر آسان اور میلوڈی سے بھرپور نئی نئی مدھر طرزیں ہندوستانی سنیما کو دیں۔ نہ وہ کبھی فلم انڈسٹری کی سیاست میں پڑے اور نہ انہوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے سستے ہتھکنڈے استعمال کیے۔ کلیان جی آنند جی کے کامیاب فلمی نغموں کی ایک طویل فہرست ہے جو اُن کی فنکارانہ صلاحیتوں کا جیتا جاگتا ثبوت ہے۔ ۱۹۶۰ء میں آئی اُن کی موسیقی سے بجی فلم ''چھلیا'' کے کئی گانے بے حد مقبول ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں فلم ''جی چاہتا ہے'' کا نغمہ ''ہم چھوڑ چلے ہیں محفل کو'' بے حد مقبول ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۶۵ء میں ''جوہر محمود اِن گوا، ہمالیہ کی گود میں، پورنیما'' اور سب سے زیادہ فلم ''جب جب پھول کھلے'' کے کئی نغمے بے حد مقبول ہوئے۔ ۱۹۶۵ء کے بعد تو کلیان جی آنند جی کی شہرت اور مقبول کا گراف اونچا ہوتا ہی چلا گیا۔ ۱۹۶۷ء میں فلم ''اُپکار'' کے نغمے اور فلم ''راز'' کا گانا ''اکیلے ہیں چلے آؤ کہاں ہو'' بہت مقبول ہوا۔ ۱۹۶۸ء میں فلم ''سہاگ رات، حسینہ مان جائے گی'' اور ''سرسوتی چندر'' کے گانے اتنے مقبول ہوئے کہ اب بھی یاد کیے جاتے ہیں۔

۱۹۷۰ء میں ''پورب اور پچھم، ہولی آئی رے، سچا جھوٹا، جانی میرا نام'' اور فلم ''گیت'' کے نغمے کافی مقبول رہے۔ اسی طرح ۱۹۷۲ء میں فلم ''وکٹوریہ نمبر ۲۰۳، گھر گھر کی کہانی'' اور فلم ''گوپی'' کے گانوں نے کافی دھوم مچائی۔ ۱۹۷۲ء میں فیروز خان کی فلم ''اپرادھ'' کے کئی گانے مشہور ہوئے اور ۱۹۷۳ء میں فلم ''بلیک میل، کہانی قسمت کی، سمجھوتا'' اور ''زنجیر'' فلم کے گانے مقبول ہوئے۔ اسی برس فلم ''کورا کاغذ'' آئی اور اس فلم کی موسیقی کے لیے کلیان جی آنند جی کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

اسی فلم کا ایک نغمہ ''میرا جیون کورا کاغذ کورا ہی رہ گیا'' ۱۹۷۴ء میں ریڈیو سے نشر ہونے والے ''بنا کا گیت مالا'' پروگرام میں ٹاپ پر رہا۔

۱۹۷۴ اور ۱۹۷۵ء میں کلیان جی آنند جی کی موسیقی سے سجی کئی فلمیں کامیاب ہوئیں۔ ان میں ''ہاتھ کی صفائی، رفو چکر'' اور ''دھرماتما'' جیسی فلمیں خاص طور پر یادگار فلمیں ہیں۔ اگلے برس ۱۹۷۶ء میں فلم ''بیراگ'' کے گانے کافی مقبول ہوئے۔ امیتابھ بچن کی کئی فلموں کے نغمے کلیان جی آنند جی کی موسیقی سے سجے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۸ء میں فلم ''ڈان، لاوارث'' اور ''مقدر کا سکندر'' بے حد مقبول ہوئے اور اس کے بعد ''قربانی، پروفیسر پیارے لال، حادثہ، ارادہ'' اور ''تری دیو'' جیسی کئی فلموں کی موسیقی کو عوام و خواص نے بے حد پسند کیا اور ان فلموں کے نغمے کافی مقبول ہوئے۔ ۱۹۸۵ء کے بعد فلمی نغموں کا معیار لگاتار گرتا رہا اور فلموں کا مزاج بھی بدلتا رہا۔ لہٰذا کلیان جی آنند جی اس گراوٹ سے کافی بددِل ہوئے اور انہوں نے اپنی توجہ نئی نسل کو موسیقی کی تعلیم دینے اور کچھ اپنی البم وغیرہ تیار کرنے میں لگا دی۔ لہٰذا فلموں سے ان کا واسطہ کم ہوتا چلا گیا۔

۱۹۶۵ء میں فلم ''ہمالیہ کی گود میں'' کے لیے کلیان جی آنند جی کو بسٹ میوزک ڈائریکٹر ایورڈ سے نوازا گیا اور ۱۹۶۸ء میں فلم ''سرسوتی چندر'' کی بہترین موسیقی اور نغموں کے لیے انہیں پہلا نیشنل ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں کلیان جی آنند جی کو پدم شری ایوارڈ سے حکومت ہند نے نوازا۔

عام طور پر دیکھا گیا ہے کہ ہر فلمساز یا ہدایتکار کا اپنا پسندیدہ موسیقار ہوتا ہے۔ کلیان جی آنند جی کے حصے میں جو ہدایتکار آئے اُن میں وجے بھٹ، من موہن ڈیسائی، سبھاش گھئی، پرکاش مہرہ، منوج کمار، گووند سیریا، فیروز خان اور چندر باروٹ جیسے لوگ تھے۔ خاص بات یہ ہے کہ کئی کامیاب ہدایتکاروں کی پہلی فلم کے موسیقار کلیان جی آنند جی ہی تھے۔ جیسے من موہن ڈیسائی کی فلم ''چھلیا'' (۱۹۶۰ء)، منوج کمار کی فلم ''اُپکار'' (۱۹۶۷ء)، پرکاش مہرہ کی فلم ''حسینہ مان جائے گی''

(۱۹٦۸ء)، نریندر بیدی کی فلم ''بندھن'' (۱۹٦۹ء)، ارجن ہنگورانی کی فلم ''دل بھی تیرا ہم بھی تیرے'' (۱۹٦۰ء)، فیروز خان کی فلم ''اپرادھ'' (۱۹۷۲ء)، انل گانگولی کی ''کورا کاغذ'' (۱۹۷۴ء)، گووند سیریا کی ''سرسوتی چندر'' (۱۹٦۸ء)، سبھاش گھئی کی ''کالی چرن'' (۱۹۷٦ء)، آئی۔ ایس۔ جوہر کی ''جوہر محمود اِن گوا'' (۱۹٦۵ء)، چندر باروٹ کی ''ڈان'' (۱۹۷۸ء)، راجیو رائے کی فلم ''یدھ'' (۱۹۸۵ء) اور ہمی گریوال کی فلم ''رُخصت'' (۱۹۸۸ء) وغیرہ۔

○○

مخدومؔ محی الدین

ہندوستانی اُردو ہندی سنیما میں ابتدائی دور سے ہی نغمہ نگاری کی بڑی اہمیت رہی ہے۔ جس طرح فلم کی کہانی، منظرنامہ اور مکالمے لکھنے کے لئے اچھے نثرنگار ادیبوں اور کہانی کاروں کی ضرورت ہمیشہ سے فلمی دنیا میں رہی ہے، اُسی طرح باصلاحیت اور اچھے فلمی نغمہ نگاروں، گیت کاروں کی بھی فلمی دُنیا کو ضرورت پڑتی رہی ہے۔ یہ بات الگ ہے کہ بہت سے کامیاب ادبی شاعر فلمی دنیا میں جا کر ناکام ہو گئے یا پھر جلدی ہی گھبرا کر گھر واپس آ گئے۔ دُوسری طرف کئی ایسے نغمہ نگار بھی ہیں جن کی ادب میں کبھی کوئی شناخت قائم نہ ہو سکی مگر وہ فلمی دنیا میں بہت کامیاب رہے اور ان کے نغموں سے فلموں کو کامیاب ہونے میں بھی مدد ملی۔

دراصل فلمی نغمہ نگاری ادبی شاعری سے تھوڑا مختلف قسم کا کام ہے۔ اگر ہم اِسے تکنیکی کام کہیں تو بے جا نہ ہوگا۔ جس طرح ایک کہانی لکھنا یا افسانہ تحریر کرنا بالکل ایک الگ بات ہے اور اُسی کو فلمی منظرنامہ بنا کر لکھنا بالکل مختلف قسم کی تکنیکی مہارت کی بات ہوتی ہے۔

ہمارے اردو ادب کے کئی شاعر اسی لئے فلمی دنیا میں کامیاب نہ ہو سکے یا گھبرا کر جلدی واپس ہو گئے کیونکہ وہاں کے طور طریقے اور چلن کچھ نرالے ہی ہیں۔ سب سے پہلے تو آپ موسیقار کی دُھن سے بندھے ہوئے ہیں۔ اُس نے جو میٹر بنا دیے ہیں، اسی میں رہ کر اب آپ کو فلم کی سچویشن کے مطابق الفاظ اُس دھن میں بٹھانے ہیں۔ یعنی آپ سچویشن کے بھی پابند ہو گئے۔ اب آپ کو یہ بھی دیکھنا ہے کہ گانا

کہاں پر فلمبند ہوگا۔ یعنی گانے کے سین کی لوکیشن کیا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھتے ہوئے الفاظ کا استعمال کرنا ہے اور پھر اس بات کا خیال بھی رکھنا ہے کہ فلم کے پردے پر کون کون سے کردار آپ کے لکھے نغمے کو گائیں گے۔ ایک خاص بات یہ بھی ذہن میں رکھنی ہے کہ آسان الفاظ کا استعمال کرنا ہے تا کہ فلم بینوں کا ہر طبقہ فوری طور پر آپ کے نغمہ کو سمجھ لے اور لطف اندوز ہو سکے۔ تبھی تو آپ کا نغمہ مقبول ہوگا۔

ایسے چند شاعروں میں جو فلمی دنیا میں زیادہ عرصے تک نہ ٹکے رہ سکے یا وہاں کے ماحول اور طور طریقوں کو نہ اپنا سکے، جوشؔ ملیح آبادی کا نام سرفہرست ہے۔ اسی طرح جگرؔ مرادآبادی کے بڑے چہیتے شاگرد خمارؔ بارہ بنکوی بھی تادیر فلمی دنیا میں نہیں ٹک پائے۔ جبکہ شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری اور ساحرؔ لدھیانوی نے کامیابی اور شہرت، سب کچھ حاصل کیا۔ اسی طرح جلد واپس ہونے والوں میں ایک بڑا خوبصورت سا نام مخدومؔ محی الدین کا بھی رہا ہے۔

مخدومؔ محی الدین کا پورا نام ابوسعید محمد مخدوم محی الدین حذری تھا۔ وہ ۴رفروری ۱۹۰۸ء بروز پیر کو اندول ضلع میدک میں پیدا ہوئے، جہاں اُن کے والد ملازم تھے۔ یوں اُن کا آبائی وطن منمول تھا اور خاندان کے بزرگ مخدوم کو بچپن میں "بابا" کہہ کر پکارتے تھے۔ ان کے بچپن میں ہی، جب وہ محض سوا پانچ برس کے تھے، ان کے والد محمد غوث محی الدین کا انتقال تیس برس کی عمر میں ہو گیا۔ بعد میں مخدومؔ کی پرورش ان کے چچا محمد بشیر الدین نے کی جو اندول کی تحصیل میں بحیثیت اہلکار ملازم تھے۔ مخدومؔ کے بچپن میں ہی ان کی والدہ نے دوسری شادی کر لی مگر اس بات کو مخدومؔ سے پوشیدہ رکھا گیا۔ کافی عرصہ کے بعد مخدومؔ کو کسی طرح پتہ چلا کہ ان کی ماں زندہ ہیں اور ان کی ایک بہن بھی ہے۔ بعد میں ان کی والدہ ان ہی کے ساتھ رہنے لگی تھیں اور مخدومؔ کے گھر میں ہی ان کا انتقال بھی ہوا۔

مخدومؔ محی الدین کی شادی ۲۲راگست ۱۹۳۳ء کو ان کے ایک دوسرے چچا سمیع الدین کی دختر رابعہ بیگم سے ہوئی۔ مخدومؔ نے اپنی تمام تر گھریلو مشکلات اور خود کی

شرارتوں کے باوجود ۱۹۳۴ء میں جامعہ عثمانیہ، حیدر آباد سے بی۔اے کا امتحان درجہ دوئم میں پاس کیا اور وہیں سے ۱۹۳۶ء میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ میں ڈاکٹر عبدالحق جیسی شخصیت سے ان کا واسطہ رہا اور سکندر علی وجؔد اور جلال الدین اشکؔ جیسے شعراء مخدوم کے ہمعصر تھے۔ مخدوؔم خود بھی جامعہ عثمانیہ میں بحیثیت شاعر خاصے مقبول تھے۔

۱۹۳۳ء میں مخدوؔم نے اپنی طالب علمی کے زمانے میں ہی پہلی نظم ''پیلا دوشالہ'' کہی تھی، جو قوالی کی طرز پر کالج کے ہوسٹل میں بڑی مقبول تھی اور ان کے ساتھی طلباء اکثر دہرایا کرتے تھے۔ مخدوؔم کی بے حد مقبول غزل ''پھر چھڑی رات بات پھولوں کی......'' کا بھی ایک دلچسپ واقعہ ہے۔ ۱۹۶۰ء کی بات ہے۔ شکیلہ بانو بھوپالی کسی پروگرام کے سلسلہ میں حیدر آباد آئی ہوئی تھیں اور وہ مخدوؔم اور ان کے دوست شاہد صدیقی سے کافی بے تکلف تھیں۔ تینوں دوستوں میں یہ بات طے ہوئی کہ اب جو بھی بات ہم تینوں میں ہوگی وہ منظوم ہوگی۔ رات کو کھانے کے بعد شاعری کا دور چلا اور شکیلہ بانو کو خوب ہار پہنائے گئے جو اُن کے سامنے رکھے ہوئے تھے اور وہ بے خیالی میں پتّی پتّی اُن کو بکھیر رہی تھیں۔ جس کی وجہ سے ان کے سامنے پتّیوں کی چادر سی بچھ گئی تھی۔ شاہد صدیقی نے آہستہ سے کہا...... ''کیا بچھا دی بساط پھولوں کی......''۔ شکیلہ نے جواب دیا...... ''بے مروت ہے ذات پھولوں کی......''

مخدوؔم نے دونوں کو خاموش کرانے کی غرض سے کہا...... ''لوگ سنتے ہیں بات پھولوں کی......''

مشاعرہ ختم ہوا، اگلے دن پھولوں والی زمین پر مخدوؔم کی وہ مشہور زمانہ غزل تیار تھی، جو بعد میں فلم ''بازار'' میں فلمساز و ہدایتکار ساگر سرحدی نے استعمال کی۔

مخدوؔم نے طالب علمی کے زمانہ سے ہی تلاش روزگار شروع کر دی تھی۔ ابتداء میں اپنے دوست نورالہدیٰ کے ساتھ مل کر پینٹنگس فروخت کیں مگر یہ کاروبار اچھا نہ چلا تو فلمی اداکار اور اداکاراؤں کی تصویریں فروخت کرنے لگے۔ اخباروں کے دفتروں

میں کام کیا، ٹیوشن بھی پڑھائے۔ ۱۹۳۷ء میں ایم۔اے کرنے کے بعد دفتر دیوانی میں کلرکی بھی کی۔ ۱۹۳۹ء میں مخدوم سٹی کالج کے شعبہ اردو میں بحیثیت استاد مقرر ہوئے اور ۱۹۴۱ء میں یہ ملازمت بھی چھوڑ دی۔ ۱۹۴۰ء میں ہی مخدوم کمیونسٹ پارٹی کے سکریٹری منتخب ہوئے اور ان کی سیاسی مصروفیات بڑھنے لگیں۔ ۱۹۴۳ء میں مخدوم انگریزوں کے خلاف تقریر کرتے ہوئے گرفتار ہوئے اور تین ماہ سادہ سزا کے لئے جیل گئے۔ بعد میں مخدوم کو اسمبلی کا رُکن بھی چنا گیا۔

مخدوم محی الدین نے فلمی دنیا سے وابستگی کی کوئی کوشش نہیں کی تھی۔ ان کی نظمیں اور غزلیں کافی مقبول ہو چکی تھیں اور فلمسازوں و ہدایتکاروں کو اپنی طرف متوجہ کر رہی تھیں۔ فلمساز و ہدایتکار بمل رائے، جو اپنے ہمعصروں سے مختلف ذہن وفکر کے فلمساز تھے، انہوں نے مخدوم کی ایک نظم ''سپاہی'' کو اپنی فلم ''اُس نے کہا تھا'' میں بڑی موثر موسیقی کے ساتھ پیش کیا تھا۔ موسیقار سلیل چودھری نے مخدوم کے مصرعوں کی سبک خرامی کے مطابق بہت پُر اثر موسیقی ترتیب دی تھی۔

۱۹۵۸ء میں مشہور فلمساز و ہدایتکار گرودت اپنی فلم ''کاغذ کے پھول'' کے لئے مخدوم سے گیت لکھوانے کے خواہشمند تھے۔ مگر ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ مخدوم بمبئی میں رہ کر اس فلم کے گیت لکھیں اور مخدوم اپنی سیاسی سرگرمیوں کی وجہ سے حیدرآباد چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ لہٰذا بعد میں مخدوم کی ہی سفارش پر گرودت نے فلم ''کاغذ کے پھول'' کی نغمہ نگاری کی ذمہ داری کیفی اعظمی کے سپرد کی۔

مخدوم کی ایک اور نظم ''چارہ گر'' نے فلمی دنیا میں بڑی دُھوم مچائی تھی۔ اس نظم کا مکھڑا...... ''اک چمبیلی کے منڈوے تلے......'' بے حد مقبول ہوا۔ اس گانے کی دھن حیدرآباد کے ہی ایک میوزک ڈائریکٹر اقبال قریشی نے تیار کی تھی۔ اس نظم کو سب سے پہلے فائن آرٹ اکیڈمی کے گلوکاروں نے پیش کیا تھا۔ اقبال قریشی خود بھی فائن آرٹ اکیڈمی کے ممبر رہ چکے تھے۔ لہٰذا، انہوں نے اس نظم کو عوام کے سامنے کورس کی شکل میں پیش کیا۔

بعد میں دیو آنند، راج کھوسلہ، سنیل دت اور خواجہ احمد عباس نے بھی اس نظم کو پیش کرنا چاہا، مگر چندر شیکھر نے اپنی فلم "چاچا چا" میں اس نظم کو مکمل طور پر پیش کیا۔ حالانکہ یہ فلم ناکام ہو گئی مگر مخدوم کا لکھا نغمہ "اک چنبیلی کے منڈوے تلے......" پورے ہندوستان میں گونجنے لگا۔

مخدوم نے ۱۹۶۸ء میں فلم "برسات" سائن کی۔ اس فلم کی موسیقی مقبول موسیقار مدن موہن ترتیب دے رہے تھے۔ مخدوم کا ارادہ تھا کہ وہ مہینے میں دو تین بار ہوائی جہاز سے بمبئی جائیں گے اور کام مکمل کر دیں گے۔ ابھی وہ اس فلم کے دو گیت ہی لکھ پائے تھے کہ ان کا انتقال ہو گیا اور کچھ عرصہ بعد ہی مدن موہن بھی چل بسے۔ اس طرح یہ فلم ادھوری ہی رہ گئی اور کوئی ایک گیت بھی ریکارڈ نہ ہو سکا۔

مخدوم کا مزاج فلمی دنیا کے طور طریقوں کے موافق بالکل نہ تھا۔ نظم "سپاہی" اور "چارہ گر" کی موسیقی تیار کرنے میں موسیقار خود شاعر کا پابند تھا، مگر فلمی دنیا کے رواج کے مطابق شاعر کو ہی موسیقار کا پابند رہنا پڑتا ہے اور فلمی دنیا کی روایت کے مطابق پہلے موسیقار دھن تیار کر لیتا ہے جس پر بعد میں شاعر کو الفاظ بیٹھانے ہوتے ہیں۔ مخدوم کی پوری شاعری میں گیتوں کا عمل دخل نظر نہیں آتا۔ اس کے باوجود ان کی کئی نظمیں ایسی ہیں جن میں گیتوں کی نغمگی اُسی انداز کی ہے۔ مثال کے طور پر نظم "آزادیٔ وطن" اور نظم "مسافر" یا پھر "مستقبل، جنگِ آزادی، ستارے،" اور "ماسکو" جیسی نظمیں گیتوں کے انداز کی ہی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ فلم "برسات" کے دونوں گیت لکھنے میں مخدوم کو دشواری محسوس نہیں ہوئی اور وہ فلم کے لئے گیت لکھتے وقت بھی شعر اور شعریت کے تقاضوں کا دھیان رکھتے تھے۔

فلم "چاچا چا" اور "گمن" کے بعد فلم "بازار" میں موسیقار خیام نے مخدوم کی غزل "پھر چھڑی رات بات پھولوں کی......" کو بڑے ہی خوبصورت انداز میں پیش کیا۔ اس غزل کو لتا منگیشکر اور طلعت عزیز کی آوازوں میں ریکارڈ کرایا گیا۔ یہ فلم تو کامیاب ہوئی ہی مگر اس سے زیادہ مخدوم کی غزل فلمی شائقین کے دلوں پر چھا گئی۔ بعد

میں لتا منگیشکر کے ایک البم میں بھی اس غزل کو شامل کیا گیا۔

اسی طرح مخدومؔ کی ایک نظم ''انتظار'' کو بھی فلم میں استعمال کیا گیا۔ ''رات بھر دیدۂ نمناک میں لہراتے رہے...... '' کو فلمساز و ہدایتکار مہیش بھٹ کی بیٹی پوجا بھٹ نے اپنی فلم ''تمنا'' میں بڑے خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نظم کی فلمبندی بھی بہت خوبصورت انداز میں ہوئی ہے اور یہ فلم عوام میں بھی کافی مقبول ہوئی۔

اس طرح مخدومؔ کا جو بھی کلام فلموں میں استعمال ہوا وہ بے حد مقبول ہوا، اور آج بھی فلم بینوں کے کانوں میں گونجتا ہے۔ حالانکہ ایسے نغموں کی تعداد بے حد کم ہے۔ مخدومؔ کا ایک شعر، جو پوری دنیا میں مشہور ہوا، اور ہزاروں جگہ کوٹ کیا گیا، وہ تھا......

حیات لے کے چلو، کائنات لے کے چلو
چلو تو سارے زمانے کو ساتھ لے کے چلو

مخدومؔ کا پہلا شعری مجموعہ ۱۹۴۴ء میں ''سرخ سویرا'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ ''گل تر'' کے عنوان سے دوسرا مجموعہ ۱۹۶۱ء میں منظر عام پر آیا۔ ۱۹۶۶ء میں ''بساط رقص'' کے عنوان سے جشن مخدوم کے موقع پر مخدومؔ کمیٹی نے تیسرا مجموعہ شائع کرایا۔ حیدرآباد سے شائع ہونے والے رسالے ''صبا'' نے بھی مخدومؔ کی شخصیت اور ان کے فن پر ایک خصوصی شمارہ سلیمان اریب کی ادارت میں شائع کیا۔

۲۵ راگست کی صبح کو دہلی کے ارون اسپتال میں مخدومؔ نے آخری سانس لی اور اپنی طرز کا یہ بے مثال شاعر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ وہ سابق صدر جمہوریہ ہند جناب وی۔وی۔ گری کے صدر منتخب ہونے کی خوشی میں منعقد ایک مشاعرے میں شریک ہونے کے لئے دہلی آئے تھے۔ بعد میں ۲۶ راگست کو حیدرآباد کی درگاہ شاہ خاموش میں مخدومؔ کو سپرد خاک کیا گیا۔ ان کے چند فلمی نغمے آج بھی ہندوستان کی فضاؤں میں گونجتے ہیں۔

OO
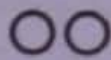
این۔ این۔ سپّی

ہندی سنیما کی تاریخ میں فلمساز این۔ این۔ پپی کا نام قابل قدر نگاہ سے دیکھا جائے گا۔ انہوں نے فلمسازی کے مختلف شعبوں میں اپنی قابلیت اور تجربے سے ہندی سنیما کو کئی خوبصورت فلمیں پیش کی ہیں۔ خود اُن کا کہنا تھا کہ اگر آپ فلم سازی سے متعلق ہر طرح کی جانکاری نہیں رکھتے ہیں تو پھر فلم انڈسٹری میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں ہے۔ آپ کوئی کامیاب فلم نہیں بنا سکتے۔ اس سے بہتر ہے کہ آپ کوئی دوسرا کام کریں جس کی آپ کو جانکاری ہو۔

این۔ این۔ پپی کا فلمسازی کا کیریئر ۱۹۵۹ء میں شروع ہوا۔ شروعاتی دس برسوں میں انہوں نے فلمسازی کی تکنیک جاننے کے لئے مختلف شعبوں میں کام کیا۔ انہوں نے ابتدائی دور میں پروڈکشن کا کام سیکھا۔ اس کے بعد کچھ برسوں تک فلم فائنانسر کے طور پر بھی کام کیا اور کچھ عرصہ تک وہ فلم ڈسٹری بیوٹر کے طور پر بھی کاروبار کرتے رہے۔

یہ سارے کام انہوں نے اپنے خاندانی کاروبار کے سلسلے میں انجام دیئے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ان کے والد تقسیم ہند سے قبل صوبہ سندھ میں فلموں کے تقسیم کار کے طور پر کام کرتے تھے۔ ہندوستان کی تقسیم ہوئی اور صوبہ سندھ کا کافی حصہ پاکستان میں شامل ہو گیا۔ تب این۔ این۔ پپی کا خاندان ہندوستان آ کر بمبئی میں آباد ہو گیا۔

بمبئی آ کر این۔ این۔ پپی نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کا فیصلہ کیا اور کالج سے گریجویشن کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد فلم انڈسٹری سے وابستہ ہو گئے۔ ان کا خیال تھا

کہ فلم انڈسٹری میں اچھی طرح کاروبار کرنے اور ایک کامیاب فلمساز بننے کے لئے کالج کی ڈگری ہونا ضروری ہے۔ اس طرح کاروبار کرنے اور لوگوں سے رابطہ قائم کرنے میں انسان کے اندر ایک خوداعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، خاص طور پر ایسے وقت میں جب ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں سماج میں ایک بکھراؤ کی سی کیفیت پیدا ہوگئی تھی۔

ایک فلمساز کے طور پر این۔ این۔ پی کی پہلی فلم ''قاتل'' تھی۔ یہ ایک فینٹاسی ڈرامہ جیسی فلم تھی، جس طرح رابن ہڈ کی فلمیں ہوا کرتی تھیں۔ اس پہلی فلم کے ذریعہ ایک نوجوان فلمساز کی کامیاب فلم کے طور پر این۔ این۔ پی کی صلاحیتیں سامنے آئیں۔ اس فلم سے ہی اداکار پریم ناتھ اور دل پھینک قسم کی اداکارہ کے طور پر فلم ایکٹریس چترا کی پہچان بنی۔ اس کے ساتھ ہی ہدایتکار کے بطور محمد حسین کو بھی انڈسٹری میں لوگ پہچاننے لگے۔ کیونکہ اس فلم کی ہدایتکاری کی ذمہ داری این۔ این۔ پی نے محمد حسین کے سپرد کی تھی۔ اسی فلم سے فلمساز کا نظریہ بھی قائم ہو گیا کہ وہ اپنے ہدایتکار سے فلم میں کیا چاہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ تفصیل سے اپنے ہدایتکار کو پوری جانکاری دیتے تھے کہ وہ فلم میں کیا دکھانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح کے تال میل سے ایک اچھی اور کامیاب فلم سامنے آتی ہے۔

فلم ''قاتل'' کے بعد این۔ این۔ پی نے دوبارہ اپنی اگلی فلم ''روپ لیکھا'' کی ہدایتکاری بھی محمد حسین کے سپرد کی۔ یہ فلم بھی ایک فینٹاسی قسم کی کہانی پر مبنی تھی اور اس کے مرکزی کردار میں اس زمانے کے ایکشن ہیرو مہی پال موجود تھے۔ یہ فلم کافی کامیاب ثابت ہوئی اور اس کی کامیابی کے ساتھ ہی یہ بات بھی ثابت ہو گئی کہ فلمساز این۔ این۔ پی ایک خیال کو کتنی کامیابی سے فلم کے مناظر میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ اس طرح فلم کی اسکرپٹ پر اُن کی مضبوط پکڑ اور گہری نظر کا بھی پتہ چلتا ہے۔

اس فلم کی کامیابی سے ہندوستانی فلم انڈسٹری کو فلموں کی کامیابی کا ایک نسخہ بھی ہاتھ لگ گیا۔ اس کے بعد این۔ این۔ پی کی لگاتار ایک کے بعد ایک کامیاب فلمیں آئیں اور اُن کی ہر فلم پچھلی فلم سے مختلف ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے

فلمسازی کی باریکیوں کو سمجھنے کے لئے کافی لمبا سفر طے کیا تھا۔ فلم ''روپ لیکھا'' کی کامیابی کے بعد این۔ این۔ پی نے فلم ''شطرنج، وہ کون تھی، سرگم، میری جنگ، کالی چرن، فقیرا، چور مچائے شور، دیوتا'' اور ''گھر'' جیسی کامیاب فلمیں بنائیں۔

این۔ این۔ پی نے ۱۹۶۴ء میں فلم ''وہ کون تھی'' بنائی اور اس کی ہدایت کی ذمہ داری انہوں نے راج کھوسلہ کے سپرد کی۔ راج کھوسلہ اس سے قبل دیو آنند کے ساتھ ایک سسپنس فلم ''سی۔ آئی۔ ڈی'' بنا چکے تھے۔ فلم ''وہ کون تھی'' سے ہی ہیروئن سادھنا کی ظاہری خوبصورتی کے علاوہ اندرونی خوبصورتی یعنی اس کی اداکارانہ صلاحیتیں بھی نکھر کر سامنے آئیں۔ یہ ایک خوبصورت اور پُراسرار فلم تھی اور اس سے قبل صرف فلمساز و ہدایتکار کمال امروہوی نے ہی اس طرح کی فلموں کا آغاز اپنی مشہور زمانہ فلم ''محل'' سے کیا تھا، جس میں مدھوبالا اور اشوک کمار نے مرکزی کردار ادا کئے تھے۔ فلم ''وہ کون تھی'' کی پُراثر موسیقی مدن موہن نے ترتیب دی تھی اور راجہ مہدی علی خاں نے اس فلم کے خوبصورت گیت لکھے تھے۔ جیسے...... ''لگ جا گلے کہ پھر یہ حسیں رات ہو نہ ہو......''۔ اس طرح کے گیتوں اور سسپنس سے بھرپور مناظر نے اس فلم کو بار بار دیکھنے کے لئے فلم بینوں کو اپنی طرف کھینچا۔ اس فلم میں سادھنا کی خوبصورتی بھی دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ جب وہ اپنے معصوم چہرے اور تراشے ہوئے ہونٹوں سے کہتی تھی کہ...... ''مجھے خون اچھا لگتا ہے۔'' تو فلم بینوں کے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی تھی۔

فلم ''وہ کون تھی'' کی کامیابی سے متاثر ہو کر این۔ این۔ پی نے اُسی طرح کی اگلی پُراسرار فلم ''گمنام'' بنائی۔ اس فلم میں آٹھ افراد ایک جہاز کی خرابی کی وجہ سے ایک پُرانی حویلی میں پناہ لیتے ہیں اور پھر ایک کے بعد ایک اُن کے قتل کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے اور فلم بینوں کا ذہن سوچتا رہتا ہے کہ قاتل کون ہے۔ اس فلم میں شنکر جے کشن نے اس وقت کے حساب سے عمدہ قسم کی فنتاسی موسیقی ترتیب دی تھی۔ کوٹھی میں بار بار گونجتا ہوا نغمہ...... ''گمنام ہے کوئی، بدنام ہے کوئی......'' ایک عجیب سی پُراسرار کیفیت طاری کرتا ہے۔ اس فلم میں محمد رفیع کا گایا ہوا، ہیلن اور محمود پر فلمایا گیا ایک نغمہ......

''ہم کالے ہیں تو کیا ہوا دل والے ہیں......'' بھی کافی مقبول ہوا تھا۔ اچھا بزنس کرنے کے باوجود یہ فلم ''وہ کون تھی'' جیسی مقبول نہ ہو سکی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد این۔ این۔ سپی نے ۱۹۷۴ء میں ششی کپور، ممتاز اور ڈینی کو لے کر ایک میوزیکل فلم ''چور مچائے شور'' بنائی۔ اس فلم میں کشور کمار کا گایا ہوا نغمہ...... ''لے جائیں گے لے جائیں گے، دل والے دلہنیا لے جائیں گے......'' کافی مقبول ہوا تھا اور بعد میں فلمساز آدتیہ چوپڑہ نے اسی پر اپنی پہلی فلم کا نام رکھا تھا، جس میں سُپر اسٹار شاہ رخ خان کے ساتھ کاجول نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔

ششی کپور اور ڈینی کو لے کر ایک بار پھر این۔ این۔ سپی نے ۱۹۷۶ء میں دو بھائیوں کے بچھڑ جانے کے ہٹ فارمولے پر فلم ''فقیرا'' بنائی۔ گزشتہ صدی کی ساتویں دہائی میں اس طرح کی فلمیں کافی کامیاب ہو رہی تھیں۔ شبانہ اعظمی کو اس فلم سے کمرشیل سنیما میں داخلے کا ایک سنہرا موقع ملا اور اس فلم کے گانے بھی مقبول ہوئے، جیسے...... ''فقیرا چل چلا چل......'' اور...... ''ایک ڈال پر طوطا بولے، ایک ڈال پر مینا......''۔ اس فلم کے کلائمکس میں پانی کے اندر لڑائی کے مناظر نے بھی اُن دِنوں فلم بینوں کو کافی متاثر کیا تھا۔

فلم ''فقیرا'' کے بعد این۔ این۔ سپی نے اُسی سال ۱۹۷۶ء میں اپنی اگلی فلم میں شتروگھن سنہا اور پریم ناتھ کو مرکزی کرداروں میں لے کر ایک کرائم ایکشن فلم ''کالی چرن'' بنائی۔ اس فلم سے سبھاش گھئی کی پہچان ایک کامیاب ہدایتکار کے طور پر بنی، اور شتروگھن سنہا بھی ہیرو کے طور پر پہچانے گئے۔ اس فلم سے شتروگھن سنہا نے یہ بھی ثابت کر دیا کہ وہ کسی فلم کو اکیلے اپنے دم پر چلا سکتے ہیں۔ حالانکہ شروع میں شتروگھن سنہا نے یہ کہہ کر اس کردار کو ادا کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ کہانی میں کچھ دم نہیں ہے۔ سبھاش گھئی نے پونا کے دنوں کے دوست ہونے کے ناطے ایک بار پھر شتروگھن سنہا کو یہ رول ادا کرنے کو کہا۔ جب شتروگھن نے اطمینان سے تفصیلی کہانی سنی تو انہوں نے کہا کہ لگتا ہے یہ کہانی میرے ہی لئے لکھی گئی ہے۔ فلم ''کالی چرن'' ایک دوسرے کردار کی

وجہ سے بھی مقبول ہوئی جو اُس وقت کے مشہور ولن پریم ناتھ نے ادا کیا تھا۔ پریم ناتھ ستر کی دہائی میں دیو آنند کی فلم ''جانی میرا نام'' سے ولن کے طور پر پہلے ہی مقبول ہو چکے تھے۔اس کے علاوہ اداکارہ ریٖنا رائے پر فلمائے گئے لتا منگیشکر کے گانے...... ''جا رے جا او ہرجائی......'' کی وجہ سے بھی یہ فلم کافی مقبول ہوئی۔

اس کے بعد این۔ این۔ پی کی اگلی فلم ''دیوتا'' نمائش کے لئے پیش کی گئی۔ اس فلم میں سنجیو کمار اور شبانہ اعظمی کے ساتھ ڈینی نے بھی ایک اہم کردار ادا کیا۔ ڈینی نے ایک ایسے پولیس انسپکٹر کا کردار ادا کیا تھا جس کو ایک قتل کی تفتیش کرنی تھی اور اتفاق سے سنجیو کمار کی گزری زندگی کے کچھ تار اس کے ہاتھ لگ جاتے ہیں۔ ڈینی کی اداکاری کے لحاظ سے یہ ایک اچھی فلم ثابت ہوئی۔

فلمساز این۔ این۔ پی نے اداکارہ ریکھا کو ایک سنجیدہ اور باصلاحیت اداکارہ کے طور پر فلم ''گھر'' میں پیش کیا۔ یہ فلم اداکار ونود مہرہ اور اس کی بیوی ریکھا کے خوبصورت ازدواجی رشتوں پر مبنی ہے۔ موسیقار آر۔ ڈی۔ برمن کی خوبصورت دھنوں سے بجی اس فلم میں کاسٹیوم ڈیزائنر بھانو اتھیہ نے ریکھا کو زیادہ حسین دکھانے کے لئے خوبصورت ساڑیوں میں سجایا تھا اور ریشمی لنگی کرتا ڈریس میں بھی ریکھا بہت خوبصورت لگتی ہے۔ اس فلم میں ریکھا کی اجتماعی عصمت دری کے بعد ریکھا نے اپنی آنکھوں اور جسم کی حرکات وسکنات سے بہترین اداکاری پیش کی ہے۔ یہ ایک اچھی جذباتی فلم تھی جس میں ونود مہرہ نے بھی کئی مناظر میں بہترین اداکاری کے نمونے پیش کئے ہیں۔ اس فلم کی کہانی اور اسکرین پلے دنیش ٹھاکر نے تحریر کئے تھے اور نغمے گلزار کے تحریر کردہ تھے۔

اسی طرح این۔ این۔ پی نے ۱۹۷۹ء میں اپنی موسیقی ریز فلم ''سرگم'' میں بڑے ہی خوبصورت انداز میں اداکارہ جیہ پردہ کو پیش کیا تھا۔ بطور ہدایتکار کے۔ وشواناتھ کی یہ پہلی فلم تھی اور اداکار رشی کپور نے بھی اس فلم میں ایک بہترین کردار ادا کیا تھا۔ فلم ''سرگم'' اپنے زمانے کی کامیاب فلموں میں سے ایک ثابت ہوئی۔ اس کے علاوہ این۔ این۔ پی نے دھرمندر کو ڈبل رول میں لے کر فلم ''غضب'' بنائی۔ جب ایک

دھرمندر کا قتل ہو جاتا ہے تو اس کی روح دوسرے دھرمندر کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے۔ بعد میں اسی کہانی کو سلمان خان کی فلم ''جڑواں'' اور ''ہیلو برادر'' میں بھی دہرایا گیا۔ دھرمندر نے اپنے مزاحیہ کردار کو بہترین انداز میں ادا کیا ہے جو بالکل ایک کارٹون جیسا لگتا ہے۔

۱۹۸۵ء میں ایک بار پھر سبھاش گھئی کو ہدایتکار کے طور پر این۔ این۔ سپی نے اپنی فلم ''میری جنگ'' میں لیا اور انل کپور اس فلم کے ہیرو بنے۔ ایک طرح سے اداکارہ نوتن کی فلموں میں دوبارہ واپسی اسی فلم کے کریکٹر رول کے طور پر ہوئی تھی۔ جاوید جعفری کو بھی ولن کے طور پر اسی فلم میں پہلی بار پیش کیا گیا اور انہوں نے بڑی خوبصورتی کے ساتھ اس کردار کو ادا کیا۔ عدالت کے مناظر نے اس فلم کو زیادہ دلچسپ اور قابل دید بنا دیا تھا۔ ایک طرح سے این۔ این۔ سپی کی لگ بھگ یہ آخری بڑی اور زیادہ کامیاب فلم تھی۔ اس کے علاوہ انہوں نے ۱۹۷۱ء میں فلم ''پارس''، ۱۹۷۲ء میں فلم ''ہار جیت''، ۱۹۸۰ء میں فلم ''پھر وہی رات'' اور ۱۹۸۹ء میں فلم ''آگ سے کھیلیں گے''، ۱۹۹۲ء میں ''آج کا غنڈہ راج''، ۱۹۹۴ء میں ''تیسرا کون'' اور ۱۹۹۹ء میں فلم ''سلسلہ ہے پیار کا'' جیسی فلمیں بھی بنائیں، مگر یہ فلمیں زیادہ کامیاب نہ ہو سکیں۔

اپنے آخری دنوں میں کامیاب اور مقبول فلمساز این۔ این۔ سپی کو دل کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔ وہ ۷۵ برس کے تھے اور ایک ہفتہ ممبئی کے بریچ کینڈی اسپتال میں زیرِ علاج رہنے کے بعد ۷ نومبر ۲۰۰۶ء بروز منگل کی شام کو ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کا ایک بیٹا اور تین لڑکیاں ہیں۔ اپنی کئی کامیاب فلموں کی وجہ سے این۔ این۔ سپی ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں ہمیشہ یاد کئے جاتے رہیں گے۔

OO
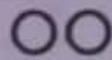
نُور جہاں

دُنیا میں نور جہاں نام کی دو عورتوں نے بہت شہرت حاصل کی ہے۔ ایک تو ملکۂ ہندوستان نور جہاں، جو بادشاہ جہانگیر کی بیگم تھیں اور دوسری ملکۂ ترنم نور جہاں، جو اپنی اداکاری اور آواز کی جادوگری کے لیے مشہور تھیں۔

گلوکارہ و اداکارہ نور جہاں ۲۱ر ستمبر ۱۹۲۶ء کو صوبہ پنجاب کے ایک چھوٹے سے گاؤں کسور میں پیدا ہوئیں۔ نور جہاں کا خاندان کافی بڑا تھا اور یہ دس بھائی بہن تھے۔ نور جہاں کو بچپن سے ہی موسیقی کی تعلیم دی گئی تھی، جو اُن کے خون میں رچ بس گئی تھی۔ جب دوسرے بچے کھیل کود میں مصروف ہوتے تھے، تب وہ ماسٹر غلام حیدر سے موسیقی اور گائیکی کی تعلیم حاصل کر رہی ہوتی تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ انہیں گلوکاری سے جنون کی حد تک لگاؤ تھا۔ انہوں نے زندگی میں بہت سے سمجھوتے بھی کیے، مگر جہاں گائیکی سے منہ موڑ لینے کی بات آئی تو انہوں نے سب کچھ تیاگ دیا۔ صرف چھ برس کی عمر میں انہوں نے فلمساز کے۔ ڈی۔ مہرہ کی فلم ''غیبی گولہ'' میں چائلڈ آرٹسٹ کے طور پر کام کیا۔ یہ فلم ۱۹۳۵ء میں ریلیز ہوئی جو مدن تھیئٹر نے بنائی تھی۔ اُسی برس نور جہاں کی دو فلمیں، ''مصر کا ستارہ'' اور ''آزادی'' بھی نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ ۱۹۳۶ء میں فلم ''شیلا'' اور ''ناری راج''، ۱۹۳۷ء میں ''مسٹر ۴۲۰، فخر اسلام، کس کی پیاری''، ۱۹۳۸ء میں ہیر سیال، ۱۹۳۹ء میں ''گل بکاؤلی، سسی پنو''، ۱۹۴۰ء میں ''یملا جٹ'' اور ۱۹۴۱ء میں فلم ''چودھری'' ریلیز ہوئی۔ ان تمام فلموں میں بے بی نور جہاں نے فلمی پردے پر اپنی فنی صلاحیتوں کے ذریعہ ایک خاص پہچان بنائی تھی۔

ملکہ ترنم نورجہاں کا پیدائشی نام اللہ وسائی تھا اور سیٹھ دل سکھ کرنانی نے ان کو نورجہاں کا نام دیا تھا۔ نورجہاں بچپن میں ہی استاد فضل حسین کی شاگرد ہو گئی تھیں۔ اُستاد بہت بوڑھے ہو گئے تھے، الہٰذا اُنہوں نے اپنے ایک ہونہار شاگرد اُستاد غلام حیدر سے کہا کہ اب تم اللہ وسائی اور عیدن، دونوں بہنوں کو موسیقی کی تعلیم دو گے۔

اس طرح نواب بیگم، عیدن بیگم اور اللہ وسائی پر مشتمل تھیٹر چند دنوں میں ہی پنجاب میل کے نام سے مشہور ہو گیا۔ تھیٹر کے مالک سیٹھ دل سکھ کرنانی نے ایک دن کہا کہ آپ سب لوگ آج سے اللہ وسائی کو نورجہاں کہا کریں گے۔ سیٹھ نے نورجہاں کا ہاتھ دیکھ کر یہ بھی کہا کہ اس کی شہرت ایک دن ساتویں آسمان تک پہنچے گی۔ نورجہاں کی ایک بہن عیدن اور پانچ بھائی تھے۔ ان کے والد کا نام مدد علی عرف مدا، اور ماں کا نام فتح بی بی تھا۔

۱۹۴۲ء میں نورجہاں کی ایک ایسی فلم کی نمائش ہوئی جس نے بے بی نورجہاں کو بحیثیت ہیروئن فلم نگری میں متعارف کرایا۔ پنچولی پکچرس کے بینر تلے بنی اس فلم کا نام تھا ''خاندان'' جس کے ہدایتکار شوکت حسین رضوی تھے۔ اس فلم کی موسیقی غلام حیدر نے ترتیب دی تھی اور نورجہاں کے مقابل غلام محمد نے ہیرو کا مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ منورما، اجمل، بے بی اختر اور ابراہیم وغیرہ اس فلم ''خاندان'' کے دیگر اہم کردار تھے۔ اس فلم کی نمائش کے وقت نورجہاں کی عمر صرف ۱۳ربرس کی تھی۔

فلم ''خاندان'' کے ذریعہ ہندوستانی فلموں کو ایک ایسی اداکارہ نصیب ہوئی جو پنجابی لب ولہجہ کے ساتھ پردے پر شلوار قمیص کا فیشن بھی لے کر آئی تھی۔ حالانکہ اس سے قبل ہندی فلموں کی ہیروئن صرف ساڑی یا گھاگھرا چولی کا ہی استعمال کیا کرتی تھی۔ نورجہاں کو نئے لب ولہجہ اور نئے لباس میں فلم بینوں نے بہت پسند کیا۔ نورجہاں نے ہیروئن کے طور پر اُس وقت فلموں میں اپنا جلوہ دکھایا جب زبیدہ، دیویکا رانی اور سلوچنا وغیرہ فلم بینوں کی پسندیدہ ہیروئنیں ہوا کرتی تھیں، جو بوس وکنار کے مناظر بھی پردے پر بے جھجک پیش کر دیا کرتی تھیں۔ ایسے ماحول میں نورجہاں نے اپنی شناخت قائم کی،

اور دوسری طرف شعبۂ گلوکاری میں امیر بائی کرناٹکی، زہرہ بائی امبالے والی اور خورشید جیسی گلوکاراؤں کی موجودگی میں اپنے لیے مقام بنایا۔

فلم ''خاندان'' کے بعد اگلے ہی برس ۱۹۴۳ء میں نور جہاں کی فلم ''نوکر'' آئی جس میں چندر موہن، شوبھنا سمرتھ، یعقوب وغیرہ دیگر اداکار تھے۔ دوسری فلم ''دُہائی'' تھی جس میں شانتا آپٹے، کمار، انصاری اور مرزا مشرف تھے۔ تیسری فلم ''نادان'' تھی جس میں مسعود، مایا دیوی، جلو بائی، مراد، نذیر اور جانی بابو تھے۔ ۱۹۴۴ء میں فلم ''دوست'' اور ''لال حویلی''، دو فلمیں منظرِ عام پر آئیں، جن کے ہدایتکار شوکت حسین رضوی اور کے۔ بی۔ لال تھے۔ ان فلموں میں موتی لعل اور سریندر جیسے منجھے ہوئے اداکاروں نے ہیرو کے مرکزی کردار ادا کیے تھے۔

۱۹۴۵ء میں نور جہاں کی زندگی میں ایک نیا دور آیا۔ اس سال ان کی چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ ''بڑی ماں، بھائی جان، ولیج گرل'' اور ''زینت''۔ فلم ''بڑی ماں'' میں نور جہاں کے ساتھ لتا منگیشکر نے بھی بے بی لتا کے نام سے ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ فلم ''زینت'' کے لیے نور جہاں نے موسیقار میر صاحب حفیظ خان اور رفیق غزنوی کی ترتیب شدہ دھن پر پہلا فلمی نغمہ صدابند کرایا تھا جس کے بول تھے...... ''بلبلو مت رو یہاں، آنسو بہانا ہے منع......'' اسی فلم سے نور جہاں نے ہندی فلموں کی اولین قوالی کو بھی اپنی آواز بخشی جس کے بول تھے...... ''آہیں نہ بھریں، شکوے نہ کیے، کچھ بھی نہ زباں سے کام لیا۔''

شوکت حسین رضوی کی ہدایت میں بنی فلم ''زینت'' نے اپنے نغموں کی مقبولیت کے سبب کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور نور جہاں کو بطور ایک کامیاب اداکارہ اور گلوکارہ عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ فلم ''زینت'' کے ساتھ ہی ہدایتکار امرناتھ اور موسیقار شیام سندر کی فلم ''ولیج گرل'' بھی نور جہاں کے لافانی نغموں کی وجہ سے مقبولیت حاصل کر سکی۔ ۱۹۴۵ء میں نمائش ہوئی ان چار فلموں کے بعد نور جہاں ہندوستانی فلموں کی سب سے زیادہ کامیاب اداکارہ گلوکارہ کہلانے لگیں اور نور جہاں کی

آواز نے ملک کے گوشے گوشے میں دھوم مچا دی تھی۔

۱۹۴۶ء میں عظیم ہدایتکار محبوب خان اور موسیقار اعظم نوشاد کے ساتھ نور جہاں کو فلم ''انمول گھڑی'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ محبوب خان نے اس فلم کے ذریعہ اپنے زمانے کے تین مقبول ترین اداکاروں کو ایک ساتھ پیش کیا تھا جو نامور گلوکار بھی تھے۔ نور جہاں، سریندر اور ثریا۔ تکونی محبت کی کہانی پر مبنی اس فلم کے لاجواب نغموں کی مقبولیت کے سبب فلم ''انمول گھڑی'' اپنے وقت کی سب سے بڑی ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم کے نغموں کی ریکارڈ توڑ فروخت نے نور جہاں کو ملکہ ترنم اور نوشاد کو موسیقار اعظم بنا دیا۔ ''جواں ہے محبت حسیں ہے زمانہ، میرے بچپن کے ساتھی مجھے بھول نہ جانا، آجا میری برباد محبت کے سہارے، آواز دے کہاں ہے، دُنیا مری جواں ہے'' جیسے نور جہاں کے گائے ہوئے یہ نغمے آج سات دہائیوں کے بعد بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

۱۹۴۷ء میں نور جہاں کی آخری دو فلمیں منظرعام پر آئیں، جن میں کام کرتے ہوئے انہوں نے عوام سے اپنے فن کا لوہا منوا لیا اور اس کے بعد ملکۂ ترنم اپنے لاکھوں مداحوں اور پرستاروں کو چھوڑ کر پاکستان ہجرت کر گئیں۔ دلیپ کمار کے ساتھ نور جہاں کی اکلوتی فلم ''جگنو'' شوکت آرٹ پروڈکشن کے بینر سے شوکت حسین رضوی کی ہدایت میں موسیقار فیروز نظامی کی موسیقی سے بجی ہوئی تھی۔ محمد رفیع اور نور جہاں کا گایا دوگانا...... ''یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے......'' نور جہاں کے مقبول ترین گانوں میں سے ایک ہے۔ اس فلم میں گلوکار محمد رفیع نے ایک چھوٹا سا کردار بھی ادا کیا تھا۔

دوسری فلم ''مرزا صاحباں'' تھی جس کے ہدایتکار امرناتھ اور موسیقار پنڈت امرناتھ تھے۔ مرزا صاحباں'' اپنے نغموں کی مقبولیت کے اعتبار سے زبردست کامیاب فلم تھی، لیکن افسوس بٹوارے نے ملکہ ترنم کو سرحدوں کے اُس پار پہنچا دیا۔

''آواز دے کہاں ہے......'' جیسے صدابہار نغمے کے علاوہ بے شمار سریلے نغموں

کو آواز دے کر ملکہ ترنم نور جہاں تقسیم ہند کے بعد لاہور چلی گئیں۔ حالانکہ ان دنوں وہ گلوکارہ کے علاوہ اداکارہ کے طور پر بھی بے حد مقبول تھیں۔ ان کے شوہر شوکت حسین رضوی بمبئی میں مشہور و معروف فلمساز اور ہدایتکار تھے۔ بعد میں انہوں نے لاہور جا کر شاہ نور اسٹوڈیو کی بنیاد رکھی۔ بمبئی میں شوکت حسین رضوی اور نور جہاں کے عشق کی داستانیں زبان زدِ خاص و عام تھیں اور لوگ ان کے قصے چٹخارے لے کر ایک دُوسرے کو سنایا کرتے تھے۔ حالانکہ رضوی خاندان نے دونوں کی شادی کی مخالفت کی تھی، مگر عشق کی فتح ہوئی اور دونوں نے شادی کر لی۔

بمبئی سے لاہور جانے کے بعد کچھ دنوں تک دونوں میں کافی بہتر تعلق رہا، مگر آہستہ آہستہ دونوں ایک دوسرے سے اختلاف کرنے لگے اور اداکار اعجاز دُرّانی کو لے کر معاملہ بہت آگے بڑھ گیا۔ شوکتِ حسین رضوی سے نور جہاں کو دو بیٹے اور ایک بیٹی پیدا ہوئے اور بعد میں ۱۹۵۹ء میں دونوں کا طلاق ہو گیا۔ نور جہاں نے دُوسری شادی اداکار اعجاز درّانی سے کی، جن سے نور جہاں کو تین بیٹیاں پیدا ہوئیں۔ مگر یہ دُوسری شادی بھی ناکام ہو گئی اور وہ اپنے بچوں کے ساتھ اکیلی ہی رہنے لگیں۔

آزادئ ملک کے دس گیارہ برس بعد تک نور جہاں گلوکاری اور اداکاری، دونوں میں اپنا سکہ چلاتی رہیں۔ مگر بدلتے حالات اور رجحانات کی وجہ سے انہوں نے دھیرے دھیرے اداکاری چھوڑ کر گلوکاری میں ہی اپنے آپ کو بنائے رکھا۔ ۱۹۶۰ء میں فلم "سلمیٰ" کے گانے...... "یہ زندگی ہے یا کسی کا انتظار" سے ایک بار پھر ان کی آواز کی دھوم مچ گئی۔ اس کے بعد سے لاہور کے ہر ریکارڈنگ اسٹوڈیو میں نور جہاں ہی نظر آتی تھیں۔ ان کے گائے ہوئے نغمے ہٹ ہوتے چلے گئے اور خورشید انور، رشید اَترے، اے۔ حمید، نثار بزمی، وزیر علی، ناشاد، خلیل احمد اور بشیر احمد جیسے موسیقاروں نے اپنی ہر فلم میں نور جہاں کی آواز کا استعمال کیا۔ آج بھی "زندگی ہے یا کسی کا انتظار......، نگاہیں ملا کر بدل جانے والے......، ارے او بے مروت......، مجھ سے پہلی سی محبت......" جیسے اُن کے گائے ہوئے گیت لوگ بہت عقیدت سے سنتے ہیں۔

فلمی نغموں کے علاوہ نور جہاں نے اردو کے نئے اور پُرانے کئی مشہور شاعروں کی غزلیں بھی ریکارڈ کرائی ہیں۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے پنجابی گیتوں کو بھی ایک نئے انداز سے متعارف کرایا ہے۔ مشہور گیت...... ''لال مری پت رکھیو بھلا جھولے لالن'' اور ''دلدار صدقے، لکھوار صدقے'' آج بھی پورے پنجاب میں جھوم جھوم کر گائے جاتے ہیں۔

بلبل ہند اور بھارت رتن جیسے اعزازات سے نوازی جانے والی عظیم گلوکارہ لتا منگیشکر بھی شروع سے ہی ملکہ ترنم نور جہاں کو اپنی بڑی بہن اور استاد کی حیثیت سے مانتی رہی ہیں۔ نور جہاں نے ہندوستان میں رہتے ہوئے ہیروئن کے بطور صرف ۶۹ر فلموں میں اداکاری کے جوہر دِکھائے، جن میں تقریباً ۱۲ر خاموش فلمیں تھیں۔ ۵۵ر فلمیں بمبئی میں، ۸ر کلکتہ میں، ۵ر لاہور میں اور ایک رنگون میں بنی۔ انہوں نے تقریباً ۱۲۷ر نغمے ہندوستانی فلموں کے لیے صدابند کیے۔ لیکن آج ۶۵ر برس بعد بھی ملکہ ترنم کے گائے ہوئے وہ سب نغمے ہندوستانی فلموں اور فلمی موسیقی کے لیے ایک انمول خزانہ ہیں، جو برسہا برس تک اس عظیم گلوکارہ کے فن کو خراج تحسین پیش کرتا رہے گا۔

۲۳ر دسمبر ۲۰۰۰ء کو ماہ رمضان المبارک میں نور جہاں نے کراچی شہر میں آخری سانس لی اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملی۔ نور جہاں جیسی شخصیت صدیوں میں پیدا ہوتی ہے۔ بیسویں صدی کو قدرت کا ایک عظیم عطیہ نور جہاں کی آواز کا وہ آہنگ ہے جو ایک شعلے کی مانند بلند رہا۔ اُن کی آواز کی خوبصورتی، اُس کی فنی نزاکتوں اور حقیقی سروں کی ادائیگی کو اُن کے بعد آنے والا کوئی بھی فنکار چھو تک نہیں سکا۔ نور جہاں نے تقریباً ۷۰ر برس تک ایک دُنیا کو اپنی آواز کا دیوانہ بنائے رکھا۔

OO
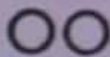
جے دیو

جے دیو کا جنم ۳ راگست ۱۹۱۸ء کو مشرقی افریقہ میں ہوا۔ اُن کا وطن نابھہ تھا...... پانچ دریاؤں کی سرزمین پنجاب میں بچپن بیتا۔ بچپن ہی سے موسیقی کی جانب رجحان تھا۔ والدہ نے بیٹے کے شوق کو دیکھتے ہوئے اُس کا حوصلہ بڑھایا۔ وہ اُسے اپنے ساتھ بھجن کیرتن میں لے جانے لگیں۔ نو برس کی عمر میں جے دیو کو آریہ ہائی اسکول، لدھیانہ میں داخل کرا دیا گیا۔ اس طرح سے کہا جا سکتا ہے کہ ادب اور موسیقی کے شیدائیوں کو، یا یوں کہہ لیجئے کہ فلمی دنیا کو لدھیانہ نے دو عظیم ہستیاں دیں، ایک نامور شاعر ساحر لدھیانوی، اور دوسرے موسیقار جے دیو!! ابھی جے دیو پانچویں کلاس میں ہی تھے کہ انہیں پروفیسر رائے کے گندھرو مہاودیالیہ میں داخل کرا دیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں جب انہیں اتفاق سے لاہور جانا ہوا تو وہاں پہلی بار بولتی فلم ''علی بابا چالیس چور'' دیکھی، جس نے ان کے نوجوان ذہن پر گہرا اثر ڈالا، اور اُن کے دل میں خود کو گلیمر سے بھرپور کھیل تماشے کی دُنیا میں جانے کی خواہش پیدا ہو گئی...... اور وہ تعلیم ادھوری چھوڑ کر بمبئی چلے آئے، جہاں وہ امپیریل اسٹوڈیوز (موجودہ جیوتی اسٹوڈیوز) کے باہر گھنٹوں کھڑے رہتے۔ بس دل میں ایک خواہش تھی، فلمی دنیا میں شامل ہونے کی...... انہیں دنوں جے دیو کے والد نے انہیں ایک وائیلن تحفہ کے طور پر دیا اور وہ اُسے واپس لدھیانہ لوٹا لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اُن دنوں جے دیو کی عمر یہی کوئی تیرہ چودہ برس کی رہی ہوگی۔

لدھیانہ میں جے دیو کی ملاقات، خاموش فلموں کے نامور اسٹار میلٹین سے

ہوئی۔ جس نے واڈیا موویٹون میں کام دلانے کے لئے اُن کی بہت مدد کی۔ جے دیو کی پہلی فلم جے۔بی۔ اچ۔ واڈیا کی ''لعل یمن'' (۱۹۳۳ء) تھی۔ اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ''وامن اوتار'' اور ''ویر بھرت'' نمائش کے لئے پیش کی گئیں۔ ''ویر بھرت'' میں جے دیو نے پہلی مرتبہ گانا گایا۔ جے دیو نے چند فلموں میں بطور اداکار بھی کام کیا۔ جن میں ''کالا گلاب'' (۱۹۳۴ء)، اور ''مس فیرنڈسیل'' (۱۹۳۵ء) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ لیکن جے دیو کو جلدی ہی اس امر کا احساس ہو گیا کہ ایکٹنگ ان کی منزل مقصود نہیں۔ اس لئے وہ فلموں کو چھوڑ کر واپس لدھیانہ آ گئے۔

اگر چہ جے دیو کو اس امر کا احساس تھا کہ دمہ کے موذی مرض کی وجہ سے گانا ان کے بس کا روگ نہیں اس کے باوجود وہ کیرانہ گھرانے کے جادوگر بندھو، اور آگرہ گھرانے کے سردار موہن سنگھ سے فن موسیقی کی تربیت حاصل کرتے رہے۔ آپ نے الموڑا میں اودے شنکر کے گروپ کے ساتھ بھی کچھ عرصہ کام کیا۔

فلموں میں بہت بڑا نام کمانے کے لئے جے دیو ۱۹۵۱ء میں پھر بمبئی چلے آئے اور سرودنواز استاد علی اکبر خاں کے شاگرد بن گئے، جو اُن دنوں چیتن آنند کی فلم ''آندھیاں'' کے لئے دھنیں ترتیب دے رہے تھے۔ ۱۹۵۳ء کے فوراً بعد ۱۹۵۴ء کے اوائل میں جے دیو بطور اسسٹنٹ ایس۔ ڈی۔ برمن کے ساتھ شامل ہو گئے۔ آپ کی پہلی آزادانہ فلم چیتن آنند کی ہدایت میں بنی فلم ''جورو کا بھائی'' تھی، جس کے ہیرو اتفاق سے وجے آنند تھے، لیکن جس فلم سے جے دیو کو شہرت ملی، وہ تھی امرجیت کی ''ہم دونوں'' جس کے ہیرو دیو آنند تھے، اور سادھنا و نندا نے بطور ہیروئن کام کیا تھا۔ ''ہم دونوں'' کی سحر طراز دھنوں کی مقبولیت کے بعد جے دیو کا نام صف اول کے موسیقاروں میں ہونے لگا۔

اس کے بعد جے دیو نے ایک کے بعد ایک سُر اور سنگیت سے آراستہ فلمیں دیں، جن میں ''مجھے جینے دو، دو بوند پانی، پریم پربت، آلاپ، گھروندہ، گمن'' اور ''اَن کہی'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آپ نے ٹی۔وی۔ سیریل ''شریکانت'' کے لئے

بھی دھنیں ترتیب دیں۔ اس کے ساتھ ہی آپ ایک اور موسیقی ریز سیریل ''امرتا'' پر بھی کام کر رہے تھے۔ مزکورہ سیریل میں نامور شعراء کی لاجواب تخلیقات پیش کی گئی تھیں۔ آپ نے نیپالی فلم ''مائی گھر'' کے لئے بھی دھنیں سنواریں۔ اس فلم کے گانے مہاراجہ ویریندر نے قلم بند کئے تھے۔

۱۹۸۶ء میں آپ کو دو اہم ترین اعزازات سے نوازا گیا۔ ایک تو آپ کو دوردرشن اور آل انڈیا ریڈیو کے لئے تین برس کے لئے پروڈیوسر بنایا گیا، دوئم آپ کو مدھیہ پردیش سرکار کی جانب سے ''لتا منگیشکر پُرسکار'' سے نوازا گیا۔ اس سے قبل آپ نے بہترین موسیقی پر تین نیشنل ایوارڈ حاصل کیے۔ ''ریشما اور شیرا، گمن'' اور ''اَن کہی'' فلموں پر جے دیو کو یہ ایوراڈ دیئے گئے۔

بہترین فلمی موسیقی تیار کرنے کے لیے تین مرتبہ نیشنل ایوارڈ حاصل کرنے والی اس شخصیت نے ۶رجنوری ۱۹۸۶ء کو ہمیشہ کے لئے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ ۵رجنوری کو آپ کو سینے میں درد محسوس ہوا۔ منہ سے خون جاری ہو گیا اور وہ بیہوش ہو گئے۔ فوراً اسپتال میں داخل کرایا گیا، لیکن اجل کے ہاتھوں سے انہیں بچایا نہ جا سکا۔ صبح تین بج کر دس منٹ پر انہوں نے دم توڑ دیا۔

نامور گلوکار منا ڈے نے جے دیو کے انتقال پر کہا......

''جے دیو ملک کے بہترین میوزک ڈائیریکٹروں میں سے ایک تھے۔
آپ کے بغیر فلم سنگیت میں یقینی طور پر ایک خلا سا محسوس کیا جائے گا۔''

اُس وقت کے مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات جناب اجیت پانجہ نے جے دیو کو ملک کا ایک مشہور ومعروف میوزک ڈائیریکٹر کہا۔

بھارت کے گیارہویں بین الاقوامی فلمی میلے کی افتتاحی تقریر میں جناب وی۔ پی۔ ساٹھے نے جے دیو کو اظہار عقیدت پیش کرتے ہوئے چند الفاظ میں ملک کے اس عظیم فنکار کی تعریف کی اور کہا کہ اُن کے نغمے آج بھی ہمارے کانوں میں گونج رہے ہیں اور مدتوں گونجتے رہیں گے۔

۶ر جنوری کو، جس دن جے دیو کا انتقال ہوا، دوردرشن پر ملک کے اس عظیم فنکار کو شردھانجلی پیش کرتے ہوئے جے دیو کے ساتھ کام کرنے والے ایک فلمساز نے کہا کہ کتنی شرم کی بات ہے کہ تین تین نیشنل ایوارڈ حاصل کرنے والے موسیقار کے پاس رہنے کو اپنا مکان بھی نہ تھا، لیکن اس فلمساز نے جو آج سیاست میں بھی بڑھ چڑھ کر حصّہ لے رہا ہے، جے دیو کے لئے رہائش گاہ کا انتظام کرنے کے لئے اپنے اثر ورسوخ کو کام میں لانے کی ضرورت کیوں محسوس نہ کی۔

صرف ایک وجے آنند نے صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے کہا کہ ایک عظیم موسیقار کو جس نے کبھی کہیں سے کوئی دُھن سرقہ نہیں کی، فلم انڈسٹری نے بالکل نظر انداز کر رکھا تھا۔

''میں ایک دن ایسی فلم بنانے کے بارے میں سوچ رہا تھا جس میں جے دیو اسٹائل کی خالص کلاسیکی دُھنوں کو استعمال کیا جاتا۔'' وجے آنند کے علاوہ کسی دوسرے فلمساز کو اس قدر صدق دلی سے اظہار عقیدت پیش کرنے کا احساس کیوں نہ ہوا۔

کہا جاتا ہے کہ جے دیو کو ۵ر جنوری کو دل کا دورہ پڑا تھا لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ جے دیو کی موت دنیا کی کم مائیگی کو دیکھتے ہوئے دھیرے دھیرے دل ٹوٹ جانے سے ہوئی۔ شروع میں وہ مدتوں چرچ گیٹ میں پینگ گیسٹ کے طور پر رہتے رہے، جہاں انہیں گیسٹ ہاؤس کے مالک کے ہاتھوں کئی بار خوار ہونا پڑا تھا۔

اس عظیم موسیقار کی آخری رسومات میں فلمی دنیا کی نامور ہستیوں نے شرکت کی، جن میں سنیل دت، وجے آنند، بھیم سین، جگجیت سنگھ، خیام، بھوپیندر، سریش واڈکر، اور ہری ہرن کے نام خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ آخری رسومات کی تکمیل کے لئے جے دیو کے بھانجے ستیش ملک خاص طور سے لندن سے تشریف لائے۔ جے دیو غیر شادی شدہ تھے۔ ان کی ایک بہن لندن میں رہتی ہیں۔

ان کی موت مسلسل غیر مستقل اور بے قائدہ زندگی گزارنے کی وجہ سے ہوئی۔ جے دیو کے ایک نزدیکی واقف کار کو جب ان کے انتقال کی خبر ہوئی تو وہ فوراً ان کے

گیسٹ ہاؤس چرچ گیٹ پر پہنچا۔ وہاں پر چوکیدار نے بتایا کہ وہ تو چار ماہ ہوئے چلے گئے ہیں اور میں کبھی کبھی ان کی ڈاک دینے سی۔سی۔آئی۔ جاتا ہوں۔'' چوکیدار نے کہا۔سی۔سی۔آئی۔ Receptionist کو تو جے دیو کے انتقال کی خبر پر یقین ہی نہیں آیا۔ اس نے بتایا کہ موسیقار وہاں سے چھوڑ کر ایک نزدیکی ہوٹل میں رہنے لگے تھے۔ ہوٹل سے پتہ چلا کہ انہیں بریچ کینڈی اسپتال شفٹ کر دیا گیا ہے اور اسپتال میں جا کر پتہ چلا کہ مرنے والے کی اپنی کوئی رہائش گاہ نہیں تھی اس لئے اسپتال سے سیدھے شمشان گھاٹ پہنچا دیا گیا ہے۔

ہمارے ملک میں کسی فنکار کی پہچان اس وقت ہوتی ہے جب اس کی مقبولیت عروج پر پہنچ جاتی ہے...... یا پھر اس کے انتقال کے بعد!!! جے دیو کی پہچان دوسرے زمرے میں ہوئی۔ ٹیلی ویژن کے 'شردھانجلی' پروگرام میں جے دیو کو اس فلمساز نے خراجِ عقیدت پیش کی، سب سے پہلے جس کے ٹی۔وی۔سیریل میں جے دیو نے سُر اور سنگیت کے جادو بکھیرے تھے۔ بیمار پڑنے سے پہلے جے دیو نے سیریل کی چار قسطوں میں اپنا کام ختم کر لیا تھا، لیکن ہوا یہ کہ ڈھائی سو روپے فی قسط کی خطیر رقم بھی بروقت مریض کے پاس نہ پہنچ سکی۔ وہ تو 'مادھوری' کے ایڈیٹر جناب ونود تواری نے جے دیو کے تئیں اپنے پیار اور عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے بوڑھے آرٹسٹوں کی فلاح اور بہبود سے متعلق فلم فیئر اور مادھوری کے فنڈ سے جے دیو کے یرقان کا علاج کروایا۔ وہ چھ ماہ قبل ہی یرقان میں مبتلا ہو گئے تھے۔ کسی ایک سوگوار نے بھی جے دیو کے علاج میں دلچسپی نہ لی۔ حتیٰ کہ کسی نے بیماری کے دوران عیادت کے لئے اس نامور فنکار کی مزاج پرسی کی تکلیف بھی گوارا نہ کی؟

زندگی کے آخری چند برس جے دیو نے ہوٹلوں میں کھانا کھا کر گزارے جو عارضہ جگر سے تازہ تازہ صحت یاب ہونے والے کے لیے مہلک تھا۔

یوں کہئے کہ جب مدھیہ پردیش نے جے دیو کو لتا منگیشکر ایوارڈ کی شکل میں ایک لاکھ روپے عطا کئے تو ان کی مالی مشکلات کا ازالہ ہوا۔ اگر وہ چند برس اور حیات

رہتے تو شاید مدتوں سے اپنے مکان میں رہنے کا جو خواب وہ دیکھ رہے تھے وہ شرمندۂ تعبیر ہو جاتا۔

جے دیو کے جنازے میں پیناز مسانی، سریش واڈکر، اور بھوپندر جیسے گلوکاروں کی شرکت سے پتا چلتا ہے کہ اس عظیم فنکار نے اپنی زندگی میں نئے اور اُبھرتے ہوئے گلوکاروں کا حوصلہ بڑھایا، لیکن حقیقت یہ ہے کہ حوصلہ بڑھانے کا عمل ایک طرفہ تھا...... جے دیو کو وہ حوصلہ نہ ملا جس کا یہ عظیم فنکار حقدار تھا۔

آج جے دیو ہمارے درمیان نہیں ہیں لیکن ان کے ترتیب دیے ہوئے سحر آفریں گیت ہمارے دل و دماغ میں ہمیشہ رچے بسے رہیں گے، اور جب بھی کانوں سے یہ آواز ٹکرائے گی...... 'اللہ تیرا نام...... ایشور تیرا نام......' جے دیو ہم سب کو یاد آتے رہیں گے۔

OO

مقبول صابری

ہندوستانی سماج میں فن موسیقی کو زمانۂ قدیم سے ہی بڑی خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ بلکہ یوں کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ موسیقی ہمارے سماج کی روحانی غذا کا درجہ رکھتی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے یہاں کے سماج کی روح کو محسوس کرتے ہوئے اپنی شاعری کے ساتھ موسیقی کو بھی شامل کرلیا اور نہ صرف یہ کہ آپ کو موسیقی سے بڑا شغف تھا، بلکہ آپ نے موسیقی کے کئی راگ راگنی اور کئی مشہور آلاتِ موسیقی کی ایجاد بھی کی۔ آپ کا تعلق کیونکہ تصوف سے تھا، لہٰذا آپ نے قوالی کو فروغ دینے میں بڑا اہم کردار ادا کیا۔ ہند وپاک میں آج بھی حضرت امیر خسروؒ کا رنگ بڑی عقیدت اور احترام سے سنا جاتا ہے، بلکہ قوال خود بھی بڑی عقیدت کے ساتھ رنگ پڑھتے ہیں۔

قوالی کی مقبولیت ہمارے سماج میں صدیوں سے رہی ہے۔ اسی وجہ سے بہت سے فلمسازوں نے اپنی فلموں میں بھی قوالی کو خاص جگہ دی ہے، جس کی وجہ سے قوالی نہ صرف خواص میں بلکہ عوام میں بھی بے حد مقبول ہوئی۔ فن قوالی میں حبیب پینٹر قوال، شنکر شمبھو، جانی بابو قوال کے علاوہ اگر کسی قوال نے عالمی شہرت حاصل کی ہے تو وہ ہیں صابری برادران قوال۔ اس جوڑی میں غلام فرید اور مقبول صابری دونوں سگے بھائیوں نے قوالی کی مقبولیت کو بامِ عروج تک پہنچانے میں بہت بڑا کردار ادا کیا ہے۔ بڑے بھائی غلام فرید کا انتقال ۵/اپریل ۱۹۹۴ء کو ہوگیا تھا اور اس کے بعد چھوٹے بھائی مقبول صابری اکیلے پڑ گئے، مگر انہوں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے قوالی گانے کا کام جاری

رکھا اور صابری برادران کے نام سے قوالیاں گاتے رہے۔

قارئین کو یاد ہوگا کہ جب صابری برادران قوالی گاتے تھے تو بڑے بھائی غلام فرید اپنی بھاری بھرکم آواز میں ''اللہ'' پکارتے تھے جس سے قوالی کی وجدانی کیفیت میں مزید اضافہ ہو جاتا تھا۔ یہ دونوں بھائی فن قوالی میں یکتائے روزگار تھے اور اپنے منفرد انداز کی وجہ سے انہوں نے عالمی شہرت حاصل کی۔ گزشتہ دنوں ۲۱ر ستمبر کی شام کو مقبول صابری نے بھی جنوبی افریقہ کے ایک اسپتال میں داعی اجل کو لبیک کہا اور ۷۰ر برس کی عمر میں اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ وہ کافی عرصے سے دل اور ذیابیطس کے مریض تھے۔ مقبول صابری اپنے علاج کے سلسلے میں دو ماہ قبل ہی جنوبی افریقہ گئے تھے اور وہاں اُن کا بائی پاس آپریشن بھی ہوا تھا۔

مقبول صابری کی پیدائش ۱۲ر اکتوبر ۱۹۴۱ء کو پنجاب کے ضلع روہتک کے موضع کلیانہ میں استاد عنایت حسین صابری کے گھر میں ہوئی۔ وہ اپنے بڑے بھائی غلام فرید صابری سے گیارہ برس چھوٹے تھے اور اس خاندان کا تعلق روحانی سلسلہ صابری سے تھا۔ تقسیم ہند کے بعد ۱۹۴۷ء میں ہی یہ اپنے خاندان کے ساتھ پاکستان چلے گئے۔ مقبول صابری نے موسیقی اور گائیکی کی تعلیم ابتداء میں اپنے والد سے اور بعد میں استاد فتح دین، استاد رمضان خاں، استاد لطافت حسین خاں رامپوری سے حاصل کی۔ ان دونوں بھائیوں نے اپنے والد کے تعاون سے ایک پارٹی بنائی اور صابری برادران کے نام سے مشہور ہوئے۔ جس وقت مقبول صابری کی عمر صرف گیارہ برس تھی، صابری برادران نے اپنی پہلی لائیو پرفارمنس اپنے آبائی شہر کلیانہ میں ہی پیش کی تھی، اور وہ موقع تھا پیر مبارک شاہ کے عرس کا، جس میں بڑی تعداد میں ہندوستان اور پاکستان کے مندومین وعقیدت مند شریک ہوئے تھے۔ اس کے بعد سے غلام فرید صابری کے انتقال تک صابری برادران کا قوالی کی دنیا میں کوئی ہم پلہ نہیں رہا تھا اور انہوں نے سبھی کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ ساتویں اور آٹھویں دہائی میں غلام فرید صابری اور مقبول صابری کی قوالیوں کے بے شمار کیسیٹ، ریکارڈس اور البم ریلیز ہوئے، اور ان کی ریکارڈ سیل

ہوتی تھی۔ صابری برادران نے نہ صرف پاکستان میں فن قوالی کا الگ ڈھنگ سے مظاہرہ کیا بلکہ دنیا کے بیشتر ممالک میں اپنی آواز کا جادو جگاتے رہے۔

صابری برادران کے بڑے بھائی غلام فرید کی آواز بہت بلند تھی اور وہ اونچے سُر کے بہترین گائیک تھے، جبکہ مقبول صابری کی آواز شیریں، لطافت، کھٹکا اور مُرکی جیسی فنی صلاحیتوں سے مزین تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب دونوں بھائی اپنے مخصوص سُر اور تال ملا کر گاتے تھے تو سامعین پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ حالانکہ مقبول صابری کی آواز غزل گائیکی کے لیے بھی بہت مناسب تھی، اور وہ ایک بہترین غزل گائیک ہو سکتے تھے، مگر انہوں نے اپنے بڑے بھائی غلام فرید کا ساتھ نہیں چھوڑا اور ان کے ساتھ قوالی کے فن کو آگے بڑھاتے رہے۔

غلام فرید اور مقبول صابری دونوں بھائیوں نے کئی ہندوستانی فلموں میں بھی قوالیاں پیش کی تھیں۔ فلم ''سلطان ہند'' میں ''آفتاب رسالت مدینے میں ہے......'' قوالی گاتے ہوئے حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیریؒ کی درگاہ میں صابری برادران کو دکھایا گیا تھا۔ صابری برادران کی بے حد مقبول قوالیوں میں ''بھر دے جھولی میری یا محمدؐ، تاجدار حرم، سرلامکاں سے طلب ہوئی، ساجن گھر آئے، خواجہ کی دیوانی، جتنا دیا سرکار نے مجھ کو، میرا کوئی نہیں ہے تیرے سوا، تو مولا ہے تیرے کرم ہیں نرالے، میرے مولا مجھے اجمیر جانے کی تمنا ہے، فرقت کی ہزاروں راتوں سے، پیار کے موڑ پر مل گئے ہو اگر، دائی حلیمہ گود میں تیری چاند اُترنے والا ہے، دمادم مست قلندر، من کنت مولیٰ، چھاپ تلک سب چھین لی، پیسہ بولتا ہے، شب کو میرا جنازہ جائے گا یوں نکل کر، یا صاحب الجمال'' اور ''آئے ہیں وہ مزار پر'' چند ایسی قوالیاں ہیں جو صابری برادران کے اپنے مخصوص طرز پر گانے کی وجہ سے عالمی پیمانے پر مقبول ہوئیں۔

صابری برادران جس قدر پاکستان میں مقبول تھے، اس سے کہیں زیادہ ہندوستان اور دنیا بھر کے اُن ممالک میں بھی اُتنے ہی مقبول تھے جہاں اردو غزل اور قوالی سنی اور سمجھی جاتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں کو قوالی گائیکی کی خدمات کے عوض کئی بار

ایوارڈ بھی حاصل ہوئے ہیں۔ صابری برادران نعتیہ قوالی میں بھی لاجواب گائیکی کے حامل تھے۔ وہ جب اپنے فن کا مظاہرہ کرتے تھے تو سامعین پر ایک جادو سا طاری ہو جاتا تھا۔ اُن کی گائیکی کی بدولت بڑی تعداد میں غیر مسلم اسلام کی طرف متوجہ ہوئے۔

صابری برادران کے دوسرے چراغ مقبول صابری کے انتقال کے بعد اب قوالی کی دنیا میں ایک بہت بڑا خلاء پیدا ہو گیا ہے کیونکہ ان کی گائی ہوئی قوالیاں ہمارے ذہن و دل میں ایک خاص قسم کا روحانی وجد طاری کر دیتی تھیں۔ قوالی کی حقیقی روایات کو برقرار رکھنے والے صابری برادران کی گائیکی میں جو ندرت اور انوکھا پن تھا، وہ اب شاید ہی کہیں اور سننے کو ملے۔ لہٰذا جب کبھی بھی قوالی کی تاریخ لکھی جائے گی، اس میں مقبول صابری اور غلام فرید صابری کا نام بھی ضرور شامل ہوگا۔ مقبول صابری اپنے پسماندگان میں ایک بیٹا اور چار بیٹیاں چھوڑ گئے ہیں۔

OO

للتا پوار

ہندوستانی سینما کی تاریخ میں ایسی مثالیں بہت کم ہیں جب کسی اداکار یا اداکارہ کو ان کے ذریعہ ادا کیے گئے کرداروں کی وجہ سے پہچان ملی ہو، للتا پوار ایک ایسا ہی نام ہے۔ ہمارے سماج میں جب بھی کسی ساس کا ذکر آتا ہے تو نہ چاہتے ہوئے بھی للتا پوار کا کرخت چہرہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ یہ اُن کی اداکارانہ کامیابی کی اتنی بڑی دلیل ہے جس کے سامنے بڑے بڑے ایوارڈ بھی چھوٹے پڑ جاتے ہیں۔

للتا پوار ۱۹۱۶ء میں مہاراشٹر کے ایک متوسط خاندان میں پیدا ہوئیں۔ اُس زمانے میں لڑکیوں کا اسکول جانے کا عام رواج نہیں تھا، لہٰذا انہوں نے باقاعدہ اسکولی تعلیم حاصل نہیں کی۔ فلموں سے انہیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، وہ تو صرف اپنے گاؤں میں رام لیلا دیکھا کرتی تھیں۔

یہ بات ۱۹۲۴ء کی ہے۔ ایک آٹھ برس کی بچّی، جس کو والدین امبیکا سگونی کہتے تھے، چھٹیاں منانے پونہ گئی تھی، وہیں امبریش سینما میں بھارت کی پہلی خاموش فلم دیکھتے ہوئے وہ حیران و پریشان سی، مختلف سوچوں میں گم تھی۔ جیسے ہی فلم شروع ہوئی، پردے پر ٹائٹل نظر آئے، تو اسکرین کے پاس ہی سازندے آکر بیٹھ گئے۔ وہ موقع بے موقع ساز بجا رہے تھے۔ وہ حیران تھی کہ اتنے بہت سے گونگے آدمی کہاں سے اکٹھے کیے گئے ہیں۔ وہ اُن گونگے لوگوں کو دیکھنے کے لئے اسٹیج کے پیچھے جانا چاہتی تھی، جیسا کہ وہ رام لیلا دیکھ کر کیا کرتی تھی، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہ تھا۔ اس نے آپریٹر سے پوچھا کہ وہ گونگے کون تھے جو رام لیلا میں کام کر رہے تھے؟ آپریٹر نے

اُسے بتایا کہ پاروتی مندر کی پہاڑیوں تلے بنے 'تریوینی اسٹوڈیو' میں کبھی جا کر دیکھو تو پتا چلے کہ فلم کیسے بنتی ہے۔ بچی کے تجسس کو دیکھتے ہوئے اس کے والد اُسے شوٹنگ دِکھانے کے لئے لے گئے تاکہ یہ بات اُس بچی کی سمجھ میں آجائے کہ فلم میں سچ مچ کے لوگ اسٹیج پر نہیں ہوتے، بلکہ ان کی تصویریں ہوتی ہیں۔ وہاں لڑکی نے حیران حیران نظروں سے دیکھا کہ ساری کمپنی بڑے بڑے ستونوں پر کھڑی تھی اور چھت بنانے کے لئے کپڑا لگا رکھا تھا۔ دیواروں اور کھڑکیوں وغیرہ کو مختلف قسم کے رنگ و روغن سے سجا رکھا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں شوٹنگ میں بھگدڑ مچ گئی، لیکن یہ لڑکی دیوار پر لٹک کر شوٹنگ دیکھ رہی تھی۔ لاٹھی کا حملہ...... خون بہہ رہا ہے...... جب ہوش آتا ہے تو کمپنی کے ڈائریکٹر اور پارٹنر نانا صاحب سرپوتدار نے پوچھا...... ''کیا تم فلموں میں کام کرنا پسند کروگی؟'' اس طرح سے بطور چائلڈ آرٹسٹ اُس بچی کا فلمی کیریئر شروع ہو گیا۔ تنخواہ تھی اٹھارہ روپیہ مہینہ۔ بعد میں یہ چھوٹی سی، بھولی سی لڑکی...... ہندوستانی فلموں کی تیز طرار ساس، چغل خور موسی یا چاچی اور لڑاکو بوا کے کرداروں میں مقبول ہوئی، اُس کا نام تھا للتا پوار۔

کچھ دنوں کے بعد للتا پوار ہیروئین کے رول کرنے لگی تھیں۔ آرین کمپنی کی تقریباً بیس فلموں میں، انہوں نے کام کیا، جن میں ''آریہ مہیلا، پتت اُدّھار، راجہ ہریش چندر، شمشیر بہادر'' اور ''چتر سندری'' خاص طور پر پسند کی گئیں۔ چوتھی دہائی میں ہندی فلموں کے ٹائیٹلز انگریزی میں ہوا کرتے تھے۔ للتا پوار نے ''سانگ آف لائف، گلانٹ ہارٹ'' اور ''سویٹ اینجلا'' وغیرہ فلموں میں کام کیا۔ کچھ ہی عرصہ کے بعد انہوں نے کولہاپور کے ایک ہیرو گنپت بھائی کی پارٹنرشپ میں ایک خاموش فلم ''کیلاش'' پروڈیوس کی۔ اس فلم کی لاگت کم کرنے کی غرض سے انہوں نے اس فلم میں ہیروئین، ویمپ اور ماں وغیرہ کے کئی کردار ایک ساتھ ادا کئے تھے۔

۱۹۳۵ء میں للتا پوار نے ایک فلم ''ہمت مرداں'' بنائی، یہ اُن کی پہلی متکلم فلم تھی، ٹارزن ٹائپ کی کہانی پر بنی اس فلم کو خوب پسند کیا گیا۔ اُن دنوں اس قسم کی فلمیں

بہت پسند کی جاتی تھیں، اور بھاری بھرکم مہنگے کاسٹیومز کی ضرورت بھی نہ پڑتی تھی۔ پندرہ دن میں صرف پچاس ہزار روپے کی لاگت میں فلم بن جاتی تھی۔ خاموش فلموں سے متکلم فلموں میں آنا للتا پوار کے لئے کوئی مشکل کام نہ تھا۔ کیونکہ خاموش فلموں میں بھی مکالمے تو ادا کرنے ہی پڑتے تھے۔

۱۹۳۶ء میں انہوں نے ایک اور فلم ''دنیا کیا ہے'' بنائی۔ یہ فلم ٹالسٹائے کی کہانی ''ری سرکشن'' پر بنائی گئی تھی۔ اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی اور لوگوں نے اس فلم میں للتا پوار کی اداکاری کو بہت پسند کیا۔ اس فلم میں ڈرامائی اور جذباتی اداکاری سے ان کی ذاتی پہچان بن گئی اور بطور اداکارہ لوگ انہیں جاننے لگے۔ اس کے بعد للتا پوار نے جذباتی کردار ادا کرنے میں زیادہ دلچسپی لی اور ''امرت'' اور ''نیتا جی پالکر'' وغیرہ فلموں میں ان کی تاثر انگیز اداکاری کی مثال دی جانے لگی۔ انہوں نے ایک سحر طراز، نازک اندام حسینہ کا رول بھی کیا تھا۔ چند فلموں میں گھڑسواری بھی کی۔ ہر قسم کا لباس بھی پہنا، جس میں جینز بھی شامل ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اُن دنوں جینز کو بھی پینٹ کہا جاتا تھا اور اس کا کوئی آرٹسٹک نام نہیں تھا۔ یہ گزشتہ صدی کے ۴۵ویں برس کی بات ہے۔

ڈائریکٹر چندر راؤ کدم کی ایک فلم میں للتا پوار نے کوشش کر کے بھگوان کو ایک رول دلوایا تھا، لیکن شوٹنگ کے دوسرے ہی دن بھگوان دیر سے پہنچے۔ اُن کی ایک آنکھ پر پٹی بندھی تھی۔ شوٹنگ پر آتے وقت وہ ایک سڑک حادثہ کا شکار ہو گئے تھے۔ تمام آرٹسٹ شوٹنگ کے لئے لوکیشن پر جا چکے تھے۔ اس لئے کدم صاحب نے بھگوان سے گھر واپس لوٹ جانے کو کہا۔ اس کا مطلب تھا بھگوان کی ایک دن کی تنخواہ کا نقصان۔ اس لئے للتا پوار نے کدم صاحب سے درخواست کی کہ وہ بھگوان کو اپنے ساتھ لوکیشن پر لے جائیں تاکہ اُن کی حاضری تو لگ جائے۔ بھگوان نے اُن کی اس بات کا بڑا احسان مانا اور بعد میں یہی بھگوان ڈائریکٹر کدم کے اسسٹنٹ بن گئے۔ کچھ ہی عرصہ بعد بھگوان نے کدم کے لئے ایک فلم ''جنگِ آزادی'' کی ہدایتکاری بھی کی۔ اس پُرانے

احسان کے بدلے میں بھگوان نے للتا پوار سے خواہش ظاہر کی کہ وہ اُن کی فلم ''جنگِ آزادی'' میں ضرور کام کریں۔ اگرچہ للتا پوار اُن دنوں کولہاپور میں مصروف تھیں، لیکن پھر بھی وہ دوروز کے لئے اُس فلم کی شوٹنگ پر پہنچ گئیں۔

''جنگ آزادی'' کی شوٹنگ ہے۔ ایک سین میں بھگوان نے للتا پوار کے تھپڑ مارنا ہے۔ بھگوان نے اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ تڑاخ کی آواز آتی ہے اور للتا پوار بیہوش ہو جاتی ہیں۔ چانٹا اتنی زور سے پڑا تھا کہ آدھا چہرہ سُن ہو گیا اور منہ سے فوری طور پر خون بہنے لگا۔ اس فلم کی شوٹنگ دور دراز ایک گاؤں میں چل رہی تھی۔ فوری طور پر طبی امداد ملنا آسان نہیں تھا۔ اگلے دن اُن کو بمبئی لایا گیا اور اسپتال میں ڈاکٹر کو دکھایا گیا۔

ہیروئن بستر پر پڑی ہے۔ اس نامور ہیروئن کو نوٹس ملتا ہے...... ''پکچر رُک نہیں سکتی، اس لئے دوسری ہیروئن لے رہا ہوں۔'' اس کے ساتھ ہی باقی فلمسازوں نے بھی رول کینسل کر دیئے۔ ایک تو بیماری اور اوپر سے یہ مشکل آن پڑی۔ ایسے حالات میں امریک بھائی نے اُن کو بہت سہارا دیا۔

تین سال سے بھی زیادہ دنوں تک وہ بستر پر لیٹی رہیں۔ اُن کی آنکھیں باہر کو نکل آئی تھیں، چہرہ بھیانک سا لگنے لگا تھا۔ درد کی شدت سے تڑپ اٹھتی تھی۔ نتیجے کے طور پر اُن کے ہاتھ کے تمام کانٹریکٹ جاتے رہے۔ وہ تین برس بڑے جان لیوا تھے۔ پھر حالات آہستہ آہستہ نارمل ہونے لگے اور للتا پوار نے دوبارہ فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔ ''گرہستی'' اُن کی پہلی فلم تھی جو انہوں نے بیماری کے بعد مکمل کرائی۔ اگرچہ للتا پوار کی عمر اُس وقت صرف اٹھائیس برس تھی لیکن اُنہیں مجبوراً کریکٹر رول کی طرف آنا پڑا۔ اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر اپنی امیج بدل لی اور سفید ساڑی پہننی شروع کر دی۔ بند گلے کا لمبی بانہوں والا بلاؤز تاکہ لوگ للتا پوار کو زیادہ عمر کی عورت والے رول میں مناسب سمجھنے لگیں۔ آخر کو انہیں کام تو کرنا ہی تھا، کچھ اور وہ کر نہیں سکتی تھیں۔

للتا پوار نے پوری لگن کے ساتھ اپنے کام کی طرف دھیان دینا شروع کر دیا۔ سب باتوں سے بیگانگی کا یہ عالم تھا کہ وہ نہ تو زیادہ لوگوں سے ملتی جلتی تھیں، نہ پارٹیاں دیتی تھیں، نہ پارٹیوں میں جاتی تھیں،...... اور للتا پوار کو ان کی اس لگن اور محنت کا صلہ بھی ملا۔ ''گرہستی'' میں بہترین اداکاری پر انہیں ایوارڈ سے نوازا گیا...... پانچ تولہ خالص سونا۔ راجکپور کی فلم ''اناڑی'' میں مسز ڈیسا کے رول پر بھی انہیں کئی ایوارڈ ملے۔

فلم ''اناڑی'' کی وہ عیسائی عورت ہیرو (راجکپور) کو ڈھونڈتی اور اُس کے مل جانے پر کہتی ہے...... ''تم اِدھر میں بیٹھا، ہم اکھا بمبئی میں ڈھونڈا۔'' بولنے والی مسز ڈیسا کا جملوں کو توڑ توڑ کر ادا کرنے کا وہ انوکھا اور مشکل انداز للتا پوار نے رشی کیش مکرجی سے سیکھا تھا۔ ایک لانگ شاٹ میں وہ ایک پیر کو تھوڑا گھسیٹ کر بالکل انہیں کی طرح چلتی ہیں۔ اس بات کو للتا پوار بھی مانتی ہیں کہ وہ رشی کیش مکرجی کی بہت بڑی فین رہی ہیں۔ فلم ''اناڑی'' کا یہ کردار دوسرے کرداروں سے بالکل مختلف تھا اور اس میں اداکاری کرنے کے بہت سے مواقع حاصل تھے۔ اس فلم کے لئے ان کو ایوارڈ بھی ملا۔ جب وہ ایوارڈ لینے اسٹیج پر گئیں تو کسی نے کہا...... ''للتا بائی، تم نے تو وہ باؤنڈری ماری ہے کہ ایوارڈ دینا ہی پڑا۔'' یہ بات ان کو بھلا کیسے اچھی لگتی۔ مگر اس بات کی شکایت انہوں نے ایوارڈ کمیٹی سے نہیں کی۔ وہ ہمیشہ یہی کہتی تھیں کہ ''میرا سب سے بڑا ایوارڈ تو میرے پرستار ہیں، جو برابر مجھے خط لکھتے ہیں۔ جب اُن کو شکایت ہوتی کہ فلاں فلم میں آپ کو ایوارڈ کیوں نہیں ملا، تبھی مجھے سب کچھ مل جاتا ہے۔''

فلم ''پروفیسر'' کی بوڑھی عورت، جو رہن سہن میں پوری احتیاط اور شائستگی برتتی ہے مگر ایک بوڑھے پروفیسر کے آنے سے آہستہ آہستہ اس کے بلاؤز کی آستینیں چھوٹی ہوتی جاتی ہیں۔ میک اَپ کی طرف توجہ ہونے لگتی ہے۔ رنگ روپ کی طرف دھیان اچانک ہی جانے لگتا ہے۔ اس فلم میں پوری کامیڈی کا انحصار انہیں پر ہے۔ مگر اس

دودھاری تلوار پر چلنا آسان نہیں تھا، کیونکہ ظاہر بھی کرنا تھا کہ وہ کامیڈی کر رہی ہیں۔ بہت ہی نازک کردار تھا یہ، مگر اُسے اُتنی ہی خوبصورتی کے ساتھ انہوں نے نبھایا تھا۔ کار میں بیٹھ کر ''پریم نگر بساؤں گی......'' گانے والی للتا پوار فلم بینوں کو آج تک یاد ہیں۔

وی۔ شانتارام کی فلم ''جہیز'' کی خطرناک ساس اور ''جنگلی'' میں خاندان کی عزت کے لئے پتھر کی چٹان بنی بوڑھی بیوہ اور شمی کپور کی ماں۔ فلم ''من کی آنکھیں'' کی لالچی ساس کے کرداروں میں للتا پوار نے ایک جیسے کردار ہوتے ہوئے بھی الگ الگ انداز اور احساسات کے ساتھ یہ کردار ادا کئے تھے۔

للتا پوار ہندوستانی فلموں میں ساس کا کردار اتنی مرتبہ کر چکی تھیں کہ ایک وقت ان کو یہ محسوس ہونے لگا تھا کہ جیسے وہ ایک ہی فلم میں کام کر رہی ہوں۔

اگر چہ للتا پوار زیادہ تر منفی کردار (نگیٹیو رول) ادا کیا کرتی تھیں، اس کے باوجود فلم میں اُن کے رول زیادہ اہم اور جاندار ہوتے تھے۔ فلم بینوں کو آج بھی ان کی فلمیں ''داغ، پتیتا، جہیز، پرچھائیں، من کی آنکھیں، میم صاحب، بہورانی، گھرانہ'' وغیرہ یاد ہیں۔ شوٹنگ کے وقت پہلی ہی کوشش میں اُن کی اداکاری فن کی اعلیٰ معراج کو چھو لیتی ہے۔ چاہے وہ ریہرسل ہی کیوں نہ ہو۔ اداکاری کرتے وقت وہ کیمرہ کو، کیمرہ کے زاویے کو، لائٹس کو، آس پاس کھڑے لوگوں کو، غرض یہ کہ سب کو بھول جاتی تھیں۔ یہاں تک کہ اگر اُن کی پشت کیمرہ کی طرف بھی ہو، تو بھی وہ اداکاری میں فرق نہیں آنے دیتی تھیں۔ ڈبنگ کرتے وقت للتا پوار ایک بار پھر جسمانی طور پر ایکٹنگ کرتی تھیں، کیونکہ اعضاء کی حرکات وسکنات کے ساتھ ہی آواز اور لب ولہجہ میں اتار چڑھاؤ آتا ہے۔

للتا پوار نے وی۔ شانتارام، راجکپور، امیہ چکرورتی جیسے اعلیٰ ہدایتکاروں کے ساتھ متعدد بار کام کیا ہے اور ایسے بھی بہت سے ہیں (یہ اشارہ صرف ہدایتکاروں کی طرف نہیں ہے) جنہوں نے ایک بار للتا پوار کے ساتھ کام کر کے کانوں کو ہاتھ لگا کر توبہ کر لی کہ دوبارہ ان کا نام نہیں لیں گے۔ اگر للتا پوار کے مزاج کا کوئی کردار نہ

ہوا تو ہدایتکاروں کی یہی کوشش رہی کہ انہیں نہ لیا جائے۔ شاید وہ یہ سمجھتے تھے کہ کہیں للتا پوار بازی نہ مار لے جائیں۔ وی۔ شانتارام کو وہ بہت اعلیٰ درجہ کا ہدایتکار مانتی تھیں۔ اُن کا ماننا تھا کہ اگر آپ کی اداکاری پچیس پیسے کی ہے تو وہی اداکاری وی۔ شانتارام کی فلم میں ایک روپے کی بن جاتی ہے۔ راجکپور کے ساتھ للتا پوار نے پانچ فلمیں کی ہیں۔

رامانند ساگر کے ساتھ للتا پوار نے بہت سی فلمیں کی تھیں، جن میں ''آنکھیں، پریم بندھن، اور من کی آنکھیں'' خاص طور سے مشہور ہیں۔ اس لئے ''رامائن'' کی پلاننگ کے وقت رامانند ساگر نے شروع سے ہی للتا پوار کو ذہن میں رکھا اور منتھرا کے کردار کے لئے انہیں منتخب کیا۔

''رامائن'' میں راج محل کی دوسری ملازماؤں کے مقابلے میں منتھرا کے کپڑے بڑے بیکار سے لگتے تھے۔ مہارانی کیکئی کی معتمد ملازمہ کی بجائے للتا پوار اُس لباس میں بالکل دھوبن سی لگ رہی تھیں۔ سیریل میں اگر ان کی اداکاری کو پسند کیا گیا ہے تو اس کا تمام تر کریڈٹ ہدایتکار رامانند ساگر کو دیا جاتا ہے۔ جہاں کاسٹیوم اور لباس سے کریکٹر کے مطابق اُن کی پہچان نہیں ہوتی تھی۔ اسی طرح للتا پوار کی اداکاری میں بھی وہ تاثر نہیں تھا جو ہونا چاہیے۔ رول میں پوری طرح رچ بس جانے کے لئے مناسب میک اَپ اور گیٹ اَپ بھی نہایت ضروری ہے۔

لوگوں نے ''رامائن'' میں للتا پوار کی پرفارمنس کو بہت پسند کیا تھا۔ اُس وقت للتا پوار کے پاس اُن کے مداحوں کے ڈھیروں تعریفی خطوط آتے تھے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ انہیں اُن کا لباس پسند آیا، جبکہ دوسروں کو اُن کے چلنے کا انداز اچھا لگا۔ سیریل ''رامائن'' کی شوٹنگ کے دوران للتا پوار ایک کار حادثے کا شکار ہو گئی تھیں۔ ٹانگوں پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں، لہٰذا چلنا دشوار تھا۔ اُن کو سیٹ تک سہارا دے کر لے جانا پڑتا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں رول کے مطابق لنگڑا کر ہی چلنا تھا۔ اس لئے کار حادثہ نے اُن کا کام آسان کر دیا تھا۔

للتا پوار ایک عرصہ تک ایک شاندار چودہ کمروں والے عظیم الشان فلیٹ میں زندگی بسر کرتی رہیں۔ بعد میں انہوں نے دادر میں واقع اُس شاندار مکان کو چھوڑ کر جوہو میں رہائش اختیار کر لی تھی، جہاں وہ اپنے شوہر راج کمار گپتا کے ساتھ، جو بلیرڈ کے ماہر کھلاڑی تھے، اطمینان کی پُر سکون زندگی گزار رہی تھیں۔ بدقسمتی سے للتا پوار کی کوئی اولاد نہیں تھی۔ کام میں بے انتہا مصروف رہنے کی وجہ سے انہوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ انہیں کوئی اولاد نہیں ہونا چاہیے۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے بچے نوکروں کی نگرانی میں پرورش پائیں اور ایک "آیا" ان کی ادھار کی ماں کہلائے۔

۸۲ر برس کی عمر میں ۲۵ر فروری ۱۹۹۸ء کو للتا پوار کا ممبئی میں انتقال ہو گیا۔ اُن کی آخری فلم ۱۹۹۷ء میں ریلیز ہوئی "بھائی" تھی۔

OO

کلدیپ کور

ہندوستانی فلموں میں جس طرح ہیرو کے مقابلے میں ویلن کو ایک خاص اہمیت حاصل تھی اور لوگ فلم دیکھنے سے پہلے ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ اس فلم میں ''غدّار'' کون ہے، ٹھیک اسی طرح ہیروئین کے مقابلے میں بُری عورت کا کردار کرنے والی ویمپ کو بھی خاص اہمیت حاصل تھی اور وہ ہیرو/ ہیروئین کے ملن کے راستے میں ہر طرح کی رکاوٹ پیدا کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتی تھی۔

آج کی فلم بین نسل بُری عورت کے روپ میں زیادہ سے زیادہ بندو کو پہچان پاتے ہیں یا پھر کچھ اور اوپر کو چلیں تو ششی کلا کی یاد آتی ہے۔ ان دونوں اداکاراؤں نے فلموں میں بُری عورت کے بہترین کردار ادا کئے ہیں۔ مگر ان دونوں اداکاراؤں سے پہلے ایک اور نام ہندوستانی فلمی پردے پر بُری عورت کے کردار کی پہچان بنا ہوا تھا...... اور وہ نام تھا کلدیپ کور کا۔ کلدیپ کور اس وقت فلمی پردے پر ایسے چھائی ہوئی تھیں کہ لوگ ہیروئین کو بعد میں معلوم کرتے تھے اور کلدیپ کور کو پہلے پوچھتے تھے۔

کلدیپ کور سے پہلے بھی کئی ویمپ فلمی پردے پر اپنے جلوے دکھا چکی ہیں۔ پرمیلا، صوفیہ وغیرہ، مگر جیسے ویلنوں میں پران سے پہلے بھی کئی ویلن ہونے کے باوجود ویلن کے روپ میں سب سے اعلیٰ مقام پران کو ہی حاصل رہا، اسی طرح ویمپوں میں بھی یہی اعلیٰ مقام مرحومہ کلدیپ کور کو حاصل تھا۔ ہندی فلمی پردے پر فلم بینوں کو اپنی اداکاری سے باندھنے والا ویلن اداکار پران تھا تو ویمپ کلدیپ کور تھیں۔ یہی وجہ ہے کہ ویمپوں کا ذکر چھڑتے ہی اتنے برسوں بعد بھی کلدیپ کور کا

نام اپنے آپ ہی یاد آ جاتا ہے۔

کافی عرصہ پہلے منجو بنسل (شریمتی اسرانی) نے جب فلموں میں ویمپ کا کردار ادا کرنا شروع کیا تو بار بار کلدیپ کور کا تذکرہ کرنے لگیں اور بندو کے مقابلے میں ویمپ کے روپ میں اپنے قدم جمانے کے لئے کہتی تھیں......"میں دوسری کلدیپ کور بنا چاہتی ہوں۔" حالانکہ منجو بنسل بے چاری کلدیپ کور تو کیا بندو بھی نہیں بن پائی اور صرف ٹی۔ وی۔ پروڈیوسر ہو کر رہ گئی۔ مگر اس بات سے یہ ضرور ظاہر ہو جاتا ہے کہ ۱۹۷۵ء میں بھی فلموں میں داخل ہونے والی ویمپ اداکارہ کے ذریعہ "دوسری کلدیپ کور" بننے کی خواہش منجو بنسل نے کیوں کی۔ یہ اس بات کی گواہی ہے کہ کلدیپ کور کا سکہ فلمی ویمپ کے روپ میں لوگوں کے دل و دماغ پر چھایا ہوا تھا۔

۱۹۴۸ء میں بمبئی ٹاکیز کی فلم "ضدی" میں اداکار پران فلمی ویلن کے روپ میں ظاہر ہوئے تھے۔ اُسی فلم میں کلدیپ کور نے ویمپ کے چولے میں اپنے جلوے دکھائے۔ پران بعد میں ویلن سے کریکٹر ایکٹر بن گئے اور اس میدان میں بھی انہوں نے اپنی کامیابی کو برقرار رکھا۔ مگر آج بھی لوگ اس ویلن پران کو نہیں بھول سکے ہیں جو ہر فلم میں ایک نئے انداز میں اپنے آپ کو پیش کرتا تھا۔ کلدیپ کور میں بھی یہی بات تھی۔ آج ان کے انتقال کو برسوں بیت چکے ہیں، مگر ویمپ کے روپ میں انہوں نے جن کرداروں کو جنم دیا ہے، وہ آج بھی لوگوں کے سامنے آ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کے کچھ کردار تو جیسے لازوال ہو گئے ہیں۔

بمل رائے نے جب "دیوداس" کو دوبارہ بنانے کا اعلان کیا تو فلمی دنیا میں دلیپ کمار جیسے پاورفل اداکار کے ہونے کے باوجود لوگوں کی سوالیہ نگاہیں سہگل کی جگہ لینے والے اداکار کو ڈھونڈ رہی تھیں۔ ۱۹۵۱ء کی بی۔ آر۔ چوپڑا کی کامیاب ترین فلم "افسانہ" کی ویمپ کلدیپ کور کے بارے میں بھی یہی ہوا۔ بی۔ آر۔ چوپڑا نے جب "افسانہ" کو دوبارہ "داستان" کے نام سے بنانے کا اعلان کیا تو لوگ پوچھنے لگے...... "اشوک کمار کا کردار تو دلیپ کمار کر لیں گے، لیکن کلدیپ کور کا کردار کون ادا کرے گی؟"

''افسانہ'' میں ہیروئین سے زیادہ پاور فل کردار ویمپ کا تھا۔ لہٰذا وہ کردار اداکارہ بندو کو دیا گیا۔ اس نے کلدیپ کور کے مقابلے میں یہ کردار کسی طور پر بھی کمزور نہیں ہونے دیا۔ بندو اور کلدیپ کور کا تقابل کرتے وقت یہ بات ذہن میں رکھنی چاہئے کہ ویمپ کا خاص ہتھیار ہوتا ہے...... اس کی نظریں، یا یوں کہئے کہ اس کا تیرِ نظر، اور یہ تیرِ نظر بندو کے پاس بہت عمدہ حالت میں موجود تھا، لیکن کلدیپ کور کی نظر میں جو کٹیلا پن تھا، وہ بندو کی نظر میں اتنا مکمل نہیں تھا۔ بندو کی نظر میں سیکس کی مقدار زیادہ تھی۔ کلدیپ کور کی ویمپ میں جو بے حیاپن اور ایک طرح کی بدمعاشی تھی، وہ بندو میں نہیں دکھائی دیتی تھی۔ کلدیپ کور صرف کیبرے گرل کبھی نہیں بنی۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ وہ کسی فلم میں ناچتی نہیں تھی۔ آج بھی اس کی زندگی کے بارے میں یاد آنے پر ''گورے گورے او بانکے چھورے'' (سادھی)، ''دل تیرا ہے، دل میرا ہے، تو لیتا جا'' (جگّو) وغیرہ اس کے ڈانس آنکھوں کے سامنے گھومنے لگتے ہیں۔ ''دل تیرا ہے......'' ڈانس گیت کلب ڈانس جیسا ہی تھا۔ جو بعد میں بندو نے بیشتر فلموں میں پیش کیا۔ پھر بھی کیبرے ڈانسر کے روپ میں بندو کی جو امیج بنی، ایسی امیج کلدیپ کور نے کبھی بننے نہیں دی۔ وہ ایک رقاصہ سے زیادہ کامیاب ویمپ تھی...... صد فیصد ویمپ۔ یہی وجہ ہے کہ آج اتنا عرصہ گزر جانے کے بعد بھی فلمی ویمپ کا تذکرہ چھڑتے ہی کلدیپ کور اور اُس کے ذریعہ ادا کیے گئے فلم ''ضدی، گھر ہستی، مینا بازار، سادھی، چھوٹی بھابی، ناچ، جلدیپ، نو بہار، سنگدل، جگّو، گماشتہ، بیجو باورا'' وغیرہ فلموں کے یادگار کردار آج بھی نظروں کے سامنے کبھی بھی زندہ ہو اٹھتے ہیں۔

فلم ''ضدی'' سے پہلے لاہور میں بنی کچھ فلموں میں کلدیپ کور نے ہیروئین کے کردار بھی ادا کئے تھے۔ مگر ان کے ویمپ کے کردار اس بُری طرح ذہنوں پر چھائے ہوئے تھے کہ یادداشت پر بہت زور ڈالنے پر بھی ''اندر لیلا'' جیسی فلم کو چھوڑ کر کوئی دوسری فلم یاد نہیں آتی۔ ہیروئین کے بجائے ویمپ کے رول میں ''مینا بازار'' فلم میں نرگس سے کلدیپ کور کی ''فری اسٹائل'' کی کشتی ہی زیادہ یاد رہتی ہے۔

ہندوستانی فلموں سے وابستہ ہونے سے قبل کلدیپ کور لاہور میں تھی اور ایک طرح سے دیکھا جائے تو اداکار پران نے ان کو ہندوستانی فلموں سے متعارف کرایا تھا۔ پران خود بھی ان دنوں نئے نئے ہندوستانی فلموں سے وابستہ ہوئے تھے اور پران سے کلدیپ کور کی دوستی لاہور کے زمانے سے تھی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ جب پران نے ولین کے کرادار اپنائے تو کلدیپ کور فلموں میں ویمپ بن کر آنے لگی۔ اس زمانے میں کلدیپ کور کے ساتھ پران کے معاشقے کا قصہ بھی کافی مشہور ہوا تھا مگر پران کیونکہ اپنی ذاتی زندگی میں بہت صاف ستھرا کردار اور نیک قسم کی شخصیت رہے ہیں، اس لیے کلدیپ کور والے عشق کی بیل زیادہ دن منڈیر پر نہ چڑھ سکی اور پران نے بڑی ہمت اور بہادری کے ساتھ اس میدان عشق میں اپنی فوجوں کو پیچھے ہٹا لیا۔ کلدیپ کور کے بارے میں مشہور مصنف سعادت حسن منٹو نے اپنی کتاب ''پردے کے پیچھے'' میں بڑے اچھوتے انداز میں تذکرے کئے ہیں، جو بڑے دلچسپ اور قابل مطالعہ ہیں۔

○○

پران

ہندوستان کی آزادی سے پہلے کا زمانہ تھا۔ ہر طرف انگریزی سرکار کا رعب و دبدبہ تھا اور ہندوستانی عوام میں ملک کی آزادی کے لیے چھٹ پٹاہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔ بہت سے لوگ اپنی شان وشوکت برقرار رکھنے کے لیے انگریزوں کی حمایت کر رہے تھے اور کچھ لوگ ایسے بھی تھے جو خاموشی سے سرکار کے لیے کام بھی کر رہے تھے، مگر دل سے اپنے وطن کی آزادی کے خواہاں تھے۔ ایسے ہی ایک شخص لالہ کیول کشن سکند کا چھوٹا سا کنبہ پُرانی دہلی کے بلی ماران علاقے میں آباد تھا۔

لالہ جی سرکار کے کاموں کا ٹھیکہ لیا کرتے تھے۔ اُن ہی لالہ کیول کشن سکند اور اُن کی بیوی رامیشوری سکند کے یہاں ۱۲رفروری ۱۹۲۰ء کو پران کشن سکند کی پیدائش ہوئی، جو آگے چل کر ہندوستانی سنیما کے سب سے بڑے ویلن کے طور پر پہچانے گئے۔ لالہ کیول کشن اپنے مختلف سرکاری ٹھیکوں کے سلسلے میں کئی شہروں میں ٹھکانے بدلتے رہے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پران کشن سکند کی ابتدائی تعلیم دہلی، میرٹھ، دہرہ ڈون، اور رامپور جیسے شہروں میں ہوئی۔ انہوں نے رضا ہائی اسکول، رامپور سے ہائی اسکول پاس کیا۔ پران کو فوٹوگرافی کا بہت شوق تھا، لہٰذا وہ دہلی گئے اور ''داس اینڈ کو'' اسٹوڈیو میں فوٹوگرافر کی ملازمت کرنے لگے۔ اتفاق سے اس اسٹوڈیو کا ایک یونٹ شملہ میں بھی تھا۔ لہٰذا پران کو شملہ بھیج دیا گیا۔ شملہ میں پران نے تقریباً ایک برس فوٹوگرافر کا کام کیا اور پھر کسی ذریعہ سے لاہور چلے گئے۔ لاہور میں بھی وہ بحیثیت فوٹوگرافر ہی کام کر رہے تھے۔

پران کو سگریٹ پینے کا شوق بارہ برس کی عمر سے ہی لگ گیا تھا۔ ایک دن وہ لاہور میں کسی پان والے کی دُکان سے سگریٹ خرید رہے تھے۔ اتفاق سے وہاں لاہور فلم انڈسٹری کے مشہور اسکرپٹ رائٹر ولی محمد ولی بھی موجود تھے۔ ولی صاحب کو پران کے سگریٹ پینے کا انداز کچھ مختلف لگا اور وہ اُن کو غور سے دیکھنے لگے۔ دراصل یہاں ولی صاحب کو اپنی لکھی ایک فلم کا کردار یاد آرہا تھا جو وہ پران میں دیکھ رہے تھے۔ ولی محمد نے پران سے اپنا تعارف کرایا اور وہیں سے ایک کاغذ لے کر اپنا پتہ لکھ کر پران کو دیا اور کہا کہ وہ کسی روز اس پتے پر آکر ان سے ملاقات کریں۔ پران نے وہ کاغذ لے کر رکھ تو لیا مگر زیادہ توجہ نہیں دی۔

کئی روز کے بعد ولی محمد صاحب کی ملاقات کسی سنیما گھر پر پھر پران سے ہوئی تو انہوں نے پران سے ملاقات والی بات کو دہرایا۔ پران نے پوچھا کہ وہ کیوں اس سے ملنا چاہتے ہیں؟ تب ولی صاحب نے بتایا کہ وہ اُن کو فلم میں کام دلوانا چاہتے ہیں۔ پران نے اُن کی اس بات کو بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ مگر ملاقات کا وعدہ کر لیا۔

ایک دن پران ولی صاحب کے دیے ہوئے پتے پر پہنچ گئے اور تب ولی محمد صاحب نے پران کو مختصراً فلم ''یملا جٹ'' کی کہانی کے ویلن کے کردار کے بارے میں بتایا اور پران اس فلم میں کام کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ یہ واقعہ ۱۹۴۰ء کا ہے۔ پران کی پہلی فلم ''یملا جٹ'' کامیاب ہوئی اور انہوں نے ولی محمد صاحب کے ساتھ بعد میں بھی کئی فلموں میں کام کیا۔

ولی محمد صاحب لاہور میں دَل سُکھ پنچولی کے 'پنچولی اسٹوڈیو' میں مستقل ملازمت پر اسکرپٹ رائٹر، مکالمہ نگار اور نغمہ نگار تھے۔ انہوں نے پران کو پنچولی اسٹوڈیو سے یہ سہولت دلوا دی تھی کہ وہ فرصت کے اوقات میں اپنے فوٹوگرافری کے کام کو جاری رکھ سکتے تھے۔ موتی بی۔ گڈوانی کی ہدایت میں بنی فلم ''یملا جٹ'' کی کامیابی کے بعد پران نے شوکت حسین رضوی کی فلم ''خاندان'' سائن کی، جس میں ملکہ ترنم نور جہاں ہیروئن تھیں۔ پران کی پہلی فلم ''یملا جٹ'' میں نور جہاں چائلڈ آرٹسٹ کے

طور پر کام کر چکی تھیں۔ فلم ''خاندان'' میں نور جہاں کی عمر صرف ۱۵/برس تھی اور وہ پران سے قد میں چھوٹی تھیں، لہٰذا دونوں کے کلوز اَپ شاٹ لیتے وقت نور جہاں کو ایک چھوٹے سے اسٹول پر کھڑا کیا جاتا تھا۔

۱۹۴۵ء میں پران کی شادی شریمتی شکلا کے ساتھ لاہور میں ہوئی، اور ایک قسم کی گھریلو ذمہ داریاں اُن پر آ گئیں۔

لاہور میں ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۶ء تک پران ۲۲/فلموں میں اداکاری کر چکے تھے اور ۱۸/فلمیں ابھی اُن کے پاس باقی تھیں، جب ۱۹۴۷ء میں ان کے کیریئر میں ایک خلاء آ گیا جو ملک کی تقسیم سے وابستہ تھا۔ ۱۹۴۰ء سے ۱۹۴۷ء تک کی تمام فلمیں غیر منقسم ہندوستان میں بنی تھیں۔

تقسیم ہند کے وقت پران بمبئی چلے آئے اور کافی دنوں تک انہیں یہاں کوئی فلم نہیں ملی۔ تب انہوں نے اپنا کیریئر بدلنے کا ارادہ کر لیا اور بمبئی کے مرین ڈرائیو پر ہوٹل ڈیلمار میں ملازمت شروع کر دی اور تقریباً ۸/ماہ کے بعد بمبئی ٹاکیز میں سعادت حسن منٹو کی سفارش پر اُن کو فلم ''ضدی'' میں کام مل گیا۔ فلم ''ضدی'' دیو آنند کی بھی پہلی فلم تھی اور کامنی کوشل اُس فلم کی ہیروئن تھیں۔ اس فلم کی کامیابی کے بعد پران کو لگاتار فلمیں ملنی شروع ہو گئیں۔

۱۹۴۸ء میں ''ضدی'' کے بعد اُسی سال پران کی ''نیک دل، گرہستی، چنریا، برہمن'' اور ''برسات کی ایک رات'' فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اب پران کو لگاتار فلمیں مل رہی تھیں اور اُن کی شہرت ہندوستانی سنیما میں بڑھتی جا رہی تھی۔ اگلے ہی برس ۱۹۴۹ء میں اُن کی پانچ فلمیں ''راکھی، پتلی، جنم پتری، بڑی بہن'' اور ''اپرادھی'' ریلیز ہوئیں۔ اِن میں ''بڑی بہن'' فلم بہت کامیاب رہی اور پران کی مقبولیت میں مزید اضافہ ہوا۔ ۱۹۴۹ء میں ولی محمد ولی کی فلم ''پتلی'' میں ایک بار پھر پران کو موقع ملا۔ ولی صاحب بھی تقسیم کے بعد بمبئی آ گئے تھے اور ایک پروڈیوسر کے بطور مہالکشمی ریس کورس کے پاس فیمس اسٹوڈیو میں انہوں نے اپنا آفس بھی بنا لیا تھا۔ اس کے بعد لگاتار بطور ویلن

پران صاحب کو فلمیں ملتی رہیں۔ ۱۹۵۲ء میں ولی محمد ولی کی فلم ''زمانے کی ہوا'' میں ایک بار پھر دونوں کا ساتھ رہا۔ ۱۹۵۳ء میں پران نے پہلی بار راجکپور کے ساتھ فلم ''آہ'' میں کام کیا۔ یہ اُن کا پہلا شریف آدمی کا کردار تھا، اور تھوڑا الگ قسم کا...... جو پران نے نہایت مہذب طریقے سے ادا کیا تھا۔ ۱۹۵۵ء میں ''دیوداس، بارہ دری، منیم جی'' اور ''آزاد'' جیسی فلموں میں پران نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے اور اُن کے چاہنے والوں کی تعداد ہندوستان بھر میں تیزی سے بڑھنے لگی۔

فلم ''آزاد'' میں پہلی بار اُن کا ساتھ دلیپ کمار کے ساتھ ہوا۔ ۱۹۵۸ء میں دلیپ کمار کے ساتھ بمل رائے کی فلم ''مدھومتی'' میں پران کی اداکاری کو کافی سراہا گیا۔ اسی سال جیمنی فلمز کی ''راج تلک'' میں بھی پران موجود تھے۔ ۱۹۵۹ء میں بابو بھائی مستری کی ہدایت میں ''بے درد زمانہ کیا جانے'' اور نانا بھائی بھٹ کی ہدایت میں ''ڈاکا'' میں بھی پران نظر آئے۔ اسی سال فلمالیہ کی ''دل دے کے دیکھو''، منروا مووی ٹون کی ''دوغنڈے'' اور لیکھ راج بھاکری کی ''پیار کی راہیں'' اُن کی خاص فلمیں رہیں۔

۱۹۶۰ء میں بسنت، بے وقوف، چھلیا، دلی جنکشن، گیمبلر، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، ماں باپ'' اور ''ٹرنک کال'' جیسی اہم فلموں میں پران موجود تھے۔ راجکپور کی فلم ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' میں پران نے ایک خونخوار ڈاکو کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کیا تھا مگر ایک سین میں جب اُن کی آنکھیں بھیگ جاتی ہیں، تو وہاں فلم بینوں کو پتہ چلتا ہے کہ انسان کتنا بھی خونخوار کیوں نہ ہو، مگر اس کے دل کے کسی نہ کسی گوشے میں انسانیت ضرور زندہ رہتی ہے۔

۱۹۶۱ء میں ''جب پیار کسی سے ہوتا ہے'' میں ناصر حسین کی ہدایت میں اور ۱۹۶۲ء میں ''دل تیرا دیوانہ، ہاف ٹکٹ، جھولا'' اور ''من موجی'' جیسی فلموں میں پران نے بہترین کردار ادا کیے۔ ''ہالف ٹکٹ'' اور ''من موجی'' فلموں میں کشور کمار اُن کے ساتھ تھے۔

۱۹۶۳ء میں من موہن ڈیسائی کی ہدایت میں ''بلف ماسٹر''، راول فلمز کی ''دل ہی تو ہے''، شکتی سامنت کی ''ایک راز''، ایچ۔ ایس راویل کی ''میرے محبوب''، ناصر حسین کی ''پھر وہی دل لایا ہوں'' اور فلمساز وکرم پروڈکشن کی ''پیار کیا تو ڈرنا کیا'' جیسی کامیاب فلموں میں پران کے یادگار کردار تھے۔ خاص طور پر فلم ''میرے محبوب'' کے عیاش اور بگڑے ہوئے نواب منے میاں کو تو لوگ آج تک بھولے نہیں ہیں۔ اسی طرح ۱۹۶۴ء میں فلم ''کشمیر کی کلی'' کے ٹھیکیدار کا وہ مکالمہ...... ''شتالے شتالے شمپا، ہمارا بھی شمئے آئے گا'' لوگوں کو آج بھی یاد ہے۔

پران کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ ہر فلم میں اپنی ایک الگ قسم کی ڈائیلاگ ڈلیوری پیش کرتے تھے اور ایک الگ قسم کا ایکشن جیسے سگریٹ پینے کا انداز، جیب سے رومال نکالنا اور رکھنا، اُنگلی نچا کے بولنا، ایک آنکھ کو مچکا کے بولنا اور لنگڑا کے چلنا، جیسے مختلف قسم کے ایکشن سے کردار سازی کیا کرتے تھے۔

۱۹۶۵ء میں ایک بار پھر فلم ''دو دل، خاندان، گمنام، میرے صنم'' اور ''شہید'' جیسی فلموں سے پران نے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے فلم بینوں کا دل جیت لیا تھا۔ حالانکہ ہر فلم میں اُن کا کردار منفی ہوتا تھا مگر ایک دوسرے سے اتنا مختلف ہوتا کہ ہر کردار الگ ہی اپنی چھاپ چھوڑتا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب لوگ فلموں کی پبلسٹی میں پران کا نام دیکھ کر ہی فلم دیکھنے جاتے تھے۔

۱۹۶۶ء میں پران کے نگیٹیو کردار والی دلیپ کمار، وحیدہ رحمٰن کی فلم ''دل دیا درد لیا'' آئی۔ کاردار صاحب کی اس فلم میں پران نے ایک الگ قسم کی اداکاری کی تھی۔ شروع میں وہ ریاست کے راجکمار کو طرح طرح سے ذلیل کرتا ہے اور جب راجکمار اپنے اصلی کردار میں سامنے آتا ہے تو پران در در بھٹکتے ہوئے بھی اپنی اس نفرت کو کم نہیں کر پاتا اور راجکمار کو ایک ملازم کی طرح ہی کمتر سمجھتا ہے۔ اسی برس منوج کمار اور آشا پاریکھ کی کامیاب ترین فلم ''دو بدن'' میں بھی پران نے کامیاب ویلن کا کردار ادا کیا۔ فلم ''ملن، پتھر کے صنم'' اور دلیپ کمار کے ساتھ ''رام اور شیام'' میں اپنی بہترین

اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ اُسی برس فلمساز و ہدایتکار منوج کمار نے فلم ''اُپکار'' میں پہلی بار پران کو بالکل الگ طرح کے کریکٹر ایکٹر کے طور پر ملنگ بابا کے کردار میں پیش کیا۔ منفی کرداروں میں پران کا وہ عروج کا زمانہ تھا، مگر ملنگ بابا کے کردار میں پران نے کچھ اِس طرح سے پران ڈالے کہ وہ فلم آج بھی صرف ملنگ بابا کے کردار کی وجہ سے ہی یاد کی جاتی ہے۔

فلم ''اُپکار'' سے پران کا ایک نیا فلمی سفر شروع ہوتا ہے۔ اس کے بعد انہوں نے کئی فلموں میں کریکٹر ایکٹر کے بطور ہی کردار نبھائے اور اپنے فن کی بلندیوں سے فلم بینوں کی توجہ حاصل کرتے رہے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہی کہا جائے گا کہ فلم ''اُپکار'' سے پران صاحب کا ویلن رخصت ہو رہا تھا اور اسی فلم میں پریم چوپڑہ نام کا ویلن اپنی زندگی کا ایک اہم کردار ادا کر رہا تھا۔ بعد میں پریم چوپڑہ نے کافی عرصہ تک کامیابی کے ساتھ فلموں میں ویلن کے کردار ادا کیے اور پران صاحب آہستہ آہستہ کریکٹر آرٹسٹ بنتے چلے گئے۔

۱۹۶۸ء میں پران کی کئی کامیاب فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں، اُن میں ''سادھو اور شیطان، کہیں دن کہیں رات، برہمچاری، آدمی'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۶۹ء میں ''سچائی، ننہا فرشتہ، بھائی بہن، انجانا'' اور ''آنسو بن گئے پھول'' جیسی فلموں سے پران نے اپنی مقبولیت اور شہرت کو برقرار رکھا۔ ۱۹۷۰ء میں ''یادگار، سماج کو بدل ڈالو، پورب اور پچھم، ہمجولی، گنوار، بھائی بھائی، کب کیوں اور کہاں، ہیر رانجھا، تم حسیں میں جواں'' اور ''جونی میرا نام'' جیسی کامیاب فلموں میں پران کی فنکارانہ صلاحیتوں سے چار چاند لگے۔ آج بھی ہیر رانجھا کے کردار لنگڑے چاچا کو کون بھول پایا ہے جو ہیر کو صرف اس لیے زہر کھلا دیتا ہے تاکہ وہ زندہ حالت میں رانجھا کو حاصل نہ ہو سکے۔ ۱۹۷۱ء سے ۱۹۷۳ء کے درمیان پران کی کئی فلموں نے بڑی کامیابی حاصل کی۔ ان میں ۱۹۷۱ء میں ''نیا زمانہ، جوالا، گڈی (مہمان اداکار)، گنگا تیرا پانی امرت'' اور ''ادھیکار'' قابل ذکر ہیں۔ ۱۹۷۲ء میں ''یہ گلستاں ہمارا، ایک بیچارہ، بنیاد، آن بان، روپ تیرا

مستانہ، وکٹوریہ نمبر ۲۰۳'' اور ''جنگل میں منگل'' قابل ذکر ہیں۔ فلم ''وکٹوریہ نمبر ۲۰۳'' میں اشوک کمار کے ساتھ پران نے بہترین کامیڈی پیش کی اور فلم ''جنگل میں منگل'' میں پہلی بار پران نے ڈبل رول ادا کیا تھا۔ ۱۹۷۳ء میں مشہور و مقبول ہدایتکار پرکاش مہرہ نے فلم ''زنجیر'' میں امیتابھ بچن کے مقابل پران کو ایک نیا گیٹ اَپ دے کر شیر خان کے کردار میں پیش کیا۔ اس فلم کو فلمی شائقین نے شیر خان کے کردار کی وجہ سے بار بار دیکھا اور اداکار امیتابھ بچن کو یہ فلم پران کی سفارش پر ہی ملی تھی، اسی فلم سے امیتابھ کی فلمی زندگی کا سفر بلندیوں تک کے لیے جاری ہوا تھا۔ فلم ''رکشہ والا، پانچ دشمن، انصاف، غدار، ایک مٹھی آسمان، ایک کنوارہ ایک کنواری، دھرما، گوپی، جھیل کے اُس پار، جگنو، جوشیلا'' اور راجکپور کی ''بابی'' فلمیں بھی اسی سال ریلیز ہوئیں، جن میں پران نے اپنے مختلف کرداروں سے فلم بینوں کے دلوں پر اپنی چھاپ چھوڑی۔ پران فلمی دُنیا کے ایسے اکیلے اداکار تھے جنھوں نے ایک ہی خاندان کی تین نسلوں، پرتھوی راجکپور، راجکپور اور رشی کپور کے ساتھ کام کیا ہے۔ ۱۹۷۲ء سے ۱۹۹۹ء تک پران نے تقریباً ایک سو اٹھاون فلموں میں مختلف قسم کے کردار ادا کیے۔ اُن کی شہرت اور مقبولیت اس درمیان یکساں طور پر برقرار رہی۔ پران چاہتے تھے کہ وہ مرتے دم تک فلموں میں کام کرتے رہیں۔ مگر بڑھتی عمر کے ساتھ اب اُن کی طبیعت خراب رہنے لگی تھی۔ ۲۰۰۲ء میں فلم ''تم جیو ہزاروں سال''، ۲۰۰۳ء میں فلم ''ایک ہندوستانی'' اور ۲۰۰۷ء میں پران نے فلم ''دوش'' میں کام کیا۔

آزادی کے بعد فلم ''ضدی'' سے پران کو ویلن کے طور پر جو کامیابی ملی تھی، اس کے بعد ۱۹۴۹ء میں ''بڑی بہن'' کے بعد اُن کو لگاتار ویلن کے رول ملنے لگے۔ ۱۹۵۰ء سے ۱۹۶۰ء تک کے زمانے کے تمام بڑے ہیرو جیسے دلیپ کمار، دیوآنند اور راج کپور کے ساتھ پران کو فلموں میں نیگیٹو رول ملتے رہے۔ انہوں نے کئی بڑے ہدایت کاروں کے ساتھ کام کیا۔ ایم۔ وی۔ رامن، نانا بھائی بھٹ، کالی داس، دیوآنند دیو، آئی۔ ایس۔ جوہر، بمل رائے جیسے ہدایت کار پران کو بار بار اپنی فلموں میں لے رہے تھے۔

اس کے ساتھ ہی ساٹھ کی دہائی میں ہی پران اپنے زمانے کے دوسرے بڑے ہدایت کاروں کی پسند رہے۔ اے۔ بھیم سنگھ، شکتی سامنت، بھپی سونی، کے۔ امرناتھ، ناصر حسین اور دوسرے ہدایتکار اُن کو اپنی فلموں میں لے رہے تھے۔ ستر کی دہائی میں کئی نئے فلمسازوں اور ہدایتکاروں نے پران کو اپنی فلموں کے لیے سائن کیا، اور یہی وہ زمانہ تھا جب پران کئی بڑے اداکاروں سے بھی زیادہ معاوضہ لے رہے تھے۔ یہ سلسلہ ۱۹۶۸ء سے ۱۹۸۹ء تک قائم رہا۔

پران ایک نہایت شریف النفس قسم کے انسان تھے۔ اُن کی زندگی میں کبھی کوئی اسکینڈل سامنے نہیں آیا۔ وہ انتہائی رحمدل اور مخیّر انسان ہونے کے ساتھ ساتھ ایک ایماندار آدمی تھے۔ پران صاحب جتنے اعلیٰ درجے کے اداکار تھے، اُس سے بھی کہیں زیادہ اعلیٰ درجے کے انسان تھے۔ یہاں اُن کی ایمانداری کا ایک واقعہ بتانا ضروری سمجھتا ہوں۔ ۱۹۷۲ء میں کمال امروہی کی فلم ''پاکیزہ'' بے حد کامیاب ہوئی اور اس کے موسیقی ریز نغموں نے چلتے ہوئے لوگوں کے قدموں کو روک کر اپنے آپ سننے پر مجبور کر دیا تھا۔ مگر اس فلم کی موسیقی کے لیے موسیقار غلام محمد کو فلم فیئر ایوارڈ نہیں دیا گیا تھا، بلکہ اس سال کے لیے فلم ''بے ایمان'' کو بہترین موسیقی کا ایوارڈ دیا گیا تھا۔ پران صاحب کو یہ بات بہت ناگوار گزری۔ اُسی فلم کے لیے پران صاحب کو بھی بہترین سپورٹنگ ایکٹر کا ایوارڈ دیا گیا، مگر پران صاحب نے احتجاجاً ''بے ایمان'' فلم کے لیے فلم فیئر ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا۔ ایسے تھے پران صاحب۔

پران صاحب کو ہندی نہیں آتی تھی، بلکہ وہ اپنے مکالمے اردو میں لکھوا کر لیا کرتے تھے۔ اردو شاعری کے پران صاحب بہت شیدائی تھے اور لوگوں کو نجی ملاقاتوں میں اردو کے اشعار سنایا کرتے تھے۔ اُن کا تلفظ بہت عمدہ تھا جو اُن کے مکالموں کی ادائیگی میں بہت مددگار ثابت ہوتا تھا۔

دلیپ کمار سے پران کا بہت خاص تعلق تھا۔ جب دلیپ کمار کی شادی سائرہ بانو سے ہوئی تو پران کسی فلم کی شوٹنگ کے سلسلے میں سری نگر میں تھے۔ شادی کی خبر سن

کر وہ خاص طور پر ہوائی جہاز سے دہلی ہوتے ہوئے بمبئی پہنچے اور عین نکاح کے وقت شادی میں شریک ہوئے اور دولہا بنے ہوئے دلیپ کمار کو گلے سے لگا لیا۔ پران صاحب دلیپ کمار سے عمر میں صرف تین برس بڑے تھے۔

پران نے تقریباً ساٹھ برس تک ہندوستانی سنیما پر اپنا ایک خاص مقام بنائے رکھا۔ انہوں نے منفی کردار اتنی خوبصورتی سے ادا کیے کہ لوگ اُن کرداروں سے نفرت کرتے تھے، مگر اُن کے ادا کرنے والے پران سے محبت کرتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں نے اپنے بچوں کا نام پران رکھنا چھوڑ دیا تھا مگر جب کوئی فلم ریلیز ہوتی تھی تو ایک دوسرے سے پوچھتے تھے کہ اس فلم میں غدار کون ہے؟ یا......'' اور پران'' کا نام پڑھ کر فلم دیکھنے ضرور جاتے تھے۔

پران صاحب کی سوانح مشہور صحافی بنی روبن نے تحریر کی ہے جس کا عنوان ہے ''اینڈ پران''۔ چونکہ فلم کی پبلسٹی میں سب اداکاروں کے نام کے آخر میں پران صاحب کا نام ''اینڈ پران'' لکھا ہوتا تھا۔ اُن کے ایک مداح نے سمجھا کہ ''اینڈ'' پران صاحب کا سرنیم ہے، لہٰذا اُن کو اینڈ پران کے نام سے مخاطب کر کے ایک تعریفی خط لکھا۔ پران صاحب کو اپنے فین کی یہ ادا بڑی پسند آئی اور انہوں نے خاص طور پر اپنی سوانح کا عنوان ''اینڈ پران'' ہی تجویز کیا تھا۔

پران صاحب کو اپنی تقریباً پینسٹھ سالہ فلمی زندگی میں کئی بار اعزازات سے نوازا گیا۔ اُنہیں تین بار بہترین معاون اداکار کے طور پر فلم ''اُپکار، آنسو بن گئے پھول'' اور ''بے ایمان'' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ تین بار اُن کو بنگال فلم جرنلسٹ ایسوسی ایشن کے ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۱ء میں پران صاحب کو حکومت ہند کی طرف سے اُن کی کل فلمی خدمات کے لیے پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ اپریل ۲۰۱۳ء میں حکومت ہند کا سب سے بڑا فلمی اعزاز ''دادا صاحب پھالکے ایوارڈ'' سے پران کو نوازا گیا اور اُن کی علالت کی وجہ سے یہ ایوارڈ خود انفارمیشن منسٹر نے اُن کی رہائش گاہ پر جا کر پیش کیا۔ ۱۹۹۷ء میں فلم فیئر کی طرف سے پران صاحب کو لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے

نوازا گیا۔ ۲۰۱۰ء میں مہاراشٹر حکومت کے ڈپٹی چیف منسٹر چھگن بھج بل نے دادا صاحب پھالکے اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا۔ اس کے علاوہ مختلف اداروں کی طرف سے پران صاحب کو تقریباً ۲۰ر مختلف قسم کے اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔

پران کی خواہش تھی کہ وہ کسی فلم میں چانکیہ کا کردار ادا کریں، مگر اُن کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ پران صاحب کافی عرصہ سے بیمار تھے۔ ۹۳ر برس کی عمر میں ۱۲ر جولائی ۲۰۱۳ء کی شام انہوں نے ممبئی کے لیلاوتی اسپتال میں زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ اُن کے ورثاء میں بیوی کے علاوہ دو بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ فلمی دنیا میں اداکار تو بہت سے آئیں گے مگر پران جیسا بہترین اداکار اور ساتھ ہی بہترین انسان شاید اب ہماری فلمی دنیا کو کبھی میسر نہ آئے۔

OO

رامانند ساگر

کبھی کبھی انسان کی زندگی میں عجیب وغریب واقعات ہو جاتے ہیں، جو اُس کی زندگی کے رُخ کو یکسر موڑ دیتے ہیں۔ انسان چاہتا کچھ ہے اور ہو کچھ اور ہی جاتا ہے۔ زندگی میں انسان کچھ بننا چاہتا ہے اور بن کچھ اور ہی جاتا ہے۔ اس بات کو یوں بھی کہا جا سکتا ہے کہ قدرت جب کسی انسان سے کوئی کام لینا چاہتی ہے تو اُس کے لئے ویسے ہی اسباب پیدا کر دیتی ہے۔ ہماری فلمی دنیا میں بھی کئی لوگ ایسے ہیں جو زندگی میں کچھ اور ہی کرنا چاہتے تھے مگر قدرت نے اُن کو اِس روشنی بھری جگمگاتی دنیا میں پہنچا دیا۔ مگر انہوں نے یہاں بھی اپنی صلاحیتوں اور قابلیت سے کامیابی اور شہرت کے جھنڈے گاڑ دیے۔

ایسی ہی ایک ہمہ جہت شخصیت تھے فلمساز، اسکرین پلے رائٹر اور مکالمہ نگار رامانند ساگر۔

رامانند ساگر کے آباواجداد اصلاً پیشاور کے رہنے والے تھے۔ لاہور کے قریب گاؤں ''اصل گروکے'' میں ۲۹ر دسمبر ۱۹۱۷ء کو جب رامانند ساگر کا جنم ہوا تو اُن کا نام چندر مولی رکھا گیا۔ ان کے والد دِینا ناتھ چوپڑا، تجارت کے سلسلے میں نقلِ وطن کر کے کشمیر آ گئے تھے۔ حالانکہ وہ ایک کامیاب تاجر تھے، مگر ادبی ذہن رکھتے تھے اور شعر وشاعری کا بھی شوق تھا۔ وہ تاجؔ پشاوری کے نام سے اشعار کہتے تھے اور پسند کئے جاتے تھے۔ ادبی ذوق رامانند ساگر کو اپنے والد تاجؔ پشاوری سے وراثت میں ملا تھا۔ رامانند ساگر ابھی بہت چھوٹے تھے کہ اُنہیں رشتہ کی ایک بے اولاد دادی نے گود لے

لیا اور اُن کی پرورش والدین سے دُور رہ کر ہوئی، یہی وجہ تھی کہ وہ بچپن سے ہی بہت جذباتی تھے۔ اُنہوں نے صرف سولہ برس کی عمر میں پہلی کہانی ''پریتم پرتیکشا'' لکھی، جو شری پرتاپ کالج میگزین میں شائع ہوئی۔ اس وقت بہت کم لوگوں کو یقین آیا کہ یہ صرف سولہ برس کے لڑکے کی لکھی کہانی ہے۔ اِس کہانی میں بڑا درد تھا اور پھر انہوں نے مسلسل لکھنا شروع کر دیا۔ شروع میں وہ رامانند چوپڑہ کے نام سے لکھتے تھے۔ بعد میں رامانند بیدی اور پھر رامانند ساگر کے نام سے انہوں نے لکھنا شروع کیا اور آخر تک اِسی نام سے لکھتے رہے۔

رامانند ساگر کی ابتدائی زندگی بہت جدوجہد بھری تھی۔ انہوں نے ایک چپراسی کے طور پر کام شروع کیا، ٹرک کلینر بنے، صابن بیچا اور ایک سُنار کی دُکان پر بھی ملازمت کی۔ انہوں نے کبھی بھی محنت سے منہ نہیں موڑا، نہ کسی کام کو چھوٹا سمجھا، اور کسی بھی جائز کام کو کرنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی، اور اپنی تعلیم کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ زندگی کی جدوجہد کے زمانے میں بھی وہ لکھتے رہے اور شائع بھی ہوتے رہے۔

رامانند ساگر کا فلموں سے سب سے پہلا تعلق تب ہوا، جب انہوں نے ۱۹۳۶ء میں ایک خاموش فلم Raiders of the Rail Road میں Clapper Boy کے بطور کام کیا۔ اس کے بعد ۴۰-۱۹۴۱ء میں فلم ''کوئل'' میں مرکزی کردار ملا اور فلم کرشنا میں ''ابھی منیو'' کا کردار ادا کرنے کا بھی موقع ملا۔ مگر یہ سب فلمیں دورانِ تکمیل ہی ڈبوں میں بند ہوگئیں۔ زندگی کی اسی جدوجہد کے زمانے میں انہوں نے پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں منشی فاضل اور پھر سنسکرت میں ڈگری حاصل کی اور دونوں مضامین میں گولڈ میڈل بھی حاصل کیے۔

رامانند ساگر نے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز لاہور کے ''ڈیلی پرتاپ'' اور ''ڈیلی ملاپ'' اخباروں میں نیوز ایڈیٹر کے بطور شروع کیا تھا۔ انہوں نے تقریباً ۳۲ مختصر کہانیاں لکھیں اور اسٹیج پلے اور قسط وار طویل کہانیاں بھی لکھتے رہے۔ اُن ہی دِنوں ایک معروف رسالے ''آداب مشرق'' میں اُن کا ایک قسط وار افسانہ ''ایک ٹی۔ بی پیشنٹ کی

ڈائری'' شائع ہوکر مقبول ہو رہا تھا۔ اِس افسانے سے متاثر ہوکر مشہور ادیب کرشن چندر نے انہیں مبارکبادی کا خط لکھا اور بمبئی آکر فلموں کے لئے لکھنے کا مشورہ بھی دیا۔ مشہور فلمساز وہدایتکار محبوب خان نے بھی رامانند ساگر کی تحریروں کو پڑھ کر اُنہیں فلموں کے لئے لکھنے کا مشورہ دیا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ہندوستان کی آزادی کی تحریک زوروں پر تھی اور ملک فرقہ واریت کے شکنجہ میں پوری طرح جکڑا ہوا تھا۔ ایسے پُرآشوب دور میں رامانند ساگر تقسیم وطن کے وقت دہلی آگئے۔ اُس وقت اُن کے پاس صرف پانچ آنے اور چند کہانیوں اور افسانوں کا سرمایہ تھا۔ وہ ملک کی تقسیم اور اس کے نتیجہ میں ہونے والی خونریزی اور انسان کی بربادی سے بے حد دل برداشتہ تھے۔ ایسے ہی دور میں انسان اور انسانیت کی ناقدری کے پس منظر میں انہوں نے ایک ناول ''اور انسان مر گیا'' تحریر کیا، جو بے حد پسند کیا گیا۔ یہ ناول انہوں نے اپنی بیوی لیلاوتی کو معنون کیا تھا۔ اس ناول کا انگریزی ترجمہ ۱۹۸۸ء میں شائع ہوا۔

دہلی آنے کے بعد انہوں نے کچھ دن اردو صحافت میں گزارے اور کرشن چندر وغیرہ کے مشورے پر ممبئی کے لئے روانہ ہو گئے۔ اداکار بجن کے ساتھ ملاڈ علاقے میں اُن کے ٹریسا وِلا میں رامانند ساگر نے رہائش اختیار کی اور پرتھوی راج کپور کے ''پرتھوی تھیئٹر'' کے لئے لکھنا شروع کیا۔ انہوں نے جنگ اور امن کے موضوع پر ایک ڈرامہ تحریر کیا جس کو پرتھوی راج نے خود پلے کیا۔

۱۹۴۹ء میں انہوں نے راجکپور کے لئے فلم ''برسات'' کی کہانی اور سکرین پلے تحریر کیا۔ فلم کامیاب ہوئی اور اس کے ساتھ ہی رامانند ساگر کو بطور کہانی کار شہرت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد انہوں نے ایس۔ ایس۔ واسن کی تقریباً پانچ فلموں کی کہانی اور سکرین پلے لکھنے کا کام سنبھالا اور وہ کچھ عرصہ کے لئے مدراس چلے گئے۔ ان میں ایک فلم دلیپ کمار، وجینتی مالا کی ''پیغام'' بھی تھی۔ ۱۹۵۷ء میں فلم ''پیغام'' کے لئے رامانند ساگر کو بہترین مکالمہ نگار کا فلم فیئر ایوارڈ پیش کیا گیا۔ یہیں سے ان کی فلمی زندگی

کا سنہری دور شروع ہوا۔ اِسی زمانے میں انہوں نے فالی مستری کی فلم ''جان پہچان'' کی کہانی بھی لکھی۔

۱۹۵۰ء میں رامانند ساگر نے اپنا ذاتی پروڈکشن ہاؤس ''ساگر آرٹس'' قائم کیا اور ۱۹۵۳ء میں فلم ''مہمان'' بنائی۔ اس فلم کی نہ صرف کہانی، منظرنامہ اور مکالمے رامانند ساگر نے لکھے بلکہ پہلی بار ہدایتکاری بھی کی تھی۔ اس طرح ساگر آرٹس کے بینر سے ۱۹۵۰ء سے ۱۹۸۴ء تک انہوں نے تقریباً پچیس فلموں کی تخلیق کی، اِن میں سے تقریباً پندرہ فلمیں باکس آفس پر کامیاب رہیں۔ اداکار راجندر کمار کے ساتھ اُن کی فلموں ''آرزو''، ''ہمراہی''، ''گیت''، ''زندگی'' اور ''للکار'' نے پردۂ سیمیں پر سلور جوبلی منائی۔ اسی طرح اداکار دھرمندر کے ساتھ ان کی تین فلمیں ''آنکھیں، للکار'' اور ''چرس'' بے حد کامیاب ثابت ہوئیں۔ فلم ''آنکھیں'' نے جاسوسی فلموں کی تاریخ میں ایک نئے انداز کے دَور کا آغاز کیا اور اس فلم نے ڈائمنڈ جوبلی منائی۔ فلم ''چرس، پیارا دشمن، بغاوت'' اور ''رام بھروسے'' نے بھی سلور جوبلی منائی۔ اس طرح شہرت اور مقبولیت دونوں ہی رامانند ساگر کے حصے میں آئیں اور اپنی قابلیت اور شہرت کی وجہ سے ہی رامانند ساگر کو ۲۰۰۱ء میں حکومت ہند کی طرف سے پدم شری اعزاز سے نوازا گیا۔ ۱۹۹۶ء میں ان کو ہندی ساہتیہ سمیلن، پریاگ کی طرف سے ''ساہتیہ واچسپتی'' یعنی ڈاکٹر آف لٹریچر کے اعزاز سے نوازا گیا اور ۱۹۹۷ء میں جموں یونیورسٹی کی طرف سے رامانند ساگر کو اعزازی طور پر ڈاکٹریٹ کی ڈگری سے نوازا گیا۔

رامانند ساگر کی ایک خاص بات یہاں بیان کرنا ضروری محسوس ہوتا ہے۔ وہ یہ کہ جب ان کی کوئی فلم نمائش کے لئے پیش کی جاتی تھی تو وہ خود مختلف علاقوں میں عام آدمی کے ساتھ بیٹھ کر فلم دیکھا کرتے تھے تاکہ فلم کے تعلق سے عام آدمی کے تاثرات اُن کو مل سکیں اور وہ آئندہ اپنی فلموں میں عوام کی پسند اور ناپسند کو ملحوظ رکھ سکیں۔ اسی طرح فلم ''آرزو'' کی نمائش کے بعد رامانند ساگر بنگال کے دورے پر تھے۔ ایک ٹورنگ ٹاکیز میں فلم ''آرزو'' چل رہی تھی۔ جب رامانند ساگر وہاں پہنچے تو وہاں کے

منیجر نے بتایا کہ ایک شخص بلاناغہ ان کی فلم ''آرزو'' دیکھنے آتا ہے اور سنیما میں بیٹھ کر روتا رہتا ہے۔ میں اس سے پیسے بھی نہیں لیتا۔ اگر آپ تھوڑی دیر رُک جائیں تو میں اس شخص سے آپ کو ملوانا چاہوں گا۔ رامانند ساگر رُک گئے اور کچھ دیر بعد ہی ایک شخص بیساکھیوں کے سہارے کھٹ کھٹ کرتا ہوا وہاں آیا۔ یہ شخص نہ صرف خوبصورت تھا، بلکہ جوان بھی تھا۔ جب منیجر نے رامانند ساگر کو اس شخص سے ملوایا تو اُس نے ساگر صاحب کے پیر چھوئے اور درد بھری آواز میں بتایا کہ آپ کی فلم سے مجھے نئی طرح سے زندگی جینے کا حوصلہ ملا ہے۔ آپ نے میری اندھیری زندگی میں روشنی پھیلائی ہے اور اب میں اپنی محبوبہ سے بھی نظریں ملانے کے قابل ہو گیا ہوں۔ میں آپ کی فلم کا جیتا جاگتا کردار ہوں۔ آپ نے جو ایک معذور انسان کی زندگی کے مسائل کا حل اپنی فلم میں دیا ہے، اسی کی وجہ سے آج میں زندہ ہوں۔ اس شخص نے ایک نوٹ پر یادگار کے طور پر رامانند ساگر سے دستخط لئے اور شکریہ ادا کیا۔ رامانند ساگر نے اُسے گلے لگایا اور وہ کھٹ کھٹ کرتا ہوا بیساکھیوں کے سہارے واپس چلا گیا۔

رامانند ساگر نہ صرف ایک نیک دل انسان تھے بلکہ وہ ہمیشہ وقت کے ساتھ چلنے والوں میں سے تھے۔ جس وقت وہ فلم چرس کی شوٹنگ کے لئے فرانس گئے تو وہاں انہوں نے ٹی۔وی سیریل کی مقبولیت کو پہچانا اور پھر ہندوستان واپس آکر انہوں نے ۱۹۸۵ء میں ہندوستانی ٹی۔وی اسکرین کو ''وکرم بیتال'' جیسا سیریل پیش کیا۔ اس کے بعد ''دادا دادی کی کہانیاں'' اور پھر ان کا طویل اور بے حد مقبول سیریل ''رامائن'' شروع ہوا۔ یہ ایک طرح سے پہلی فلمی فیملی تھی جو چھوٹے اسکرین پر اپنی دھاک جمانے میں کامیاب ہوئی۔ اس کے بعد رامانند ساگر کے کئی ٹی۔وی سیریل ''شری کرشنا''، ''الف لیلیٰ''، ''جے گنگا میّا''، ''گروکل'' اور ''آنکھیں'' بڑی کامیابی کے ساتھ دکھائے جاتے رہے۔ وہ چاہتے تھے کہ ان کے سیریل جنوبی ہند کی زبانوں میں ٹیلی کاسٹ ہوں۔ اس کے لئے انہوں نے اشوک نگر میں ایک ڈبنگ اسٹوڈیو قائم کیا۔ انہوں نے بڑودہ کے پاس غیر آبادی والے علاقے میں ایک بڑی سی جگہ خرید کر اس میں چھوٹے چھوٹے

Hut اور Cottage بنائے، جہاں وہ سکون سے اپنی سکرپٹ پر کام کر سکتے تھے۔ وہاں انہوں نے اپنے کئی سیریلوں کی شوٹنگ بھی کی۔ ان کے اداکاروں اور تکنیکی لوگوں کو بھی وہاں کام کرنے میں بڑا مزا آتا تھا اور وہ خود بھی سب کا خیال رکھتے تھے۔ رامانند ساگر کو اکثر فرصت کے اوقات میں بھی وہاں قیام کرنے میں بڑی راحت کا احساس ہوتا تھا۔ بعد میں ان کا ایک بڑا ٹی۔وی سیریل ''سائیں بابا'' بھی کامیابی کے ساتھ دکھایا گیا۔ بالمیکی اور تلسی داس کے بعد سب سے مقبول رامائن رامانند ساگر نے ہی پیش کی ہے۔

رامانند ساگر نے نہ صرف اپنی فلموں سے بلکہ اپنی نجی زندگی اور ٹی۔وی سیریل کے ذریعہ ہندوستانی عوام کو ایک مثالی سماج اور بہترین کردار سازی کی ترغیب دی ہے۔

۱۳؍دسمبر کی رات کو ایک لمبی بیماری کے بعد ۸۷؍ برس کی عمر میں رامانند ساگر نے اپنے خالق حقیقی کو لبیک کہا اور پوری فلمی دنیا کو ایک بہترین کہانی کار، منظرنامہ نگار اور مکالمہ نگار سے محروم ہونا پڑا۔ رامانند ساگر کا چار ماہ قبل ہی آپریشن ہوا تھا اور وہ تبھی سے صاحبِ فراش تھے۔ اُن کے وارثوں میں اہلیہ لیلاوتی کے علاوہ پانچ بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ اُن کے انتقال سے نہ صرف فلمی دُنیا نے بلکہ اُردو دُنیا نے بھی ایک دردمند مصنف کھودیا ہے۔

OO

شنکر

ایک وقت تھا جب شنکر کی اپنی کوئی پہچان نہ تھی۔ یہ اُن دنوں کی بات ہے جب ۱۹۴۹ء میں کھیم چند پرکاش کی موسیقی سے آراستہ بمبئی ٹاکیز کی فلم ''محل'' ریلیز ہوئی تھی۔ ان دنوں شنکر اور جے کشن پرتھوی تھیئٹرز میں معمولی سازندے کے طور پر کام کرتے تھے۔ کمال امروہی کی ہدایت میں بنی اس فلم ''محل'' کے پریمئر پر شنکر اور جے کشن تمام مدعوین میں بیٹھے ہوئے تھے۔ کسے پتا تھا کہ آج جو عام تماشائی کے طور پر فلم ''محل'' کے سحر طراز میوزک کو سراہنے آئے ہیں، کل ہندوستان بھر میں ان کے سحر آفریں سنگیت کا جادو گونجے گا۔ ان دنوں آر۔ کے۔ فلمز کا وجود عمل میں آچکا تھا اور ''برسات'' کی تکمیل کے چرچے چل رہے تھے۔ راج کپور نے ''برسات'' کے میوزک کے لئے شنکر جے کشن کا نام چنا۔ اس کے بعد تو ان دونوں موسیقاروں کا نام کپور خاندان سے وابستہ ہو گیا۔ دونوں راج کپور اور نرگس کے ساتھ فلم ''آوارہ'' کی ریلیز کے موقع پر سوویت یونین بھی گئے۔

کاروباری طور پر شنکر اور جے کشن دونوں ہی ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ تھے اور آخر تک ان کے کاروباری رشتے قائم رہے، لیکن یہ بات بھی کسی سے پوشیدہ نہیں کہ کئی ایک معاملات میں دونوں میں زبردست اختلافات تھے۔ یہ بھی بہت کم لوگوں کے علم میں ہے کہ شنکر جے کشن نے کبھی بھی باہمی تعاون کے ساتھ مل جل کر میوزک کمپوز نہیں کیا۔ مختصراً یہ کہ دونوں الگ الگ نغموں کی الگ الگ دھنیں ترتیب دیتے تھے۔ حالات یہاں تک پہنچ گئے تھے کہ ایک موسیقار دوسرے کے گانے کی ریکارڈنگ کے وقت موجود نہیں ہوتا تھا۔

شنکر کے کیریئر کا ایک افسوس ناک پہلو لتا منگیشکر کے ساتھ ناچاقی ہے۔ اپنے کیریئر کے ابتدائی دور میں "برسات" اور "آوارہ" ایسی فلموں میں شنکر جے کشن کی ترتیب دی ہوئی دھنوں پر اپنی آواز کا جادو جگا کر لتا منگیشکر نے کافی شہرت حاصل کی تھی، لیکن جب شنکر نے شاردا کی سرپرستی کرنی شروع کر دی تو لتا نے اس کے بعد شنکر کے لئے گانے سے انکار کر دیا۔ جھگڑے کی وجہ چاہے کچھ اور ہو لیکن عام خیال یہی ہے کہ شنکر اور لتا کے تنازعہ کی اصل وجہ شاردا تھی۔ اگرچہ بعد میں شنکر اور لتا کے اختلافات کو ختم کرا دیا گیا تھا لیکن وہ پہلے والی بات کبھی بھی پیدا نہ ہو سکی۔

شنکر کو اسٹیج پروگرام پیش کرنے اور اسٹیج پر آنے، نیز شہرت حاصل کرنے کا بہت شوق تھا۔ اس کے برعکس خاموش طبع ہونے کی وجہ سے جے کشن کو پس منظر میں رہنا پسند تھا۔ شنکر کو زندگی بھر اس امر کا افسوس رہا کہ اسے پدم شری کے اعزاز سے نہ نوازا گیا۔ بتایا جاتا ہے کہ ایک دن شنکر ایک دوپہر کو ریہرسل روم میں گانے کی تیاریاں کر رہے تھے کہ اچانک ہی ایک چمچہ جس نے شنکر کے لئے کئی فلم فیئر ایوارڈز کا انتظام کرایا تھا، وہاں آیا اور بڑے فخر کے ساتھ سینے پر ہاتھ مار کر کہنے لگا کہ کام ہو گیا ہے...... لیکن اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا، شنکر نے اسے درمیان میں ہی ٹوک کر کہا......

"فلم فیئر ایوارڈ تو بہت ہو لئے، کچھ پدم شری کا چکر چلاؤ۔"

بتایا جاتا ہے کہ شنکر نے فیمس اسٹوڈیوز، مہالکشمی میں اپنے شاندار ریہرسل ہال کو ڈبنگ اور ریکارڈنگ تھیٹر بنا لیا تھا۔ اب شنکر کے بعد اس کی دیکھ بھال کون کرتا ہے اور اُسے کون چلاتا ہے، کہا نہیں جا سکتا۔ شنکر نے کبھی کسی ابھرتے ہوئے میوزک ڈائیریکٹر پر دستِ شفقت نہیں رکھا، اور نہ ہی کسی ہمعصر کے ساتھ گھلنے ملنے کی کوشش کی۔ شنکر کو دھنیں چرانے والے میوزک ڈائیریکٹرز سے سخت نفرت تھی اور شور شرابے والا ڈسکو میوزک بھی پسند نہیں تھا۔

شنکر کے چلے جانے کے بعد نوشاد، ایس۔ ڈی۔ برمن اور اس کے ساتھ شنکر جے کشن کے ایک لمبے دَور کا خاتمہ ہو گیا۔

OO

بیگم اختر

اُتر پردیش کا شہر فیض آباد صرف اس لیے ہی مشہور نہیں ہے کہ اجودھیا کا ضلع شہر ہے، بلکہ وہ دنیا بھر میں اپنی منفرد شناخت اس لیے بھی رکھتا ہے کہ ۷/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو اِسی فیض آباد شہر کے ایک متمول خاندان میں سُروں کی ملکہ بیگم اختر کی پیدائش ہوئی۔ اُس وقت اُن کا نام اختری بائی تھا۔ اُن کے والد اصغر حسین ایک نوجوان وکیل تھے، تبھی انہوں نے اپنی مرضی سے مشتری بائی سے دوسری شادی کی تھی۔ اُن کے والدین کیونکہ دقیانوسی خیالات کے نہیں تھے، لہٰذا کم عمری میں ہی اُن کے چچا کی کوششوں سے اختری بائی کو ہندوستانی کلاسیکی موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت مل گئی۔ فیض آباد کے محلّہ بڑا دروازہ میں اختری بائی کا بچپن گزرا، اور جب وہ تیرہ برس کی تھیں تو ۱۹۲۱ء میں اُن کی ماں مشتری بائی اُن کو لے کر صوبہ بہار کے شہر گیا چلی گئیں اور وہیں سے انہوں نے پٹنہ شہر کے سارنگی نواز استاد امداد علی خاں سے رابطہ کیا، تاکہ اُن کی بیٹی ساز اور آواز کی مکمل تعلیم حاصل کر سکے، مگر دو سال کے بعد ہی دونوں ماں اور بیٹی کو واپس فیض آباد آنا پڑا، اور بعد میں پٹیالہ تان رس گھرانے کے استاد عطا محمد خان اختری بیگم کے استاد بنے، جنہوں نے بڑے سخت ریاض کے ساتھ اختری بائی کو خیال، ٹھمری، دادرا اور چیتی میں تعلیم دے کر ہنرمند بنایا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہمارے معاشرے میں اس طرح کے گانے بجانے کو اچھی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا تھا اور خاص طور پر مہذب مسلم خاندانوں میں لڑکیوں کے اس طرح کا فن سیکھنے کو بڑا معیوب تصور کیا جاتا تھا۔ اختری بائی کی والدہ مشتری بائی کی خواہش تھی کہ ان کی

بیٹی اختری بائی ہندوستانی کلاسیکل موسیقی اور گائیکی میں پختہ ہو جائے، تاکہ وہ کسی گھرانے اور گائیکی میں نام پیدا کرے۔

۱۹۲۷ء میں استاد عطا محمد خاں اور مشتری بائی نے اختری بائی کو کلکتہ لے جا کر ایک پروگرام میں پہلی بار غزل گوائی، جس کے بول تھے......

تونے بت ہرجائی کچھ ایسی ادا پائی
تکتا ہے تیری صورت ہر ایک تماشائی

اختری بائی نے صرف پندرہ برس کی عمر میں پہلی بار اسٹیج پر اپنی پرفارمنس سے لوگوں کو متاثر کر دیا تھا۔ ان کی غزل گائیکی نے شروعاتی دَور میں ہی کئی مشہور شاعروں کو متاثر کیا۔ بہار کے زلزلہ متاثرین کی مدد کے لیے کئے گئے ایک پروگرام میں بیگم اختر کی گائیکی کی سروجنی نائڈو نے بھی خوب تعریف کی۔ ۱۹۳۰ء میں اختری بائی کا پہلا ریکارڈ آتے ہی بہت مقبول ہوا۔ ایک روایت یہ بھی ہے کہ بہزاد لکھنویؔ کی غزل ''دیوانہ بنانا ہے تو دیوانہ بنا دے'' ریکارڈ میں گائی ہوئی اختری بائی کی پہلی غزل ہے۔ مگر یہ غلط ہے کیونکہ اس سے قبل ''تونے بُتِ ہرجائی، زبان عشق سے، وہ آرہے ہیں، صیاد نے قفس سے، وفاؤں کے بدلے، ہم کو نظر سے اپنی، خدا کی شان ہے، مزے بیتابیوں کے آرہے ہیں'' اور ''وفا وفا نہ سہی'' جیسی غزلیں ریکارڈ میں آچکی تھیں۔ اُن کا پہلا ریکارڈ میگافون ریکارڈ کمپنی نے بنایا اور پھر انہوں نے ۱۹۳۰ء میں بیگم اختر کی سریلی آواز میں غزلوں، ٹھمری اور دادرا کے کئی ریکارڈ ریلیز کیے۔ بیگم اختر نے اس کے بعد ۱۹۳۴ء میں ''انیتا'' اور ''ممتاز بیگم'' ۱۹۳۵ء میں ''جوانی کا نشہ'' اور ''نصیب کا چکر'' جیسی فلموں میں کام کیا اور اپنے گانے خود گائے۔

کلکتہ میں اپنی والدہ کے ساتھ رہتے ہوئے اختری بائی نے کئی فلموں میں اداکاری کے ساتھ ساتھ گلوکاری بھی کی۔ اس طرح اُن کی شہرت میں اضافہ ہوا اور پھر وہ لکھنؤ آگئیں، جہاں اُن کی ملاقات آرزو لکھنوی سے ہوئی اور انہوں نے آرزو لکھنوی کی کئی غزلیں گائیں۔ اب وہ کام کے سلسلے میں لکھنؤ سے ہی کلکتہ آیا جایا کرتی

تھیں۔ لکھنؤ میں آغا جانی کاشمیری بھی اختری بائی کی گائیکی سے بہت متاثر تھے۔ آغا جانی کاشمیری لکھنؤ سے بمبئی آئے اور فلمساز و ہدایتکار محبوب خان کے پروڈکشن ہاؤس سے وابستہ ہوئے تو انہوں نے اداکارہ کے طور پر اختری بائی کی تعریف فلمساز و ہدایتکار محبوب خان سے کی اور اُن کی سُریلی آواز کا بھی ذکر کیا۔ لہٰذا محبوب خان نے اختر بائی کو بمبئی بلا لیا اور اپنی فلم ''روٹی'' میں مرکزی کردار پیش کیا۔ حالانکہ اس فلم کے لیے اختر بائی کی آواز میں ۶ رغزلیں آرزو لکھنوی کی ریکارڈ کی گئی تھیں، مگر فلم میں تین غزلیں ہی استعمال کی گئیں۔ بعد میں میگافون کمپنی نے اختر بائی کی ۶ رغزلوں کا مکمل ریکارڈ ہی جاری کیا۔ محبوب خان کی فلم ''روٹی'' میں ہیروئن کا کردار ادا کرنے اور گیت گانے کے بعد اختر بائی لکھنؤ واپس آ گئیں۔

لکھنؤ میں ایک مشہور بیرسٹر اشتیاق احمد عباسی بھی رہتے تھے جو اصلاً رہنے والے فیض آباد ہی کے تھے، مگر اب وکالت کے سلسلے میں مستقل طور پر لکھنؤ میں سکونت پذیر تھے۔ ۱۹۴۵ء میں بیرسٹر اشتیاق احمد عباسی سے روایتی طور پر خاندانی تعلقات کی بنا پر اختری بائی کی شادی ہو گئی۔ لہٰذا اختر بائی کے گانے پر شادی کے بعد پابندی لگ گئی اور کئی برس انہوں نے کوئی کلام نہیں گایا۔ عباسی صاحب ایک نام چین اور خاندانی آدمی تھے اور ان کا خیال تھا کہ شریف خاندان کی بہو بیٹیوں کو گھروں سے باہر اس طرح کے کام نہیں کرنے چاہئیں۔ بلکہ گھر کے کاموں میں دلچسپی لے کر گھر بسانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس طرح اختر بائی اپنے گھر کو سجانے سنوارنے میں مصروف ہو گئیں اور اب ان کا نام اختر بائی سے بیگم اختر ہو گیا۔

۱۹۴۹ء میں بیگم اختر سخت بیمار ہوئیں اور کافی مہنگے علاج معالجے کے باوجود صحت مند نہیں ہو پا رہی تھیں۔ لہٰذا ان کے معالج نے مشورہ دیا کہ اگر ان کو دوبارہ سے گانے اور فنون لطیفہ سے متعلق مصروفیات کی اجازت دے دی جائے تو پھر سے صحت مند ہو سکتی ہیں۔ بیگم اختر مسلسل گھر کی چار دیواری میں رہنے کی وجہ سے اُداسی کا شکار ہو گئی تھیں۔ معالج کے مشورے پر اُن کے شوہر نے اُن کو پھر سے گانے اور

عوامی پروگراموں میں جانے کی اجازت دے دی اور اس طرح نفسیاتی علاج سے وہ دوبارہ صحت یاب ہو گئیں۔ ۱۹۴۹ء میں دوبارہ سے انہوں نے لکھنؤ ریڈیو اسٹیشن سے غزلیں گانے کے پروگرام دینے شروع کر دیے۔

بیگم اختر کی شہرت کو دیکھتے ہوئے ایک بار پھر اُن کو بطور اداکارہ کام کرنے کے لیے فلموں سے آفر آنے لگے۔ لہٰذا موسیقار مدن موہن کی سفارش پر ۱۹۵۳ء میں انہوں نے فلم ''دانا پانی'' اور ۱۹۵۴ء میں فلم ''احسان'' میں اداکاری بھی کی اور گیت بھی گائے۔ اس کے بعد ستیہ جیت رے کی بنگالی فلم ''جلسہ گھر'' میں ۱۹۵۸ء میں کام کیا۔

بیگم اختر کی غزل گائیکی میں ایک شفاف اور بندھی ہوئی سُریلی ریشمی آواز کا احساس ہوتا تھا۔ لہٰذا اُن کو ملکۂ غزل کے لقب سے یاد کیا جانے لگا۔ انہوں نے بیشتر غزلوں کی دُھنیں خود ہی ترتیب دیں اور مختلف راگوں کا استعمال کر کے اپنی گائیکی کو یادگار بنا دیا۔

اپنے شروعاتی دَور میں بیگم اختر نے بہزاد لکھنوی، مومن خاں مومنؔ اور اختر شیرانی کی غزلوں کو خاص طور پر گایا۔ بعد میں غالبؔ کی نو غزلیں گائیں۔ اِن کے علاوہ ذوقؔ، میرؔ، فیضؔ، شکیلؔ، شمیم جےپوری، فاخر یحییٰ اور کیفی اعظمی کی تخلیقات کو اپنی آواز سے نوازا۔

کئی فلموں کے علاوہ بیگم اختر نے چند ڈراموں میں بھی اداکاری کے جوہر دکھائے، جہاں اُن کو اونچی آواز میں اپنے مکالمے ادا کرنے ہوتے تھے۔ لہٰذا کئی کئی دن اُن کا گلا خراب رہتا تھا۔ انہوں نے جلد ہی ڈراموں میں کام کرنا بند کر دیا اور اپنی پوری توجہ کے ساتھ صرف گلوکاری کی طرف ہی دھیان لگاتا جاری رکھا۔ جلد ہی اُن کی غزل گائیکی اپنے عروج کو پہنچ گئی اور روز بہ روز اُن کی آواز میں نکھار آتا گیا۔ انہوں نے اپنی زندگی میں کئی مشہور اور مقبول شعراء کی غزلیں گائیں اور تقریباً چار سو سے زائد غزلیں اپنی آواز میں ریکارڈ کرائیں۔

ایک بار کا ذکر ہے کہ بیگم اختر بمبئی سے لکھنؤ کے لیے ٹرین سے روانہ ہونے

والی تھیں، اچانک وی۔ٹی۔ اسٹیشن پر نغمہ نگار شکیل بدایونی اُن سے ملنے آگئے اور چلتے وقت انہوں نے ایک پرچے پر اپنی غزل لکھ کر بیگم اختر کو دے دی۔ سرسری طور پر دیکھ کر اور بعد میں پڑھنے کے خیال سے انہوں نے پرچہ اپنے بٹوے میں رکھ لیا۔ اُسی ٹرین کے ڈبہ میں بیگم اختر نے شکیل بدایونی کی غزل کی دھن بنائی اور گنگنائی، جو آگے چل کر دونوں کی پہچان بن گئی۔ لکھنو پہنچ کر جب بیگم اختر نے پہلی بار یہ غزل آل انڈیا ریڈیو سے پڑھی تو پورے برصغیر میں سریلی غزل گائیکی کا ایک طوفان برپا ہوگیا۔ غزل تھی......

اے محبت تیرے انجام پہ رونا آیا......

احمد آباد کی ایک انجمن نے اکتوبر ۱۹۷۴ء میں بیگم اختر کے اعزاز میں ایک پروگرام منعقد کیا۔ اس کا عنوان تھا ''ایک شام بیگم اختر کے نام''۔ اس پروگرام میں انہوں نے ابھی ایک ہی غزل گائی تھی کہ اُن کی طبیعت خراب ہوگئی اور پروگرام درمیان میں ہی ملتوی کر دیا گیا۔ ہنگامی حالات میں بیگم اختر کو اسپتال میں داخل کیا گیا مگر ان کی حالت میں کوئی افاقہ نہ ہوا۔ مسلسل زندگی اور موت کی جنگ لڑنے کے بعد ۳۰ راکتوبر ۱۹۷۴ء کو بیگم اختر نے احمد آباد کے اُسی اسپتال میں داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملیں۔ بیگم اختر نے اپنی وفات سے قبل جو آخری غزل ریکارڈ کرائی تھی، وہ مشہور نغمہ نگار کیفی اعظمی کی یہ غزل تھی......

سنا کرو مری جاں اُن سے اُن کے افسانے
سب اجنبی ہیں یہاں کون کس کو پہچانے

بیگم اختر کو سنگیت ناٹک اکیڈمی ایوارڈ سے نوازا گیا اور حکومت ہند نے پہلے پدم شری اور بعد میں پدم بھوشن اعزاز سے سرفراز کیا۔ بیگم اختر کی آواز میں بلا کا جادو تھا۔ جب وہ اپنے پورے وجود کو ایک مرکز پر سمیٹ کر پورے دھیان سے غزل پڑھتی تھیں تو سامعین دم بخود رہ جاتے تھے اور لمحہ بھر کے لیے بھی اُن کی آواز سے توجہ نہیں ہٹا پاتے تھے۔ ایک خاص قسم کی لپک تھی بیگم اختر کی آواز میں۔ شاید اِسی لپک کے لیے

بہت پہلے مومن خاں مومنؔ نے یہ شعر کہا تھا......

اُس غیرت ناہید کی ہر تان ہے دیپک
شعلہ سا لپک جائے ہے آواز تو دیکھو

○○

من موھن دیسائی

ممبئی کے ایک گجراتی خاندان میں ۲۶ر فروری ۱۹۳۷ء کو من موہن دیسائی کا جنم ہوا۔ اُن کے والد کیکو بھائی دیسائی ہندی اسٹنٹ فلموں کے جانے مانے فلمساز تھے اور ممبئی میں اُن کا اپنا ''پیراماؤنٹ اسٹوڈیو'' تھا، جو بعد میں فلمالیہ اسٹوڈیو کے نام سے مشہور ہوا۔ کیکو بھائی دیسائی نے ''سرکس کوئن، گولڈ گینگ'' اور ''شیخ چلی'' جیسی کئی کامیاب فلمیں بنائی تھیں۔

من موہن دیسائی کی تعلیم زیادہ آگے نہ بڑھ سکی کیونکہ انہیں پڑھنے سے زیادہ کرکٹ کھیلنے میں دلچسپی تھی۔ لہٰذا انہوں نے گریجویشن سے پہلے ہی تعلیم ادھوری چھوڑ دی اور بابو بھائی مستری کے ساتھ ہدایتکاری کے گر سیکھنے لگے۔ من موہن دیسائی کے بڑے بھائی سبھاش دیسائی ۱۹۵۰ء میں ہی فلمسازی سے جڑ گئے تھے۔ لہٰذا سبھاش دیسائی نے ۱۹۶۰ء میں پہلی بار من موہن دیسائی کو اپنی فلم ''چھلیا'' کی ہدایت کاری سونپ دی۔

من موہن دیسائی کا نام سن کر فلم کے ہیرو راج کپور سوچ میں پڑ گئے اور سبھاش دیسائی سے کہنے لگے کہ کیا یہ لڑکا فلم کی ہدایت کاری سنبھال سکے گا؟ سبھاش دیسائی نے ایک تجویز یہ رکھی کہ کچھ دن شوٹنگ کر کے دیکھ لیتے ہیں۔ اگر بات نہ بنی تو ہدایتکار بدل لیں گے۔ راج کپور راضی ہو گئے اور فلم کا کام شرع ہو گیا۔ اس فلم میں راجکپور کی ہیروئن نوتن تھیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ من موہن دیسائی ذاتی طور پر راجکپور اور نوتن کے شیدائی بھی تھے۔ یہ فلم مکمل ہوئی اور ۱۹۶۰ء میں ریلیز کے بعد کافی

کامیاب ثابت ہوئی۔ اس طرح من موہن دیسائی کا پہلا قدم کامیاب ہوتے ہی انہوں نے دوڑنا شروع کر دیا۔ اس سے قبل ۱۹۵۴ء میں فلم ''تلسی داس'' کی کہانی وہ منو دیسائی کے نام سے لکھ چکے تھے اور ۱۹۵۷ء میں فلم ''جنم جنم کے پھیرے'' کا اسکرپٹ بھی انہوں نے اسی نام سے تحریر کیا تھا۔ ۱۹۵۹ء میں فلم ''بے درد زمانہ کیا جانے'' کے پروڈیوسر بھی منو دیسائی کے نام سے من موہن دیسائی ہی تھے۔

فلم ''چھلیا'' کی کامیابی میں دو گجراتی بھائیوں، کلیان جی آنند جی کے سنگیت کا بھی کافی دخل تھا۔ ''چھلیا'' فلم کا گانا...... ''ڈم ڈم ڈیگا ڈیگا، موسم بھیگا بھیگا......'' اُس زمانے میں کافی مقبول ہوا تھا۔ اس فلم سے ہدایت کار کے طور پر من موہن دیسائی کی فلم انڈسٹری میں پہچان قائم ہو گئی اور باہر کے لوگوں کی طرف سے بھی انہیں فلموں کی پیش کش ہونے لگی، مگر انہوں نے اپنے بڑے بھائی کی اگلی فلم ''بلف ماسٹر'' کی ہدایتکاری کرنا ہی مناسب سمجھا اور شمی کپور کے ساتھ سائرہ بانو کو ہیروئن لے کر بنائی گئی اس فلم کو ۱۹۶۳ء میں نمائش کے لیے پیش کر دیا۔ فلم ''بلف ماسٹر'' بھی اوسط کامیاب فلم رہی اور من موہن دیسائی ایک کامیاب ہدایتکار کے طور پر تسلیم کر لیے گئے۔

۱۹۶۶ء میں ورما برادرس کی فلم ''بدتمیز'' ریلیز ہوئی جس کی ہدایت منموہن دیسائی نے کی تھی۔ اس فلم میں ہیرو تو وہی تھے، ''بلف ماسٹر'' والے شمی کپور، مگر ہیروئن سائرہ بانو کی جگہ سادھنا تھیں۔ فلم کی موسیقی اور نغمے بھی اچھے تھے۔ لہٰذا یہ فلم خوب کامیاب ہوئی اور منموہن دیسائی کو اس فلم کی کامیابی سے کافی فائدہ ہوا۔ اب اُن کو باہر سے کافی آفر آنے لگے تھے۔ ایشیا فلمز والوں نے من موہن دیسائی کو ہدایتکار لے کر فلم ''قسمت'' بنائی۔ اس فلم میں ہیرو بسواجیت کے ساتھ قرینہ کپور کی والدہ ببیتا ہیروئن تھیں۔ ۱۹۶۸ء میں ریلیز اس فلم کے گانے کافی مقبول ہوئے۔ خاص طور پر او۔ پی۔ نیر کی موسیقی میں ''کجرا بریلی والا انکھیوں میں ایسا ڈالا'' گانا بے حد مقبول ہوا۔ اس طرح یہ فلم بھی من موہن دیسائی کی ایک اور کامیاب فلم ثابت ہوئی۔

حالانکہ من موہن دیسائی کو ۱۹۶۰ء میں فلم ''چھلیا'' کی ہدایت کاری سے ہی

کامیابی مل گئی تھی، مگر ان کا عروج کا زمانہ ۱۹۷۰ء سے شروع ہوتا ہے۔ انہوں نے راجکپور کو ذہن میں رکھ کر ایک فلمی کہانی لکھی تھی، مگر راجکپور عمر کے لحاظ سے اس کردار سے آگے نکل چکے تھے۔ اُن ہی دنوں راجیش کھنہ کی فلم ''راز'' بن رہی تھی۔ موسیقار کلیان جی کو من موہن دیسائی کی کہانی کا علم تھا۔ انہوں نے راجیش کھنہ کو من موہن جی کے پاس بھیجا۔ راجیش کھنہ نے جا کر من موہن جی سے کہانی سنی اور پسند کر لی۔ اس کہانی پر فلم ''سچا جھوٹا'' کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ من موہن دیسائی چاہتے تھے کہ ہیرو راجیش کھنہ راج کپور کے انداز میں ایکٹنگ کریں۔ انہوں نے ہدایت کار کی مرضی کے مطابق کام کیا۔ ۱۹۷۰ء میں جب یہ فلم ''سچا جھوٹا'' ریلیز ہوئی تو سپرہٹ ثابت ہوئی، اور یہیں سے راجیش کھنہ اور ممتاز کی جوڑی مقبول ہوئی۔ اس فلم میں راجیش کھنہ کا ڈبل رول تھا۔ فلم ''سچا جھوٹا'' سے من موہن دیسائی کی کامیابی کا جو سلسلہ شروع ہوا، وہ اُن کی آخری فلم ''مرد'' تک جاری رہا۔ ۱۹۷۲ء میں من موہن دیسائی کی تین فلمیں ''شرارت، رامپور کا لکشمن'' اور ''بھائی ہو تو ایسا'' ریلیز ہوئیں اور تینوں ہی کامیاب ثابت ہوئیں۔ ان میں سے دو فلمیں نڈیاڈ والا کی تھیں۔ فلم ''رامپور کا لکشمن'' میں رندھیر کپور کے ساتھ ریکھا ہیروئن تھیں اور فلم ''بھائی ہو تو ایسا'' میں جتندر کے ساتھ ہیما مالنی تھیں۔ رتن موہن کی فلم ''شرارت'' میں بسواجیت کے ساتھ ممتاز ہیروئن تھیں۔ اگلے برس پھر سے اے۔ کے۔ نڈیاڈ والا کی فلم ''آ گلے لگ جا'' کی ہدایتکاری من موہن دیسائی نے کی تھی اور اس فلم میں شمی کپور کے ساتھ شرمیلا ٹیگور ہیروئن تھیں۔ یہ فلم بھی کامیاب ثابت ہوئی۔ اگلے برس ۱۹۷۴ء میں ایک بار پھر من موہن دیسائی نے راجیش کھنہ اور ممتاز کی جوڑی کو دوہرایا اور فلم ''روٹی'' بنائی اور یہ فلم بھی کامیاب ثابت ہوئی۔

۱۹۷۷ء میں من موہن دیسائی کی لگاتار چار فلمیں ریلیز ہوئیں۔ اے۔ کے۔ نڈیاڈ والا کی فلم ''پرورش''، جس میں امیتابھ بچن اور ونود کھنہ کے ساتھ شبانہ اعظمی اور نیتو سنگھ ہیروئن تھیں۔ سبھاش دیسائی کی فلم ''دھرم ویر'' جس میں دھرمیندر اور جتندر کے ساتھ زینت امان اور نیتو سنگھ ہیروئن تھیں۔ اس فلم کی تمام اِنڈور اور آؤٹ ڈور شوٹنگ کمال

امروہی کے اسٹوڈ میں ہوئی تھی۔ ایم۔ ایم۔ ملہوترہ کی فلم ''چاچا بھتیجا'' جس میں دھرمندر اور رندھیر کپور کے ساتھ ہیما مالنی اور یوگیتا بالی ہیروئن تھیں۔ چوتھی فلم ''امر اکبر انتھونی'' تھی۔ اس فلم میں امیتابھ بچن اور ونود کھنہ کے ساتھ ایک نوجوان مسلم شاعر کے کردار میں رشی کپور کو پیش کیا گیا تھا۔ پروین بابی اور شبانہ اعظمی کے ساتھ نیتو سنگھ ہیروئن تھیں۔ یہ قومی ایکتا کے موضوع پر بڑے پیانے پر بنائی گئی ایک بے حد کامیاب فلم تھی۔فلم کی ہدایت کے ساتھ ساتھ فلم کے پروڈیوسر بھی خود من موہن دیسائی تھے۔فلم ''امر اکبر انتھونی'' فلمساز اور ہدایتکار کے طور پر من موہن دیسائی کی زندگی کا سب سے بڑا میل کا پتھر ثابت ہوئی۔ اس فلم کے گانے بھی بے حد مقبول ہوئے۔ خاص طور پر رشی کپور پر فلمائی گئی قوالی...... ''پردہ ہے پردہ'' اور فلم کا ٹائٹل سانگ ''ایک جگہ جب جمع ہوں تینوں، امر اکبر انتھونی'' بے حد مقبول ہوئے تھے۔ اس فلم سے من موہن دیسائی اور امیتابھ بچن کی جوڑی سدا کے لیے کامیابی کی ضمانت بن گئی۔

۱۹۷۶ء میں امیتابھ بچن نے سب سے پہلے فلمساز غفار اے۔ نڈیاڈ والا کی فلم ''پرورش'' میں من موہن دیسائی کی ہدایت میں کام کیا تھا۔ اس فلم کی تیاری کے دوران امیتابھ بچن کے ڈسپلن اور ان کی آواز کے ساتھ اداکارانہ صلاحیتوں سے بھی من موہن دیسائی بہت متاثر ہوئے تھے۔ لہٰذا اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی من موہن جی کے دماغ میں فلم ''امر اکبر انتھونی'' کا خاکہ تیار ہونے لگا تھا۔ جب یہ فلم بننی شروع ہوئی تو مرکزی کردار میں امیتابھ بچن تھے۔ اس فلم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے۔ ملٹی اسٹار فلموں کی ناکامی کا ریکارڈ بھی اس فلم کی کامیابی نے توڑ دیا۔ اُسی برس ریلیز ہوئی ''دھرم ویر'' بھی زبردست کامیاب ہوئی تھی، مگر ''امر اکبر انتھونی'' کے بعد من موہن دیسائی کی ہدایت میں ہر فلم کے ہیرو امیتابھ بچن ہی رہے۔

۱۹۷۸ء میں فلم ''سہاگ'' اور ۱۹۸۱ء میں فلم ''نصیب'' نے بھی کامیابی حاصل کی۔ ان فلموں میں بالاترتیب ریکھا اور ہیما مالنی امیتابھ بچن کی ہیروئن تھیں۔ ۱۹۸۲ء میں سبھاش دیسائی کی فلم ''دیش پریمی'' میں من موہن دیسائی نے امیتابھ کے مقابل ہیما

مالنی اور پروین بابی کو لیا تھا، مگر یہ فلم اتنی کامیاب نہ ہو سکی۔ حالانکہ فلم کے تقسیم کاروں کو اس فلم سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں کیتن دیسائی کی فلم ''قلی'' منموہن دیسائی کی ہدایت میں امیتابھ بچن اور رتی اگنی ہوتری کو لے کر بنائی گئی۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران امیتابھ بچن کے پیٹ میں زبردست چوٹ لگی اور وہ کافی دن اسپتال میں رہے۔ یہ فلم زبردست ہٹ ثابت ہوئی۔ اس کے بعد ۱۹۸۵ء میں امیتابھ کو لے کر من موہن دیسائی نے فلم ''مرد'' بنائی اور یہ فلم بھی منموہن جی کی سابقہ فلموں کی طرح بے حد کامیاب رہی۔

۱۹۸۶ء میں فلم ''مرد'' کی ریلیز کے بعد منموہن دیسائی کی پیٹھ میں درد رہنے کی وجہ سے انہوں نے فلموں کی ہدایتکاری سے ریٹائرمنٹ لے لیا۔ لہٰذا ''گنگا جمنا سرسوتی'' کی ہدایت کاری کا بیشتر کام ان کے بیٹے کیتن دیسائی نے پورا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء میں ''طوفان''، ۱۹۹۳ء میں ''انمول'' جیسی فلموں کی ہدایت مکمل طور پر ان کے بیٹے کیتن دیسائی نے دی تھی اور یہ فلمیں زیادہ برنس نہ کر سکیں۔ حالانکہ یہ فلمیں من موہن دیسائی کے بینر سے ہی بنائی گئی تھیں۔

اپنے ۲۸ ربرس کے فلمی کیریئر میں من موہن دیسائی نے تقریباً بیس فلموں کی ہدایت کاری کی جن میں ۱۶ رفلموں نے کامیابی کی مثال پیش کی۔ یہ کامیابی من موہن جی کو فلمی دنیا کا دوسرا سب سے بڑا شومین ثابت کرتی ہے۔ ان کی فلموں کا خاص فارمولہ کھویا پایا کے گرد گھومتی کہانی میں مرچ مسالہ سب کچھ ہوتا ہے۔ ان کا نظریہ تھا کہ فلم شائقین تفریح کے لیے سینما ہال جاتے ہیں، لہٰذا ان کی بھرپور تفریح ہونی چاہیے۔

راجکپور کے گھر ایک پارٹی میں من موہن دیسائی کی ملاقات اداکارہ نندہ سے ہوئی اور وہ نندہ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ حالانکہ من موہن دیسائی شادی شدہ تھے اور ان کے بچے بھی تھے، مگر وہ نندہ کو دل سے چاہنے لگے تھے۔ اداکارہ نندہ کا فلمی کیریئر بھی ختم ہو چکا تھا۔ اداکارہ وحیدہ رحمٰن نندہ کی بہترین دوستوں میں سے تھیں۔ لہٰذا وحیدہ رحمٰن اور ہدایت کار لیش جوہر کی کوششوں سے دونوں نے شادی کا فیصلہ کر لیا

اور ۱۹۹۲ء میں دونوں کی منگنی بھی ہو گئی۔ مگر ہوتا وہی ہے جو قدرت چاہتی ہے۔ ۱۹۹۳ء سے من موہن دیسائی بہت بیمار ہوئے اور یکم مارچ ۱۹۹۴ء کو ممبئی کے کھیت واڑی علاقے میں اپنے ہی دفتر کی تیسری منزل کی بالکنی سے گرنے کی وجہ سے ان کی موت واقع ہو گئی، اور اس طرح نندہ کا دلہن بننے کا خواب بھی چکنا چور ہو گیا۔ چند برس پہلے ہی من موہن دیسائی کی بیوی جیون پر بھا دیسائی کا انتقال ہوا تھا۔

یہ بات مشہور ہے کہ منموہن دیسائی نے کبھی اپنے بیٹے کیتن دیسائی کے ساتھ سفر نہیں کیا۔ ان کو ڈر لگا رہتا تھا کہ ایسا کرنے پر کسی ایک کے ساتھ کوئی ناگہانی حادثہ ہو سکتا ہے۔

○○

جانی واکر

ایک دن مشہور فلمساز وہدایت کار گرودت چند دوستوں کے ساتھ اپنے دفتر میں بیٹھے محو گفتگو تھے کہ اچانک ایک دُبلا پتلا لمبے قد کا نوجوان معمولی قسم کے کپڑے زیب تن کئے ہوئے دھڑام سے دروازہ کھول کر اُس کمرے میں داخل ہوا، اور لڑکھڑاتے ہوئے ہچکیاں لے کر گرودت سے مخاطب ہوا...... "ہچ......آپ یہاں بیٹھے ہیں، باہر بہت بُرا زمانہ آگیا ہے، ہچ......" وغیرہ وغیرہ وہ نہ جانے کیا کیا کہے جا رہا تھا۔ ساتھ میں یہ بھی کہہ رہا تھا کہ میں نے شراب نہیں پی ہے۔ چار پانچ منٹ کی اپنی اس جھومتی تقریر کے درمیان وہ کئی بار زمین پر گرتے گرتے بچا اور مستقل لڑکھڑاتا رہا۔ گرودت کو بہت غصہ آیا اور وہ زور سے چلّائے......"ارے باہر سب مر گئے کیا؟ اسے اندر کس نے آنے دیا؟" تبھی تین چار آدمی گرودت کے کمرے میں آئے اور اس لڑکھڑاتے نوجوان کو اُٹھا کر کمرے سے باہر پھینک دیا۔ گرودت کی آواز ایک بار پھر گونجی......"اس شرابی کو اُٹھا کر اسٹوڈیو سے باہر پھینک دو۔"

اُسی وقت بلراج ساہنی کمرے میں داخل ہوئے اور انہوں نے گرودت کو بتایا کہ جس نوجوان کو وہ شرابی سمجھ کر اسٹوڈیو سے باہر پھنکوا رہے ہیں، وہ دراصل شرابی نہیں ہے، بلکہ آپ سے کام مانگنے کی غرض سے شرابی کی ایکٹنگ کر رہا تھا۔ گرودت نے اس نوجوان کو اپنی فلم "بازی" میں شرابی کا ہی کردار دے دیا۔ نوکیتن کی اس فلم میں دیوآنند ہیرو تھے اور گرودت اس فلم کے ہدایت کار تھے۔ اس طرح بدرالدین قاضی کو گرودت کیمپ میں شامل ہونے کا ایک بڑا موقع مل گیا۔

بدرالدین قاضی جو بعد میں جانی واکر کے نام سے ہندوستانی فلموں میں مشہور ہوئے، مدھیہ پردیش کے اندور شہر میں ۱۵ رمئی ۱۹۲۳ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اپنے دس بہن بھائیوں میں وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ ان کے والد اندور کی ایک کپڑا مِل میں ملازم تھے۔ ۱۹۳۰ء میں جب وہ مِل بند ہوا تو یہ پورا خاندان ناسک آگیا اور کچھ دن بعد اِگت پوری چلا گیا، اور پھر ۱۹۴۲ء میں تلاش روزگار میں یہ پورا خاندان بمبئ آگیا۔ جانی واکر کے والد کو حیدرآباد کے نظام کی مِل میں ملازمت مل گئی تھی، مگر بدقسمتی سے وہ مِل بھی جلد ہی بند ہوگئی۔

بمبئ میں ان کے والد کے ایک جاننے والے پولیس میں انسپکٹر تھے۔ ان کی سفارش پر جانی واکر کو بس کنڈکٹر کی ملازمت مل گئی۔ اس ملازمت کو پاکر وہ محض اس لئے خوش تھے کیوں کہ اس بہانے وہ بمبئ کے تمام علاقوں کو دیکھ سکیں گے اور فری میں سفر کرتے ہوئے اس جادونگری کے سارے فلم اسٹوڈیوز بھی دیکھ لیں گے۔ فلموں میں کام کرنے کا شوق ان کو شروع سے ہی تھا۔ دو برس تک وہ بس کنڈکٹر بنے گھومتے رہے۔ اس درمیان ان کی ملاقات فلموں کے مشہور ویلن اے۔ این۔ انصاری، کے۔ آصف کے معاون رفیق اور شیخ مختار کے سکریٹری سنگھ صاحب وغیرہ سے ہوگئی۔ ان لوگوں کی مدد سے تقریباً سات آٹھ ماہ کی جدوجہد کے بعد فلم ''آخری پیغام'' میں جانی واکر کو ایک چھوٹا سا کردار ملا۔ آٹھ روز تک کام کرنے کے عوض میں اسّی روپے ملے، جو ۱۹۴۸ء میں ان کو بہت زیادہ لگے تھے، کیوں کہ بس کنڈکٹری کرتے ہوئے اُن کو صرف ۲۶ روپے ماہانہ ملا کرتے تھے۔

اُن دنوں جانی واکر ماہم میں رہتے تھے۔ ایک دن اندھیری کے ایم۔ این۔ ٹی اسٹوڈیو سے اُن کا بُلاوا آیا۔ اپنے ایک جاننے والے سے آٹھ آنہ اُدھار لے کر جب جانی واکر وہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہدایت کار وجاہت مرزا کی فلم کی شوٹنگ تھی۔ جانی واکر کو ایک جوکر کا کردار ملا۔ تین گھنٹے کام کرنے کے سو روپے ملے، تو تھوڑی دیر تک اُن کو یقین ہی نہیں آیا۔ واپس آکر اُن سو روپیوں میں سے دس روپے انہوں نے اس شخص کو دیے جس سے آٹھ آنہ اُدھار لے کر وہ یہاں تک آئے تھے۔

اسی طرح پانچ سات فلموں میں چھوٹے چھوٹے کردار ادا کرتے ہوئے کے۔آصف کی فلم ''ہلچل'' میں انہیں ایک قیدی کا کردار ملا۔ اداکار بلراج ساہنی بھی اس میں ایک جیلر کا کردار ادا کر رہے تھے۔ حالانکہ وہ خود اُس وقت ایک سیاسی قیدی کے طور پر جیل میں تھے اور پولیس کسٹڈی میں شوٹنگ پر آتے تھے۔ بلراج ساہنی نے ہی جانی واکر کو گرودت سے ملنے کا وہ طریقہ بتایا تھا جس نے جانی واکر کی زندگی بدل دی۔ بعد میں جانی واکر نے نوکیتن اور گرودت کی کئی فلموں میں بڑے اہم کردار ادا کیئے۔

فلم ''بازی'' کے بعد ایک مزاحیہ اداکار کے طور پر جانی واکر کی شناخت قائم ہوگئی اور اُن کو فلموں میں لگاتار کام ملنے لگا۔ نوکیتن کی ہی اگلی فلم ''آندھیاں'' میں بھی ان کو شامل کیا گیا۔ اس فلم کے ہدایت کار چیتن آنند تھے۔ فلم ''آندھیاں'' کا پریمئر بمبئی کے لبرٹی سینما میں ہونا تھا۔ وہاں تک جانے اور واپس آنے کے لئے بس کرایہ آٹھ آنہ چاہئے تھا اور جانی واکر کے پاس صرف چار آنہ تھے۔ لہٰذا ایک پہچان والے بس کنڈکٹر کی مدد سے بغیر ٹکٹ دھوبی تالاب تک سفر کیا اور فلم ختم ہونے سے پہلے ہی سینما ہال سے باہر نکل آئے تاکہ بس سروس ختم ہونے سے پہلے ہی گھر پہنچ سکیں۔ حالانکہ اس فلم میں ان کے کردار کی بہت تعریف ہوئی مگر وہ پریمئر ختم ہونے پر کسی کو آٹوگراف نہ دے سکے۔

فلم ''بازی'' کے بعد گرودت کے ساتھ جانی واکر نے بہت سی فلموں میں کام کیا۔ ''آر پار، مسٹر اینڈ مسز ۵۵، پیاسہ، چودھویں کا چاند، کاغذ کے پھول'' وغیرہ میں جانی واکر کے اہم کردار تھے۔ نوکیتن کی فلم ''ٹیکسی ڈرائیور'' میں دیو آنند اور کلپنا کارتک کے ساتھ جانی واکر کا بھی بڑا اہم کردار تھا۔ اس فلم میں ان کا نام مست رام تھا۔ کئی دوستوں نے مشورہ دیا کہ وہ اپنا فلمی نام مست رام ہی رکھ لیں مگر ان کو یہ نام پسند نہ تھا، لہٰذا انہوں نے اس زمانے کی مشہور شراب جانی واکر پر ہی اپنا فلمی نام جانی واکر رکھ لیا۔ گرودت کی فلم ''آر پار'' سے ہی پردے پر ان کا نام جانی واکر آنے لگا اور ان کی مقبولیت میں کافی اضافہ ہوا۔ اسی فلم کی کامیابی سے خوش ہوکر گرودت نے جانی واکر کو تحفہ میں ایک کار دی تھی، اور اسی فلم ''آر پار'' کے بعد جانی واکر نے اداکارہ نور سے

شادی کی اور اپنے گھر کا نام 'نور وِلا' رکھ لیا۔ مگر اداکارہ نور نے شادی کے بعد فلموں میں کام کرنا بند کر دیا۔ اِن دونوں کے پہلے تین بیٹیاں اور پھر تین بیٹے پیدا ہوئے۔

جانی واکر کی شہرت کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ ان کی ہر فلم میں ایک دو نغمے ضرور اُن پر فلمائے جاتے تھے اور ان پر فلمائے گئے تقریباً سبھی نغمے محمد رفیع نے خاص طور پر ان کے اپنے ہی انداز میں گائے ہیں۔ صرف ایک فلم "بات ایک رات کی" میں اُن پر فلمایا گیا ایک گیت...... "کس نے چلمن سے مارا نظارہ مجھے" گلوکار منا ڈے نے گایا ہے۔ محمد رفیع کے تمام گیت جو اُن پر فلمائے گئے، لگتا تھا کہ پردے پر خود جانی واکر گا رہے ہیں۔ کئی گیتوں میں تو کہیں کہیں ان کی اپنی آواز کو بھی شامل کر کے اور زیادہ حقیقی رنگ دینے کی کوشش کی گئی ہے۔ ایم۔صادق کی فلم "چھومنتر" میں تو جانی واکر پر تین چار گانے فلمائے گئے اور سبھی گانے ہٹ ہوئے۔ فلم "نیا دور" میں اُن پر فلمایا گیا گیت...... "میں بمبئی کا بابو" اور فلم "مدھومتی" کا نغمہ...... "جنگل میں مور ناچا کس نے دیکھا" بہت مقبول ہوئے۔ گرودت تو خاص طور پر جانی واکر کے لئے گانوں کی سچویشن نکالا کرتے تھے۔ فلم "سی۔آئی۔ڈی۔" میں...... "یہ ہے بمبئی میری جان"، فلم "مسٹر اینڈ مسز ۵۵" میں...... "جانے کہاں میرا جگر گیا جی"، اور خاص طور پر فلم "پیاسہ" کا گیت...... "سَر جو تیرا چکرائے" بے حد مقبول ہوئے تھے۔ گرودت کی فلم "کاغذ کے پھول" ہی ایک ایسی فلم تھی جس میں جانی واکر پر کوئی گیت نہیں فلمایا گیا تھا۔ اس فلم کی ناکامی کے بعد ہی گرودت نے فلم "چودھویں کا چاند" میں جانی واکر پر دو گیت فلمائے...... "یہ دنیا گول ہے" اور...... "میرا یار بنا ہے دولہا"، اور بے شک یہ فلم زبردست ہٹ ثابت ہوئی۔

جانی واکر نے لگ بھگ دس بارہ فلموں میں ہیرو کے کردار بھی ادا کئے۔ ان کی ہیرو کے بطور پہلی فلم تھی "پیسہ ہی پیسہ"۔ اس فلم میں انہوں نے تین کردار ادا کئے تھے۔ اُن کے اپنے نام پر بھی ایک فلم "جانی واکر" فلمساز وید مدن نے بنائی تھی۔ اُن دنوں ان کی جوڑی اداکارہ شیاما کے ساتھ کافی مقبول ہوئی تھی۔ اداکارہ شکیلہ کے ساتھ بھی ان کی کئی فلمیں آئیں۔

ایک کامیڈین کے طور پر جانی واکر کو جو شہرت اور عزت فلمی دنیا میں اور فلمی دنیا سے باہر ملی وہ بہت کم مزاحیہ اداکاروں کے حصے میں آتی ہے۔ شرابی کے مخصوص انداز میں تو انہوں نے اپنے چاہنے والوں کو خوب ہنسایا ہی، اس کے علاوہ فلم ''میرے محبوب، پالکی، چودھویں کا چاند، آنند'' اور ''پتیا'' جیسی فلموں میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں سے فلمی ناظرین کو متاثر بھی کیا۔ فلموں کے لئے انہوں نے اپنی آواز کو ایک خاص ٹون میں ادا کر کے اپنی پہچان بنائی۔ حالانکہ پردے سے ہٹ کر اُن کی اپنی آواز بالکل مختلف تھی۔ ایک زمانے میں جانی واکر نے فیمنا سونگ کا ریڈیو پروگرام کافی عرصے تک پیش کیا اور اس طرح انہیں ہندوستانی عوام سے براہِ راست مکالمہ کرنے کا موقع ملا۔ عوام نے یہ پروگرام پسند کیا اور جانی واکر کی شہرت میں اس سے اضافہ ہوا۔

بمل رائے کی فلم ''مدھومتی'' کا ایک سین تو لوگوں کو مدتوں یاد رہا ہوگا جب جانی واکر پیڑ سے اُلٹا لٹک کر لوگوں کو بتا رہے تھے کہ دنیا ہی اُلٹ گئی ہے بھائی۔ اس فلم میں جانی واکر کی کامیڈی اتنے اعلیٰ درجے کی ہے کہ اس فلم کے لئے انہیں بہترین معاون اداکار کا فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔

۱۹۶۸ء تک جانی واکر کامیڈین کے بطور فلمی پردے پر چھائے رہے، حالانکہ اس دوران مزاحیہ اداکار محمود نے بھی اپنے لئے اچھی خاصی جگہ بنالی تھی، مگر اس کے بعد جانی واکر نے دھیرے دھیرے فلموں میں کام کرنا کم کر دیا۔ اس کی ایک بڑی وجہ تو یہ تھی کہ فلموں میں کامیڈی کے نام پر بھونڈاپن زیادہ ہونے لگا تھا، مکالموں میں گھٹیا جملے استعمال ہونے لگے تھے اور کچھ اس وجہ سے بھی کہ کئی ہیرو خود ہی فلموں میں کامیڈی بھی کرنے لگے تھے۔ ۱۹۸۴ء تک انہوں نے بہت کم فلموں میں کام کیا اور فلم ''شان'' کے بعد سے انہوں نے فلموں میں کام کرنا بالکل بند ہی کر دیا۔ جانی واکر نے ایک بہت ہی معمولی انسان کے بطور زندگی شروع کی اور اپنی محنت، لگن اور ایمانداری سے انہوں نے وہ سب کچھ حاصل کیا جس کی تمنا ایک انسان کر سکتا ہے۔ انہوں نے اپنے چند اُصول بھی بنا رکھے تھے جن پر وہ ہمیشہ قائم رہے۔ شام کو ساڑھے چھ بجے کے بعد شوٹنگ نہیں کرتے تھے اور سیدھے اپنی فیملی

میں آ کر وقت گزارتے تھے۔ کھانا وقت پر کھانا اور شوٹنگ میں بھی اپنے گھر کا بنا کھانا ساتھ لے جانا اُن کا معمول تھا۔ شکار کے بے حد شوقین تھے اور اپنے دوستوں کو بھی شکار پر لے جاتے تھے۔ گرودت، این۔اے۔انصاری، شمی کپور، نوشاد علی اور فیروز خان وغیرہ کئی مشہور ہستیاں ان کے ساتھ شکار پر جایا کرتے تھے۔ انہیں مچھلی پکڑنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ پتنگ اُڑانے میں بھی جانی واکر بہت استاد تھے اور کئی جگہ پتنگ بازی کے نیشنل مقابلوں میں بھی جایا کرتے تھے۔ حالانکہ انہوں نے زیادہ تر فلموں میں شرابی کا کردار بحسن وخوبی ادا کیا ہے، مگر وہ خود کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاتے تھے۔ شروع میں جانی واکر کو سگریٹ پینے کا شوق تھا۔ ایک بار انہوں نے سگریٹ سلگانے کے لئے کسی سے ماچس مانگی۔ اُس شخص نے کہا کہ سگریٹ پینے کا اتنا ہی شوق ہے تو ماچس بھی رکھا کرو۔ جانی واکر نے اسی وقت سے سگریٹ پینا ترک کر دیا اور آخری وقت تک سگریٹ نہیں پیا۔

جانی واکر نے اپنے بیٹے کے لئے بھی ایک فلم ''پہنچے ہوئے لوگ'' خود بنائی اور اس کی ہدایت بھی کی۔ مگر یہ فلم بُری طرح ناکام ہو گئی اور انہوں نے خود فلمیں بنانے سے ہمیشہ کے لئے توبہ کر لی۔ اس درمیان کئی فلموں میں انہیں اداکاری کے آفر ملے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ کافی عرصے بعد گلزار اور کمل ہاسن کے بیحد اسرار پر انہوں نے فلم ''چاچی ۴۲۰'' میں میک اپ مین کا کردار ادا کیا تھا۔

ہندوستانی فلموں میں وہ کامیڈی اداکار دیکشت کو بہت مانتے تھے مگر اُن کے آئیڈیل ہمیشہ کامیڈی اداکار نور محمد چارلی رہے۔ انہوں نے اپنی پوری فلمی زندگی میں تین سو سے زائد فلموں میں کام کیا۔

۲۹ر جولائی ۲۰۰۳ء کو طویل بیماری کے بعد 'نور وِلا' میں جانی واکر کا انتقال ہو گیا اور اس طرح پانچ دہائیوں تک فلمی شائقین کے دلوں میں اپنی ایک الگ شناخت بنائے رکھنے والا مزاحیہ اداکار ہمیشہ کے لئے ہم سے بچھڑ گیا، مگر ان کے یادگار کرداروں کی وجہ سے وہ اگلی کئی دہائیوں تک یاد کئے جاتے رہیں گے۔

OO
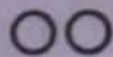
سنیل دت

وقت انسان کو کب کہاں سے کہاں پہنچا دے، کسی کو کچھ معلوم نہیں۔ جب وقت مہربان ہوتا ہے تو وہ آدمی کو زمین سے اٹھا کر آسمان پر بیٹھا دیتا ہے اور دنیا کی ہر دولت، عزت، شہرت، چاہت آدمی کے قدموں میں بچھا دیتا ہے اور یہی وقت جب کسی کا بگڑا ہو تو وہ دنیا کی ہر خوشی اس سے چھین لیتا ہے۔ وقت کا یہ مذاق کبھی کبھی آدمی کے ساتھ لگاتار چلتا رہتا ہے اور آدمی کی زندگی میں اتار چڑھاؤ آتے رہتے ہیں۔ اسی لئے یہ مثال مشہور ہوئی کہ کبھی کسی کا وقت ایک سا نہیں رہتا۔

ہندوستان کی آزادی اپنے دامن میں اس وسیع و عریض ملک کی تقسیم بھی لے کر آئی اور ۱۸ر برس کے نوجوان بلراج دت کو پنجاب کے اپنے گاؤں خورد (ضلع جہلم) سے بے دخل ہو کر ہندوستان کے (پہلے پنجاب اور اب ہریانہ کے) جمنانگر کے گاؤں منڈولی میں آنا پڑا۔ بلراج دت ۶ر جون ۱۹۲۹ء کو پنجاب کے ضلع جہلم (اب پاکستان میں) کے ایک چھوٹے سے گاؤں خورد کے ایک زمیندار خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کے والد کا نام دیوان رگھوناتھ دت تھا اور وہ آرمی میں ملازم تھے۔ بلراج دت بچپن سے ہی بہت شرارتی اور نٹ کھٹ تھے اور ''چھوٹے دیوان'' کہلاتے تھے اور ایک ملازم کے ساتھ گھوڑے پر بیٹھ کر اسکول جایا کرتے تھے۔ اپنی ماں شریمتی کلونت دیوی کو وہ پیار سے ونتو کہتے تھے۔ بچپن میں بلراج کو غصہ بہت آتا تھا۔ ایک بار وہ اپنی ماں پر اتنا غصہ ہوا کہ گھر کا دروازہ بند کر کے باہر سے تالا لگا کر چلا گیا۔ گاؤں والے اُسے پورے گاؤں میں ڈھونڈتے پھرے اور آخر میں وہ اپنے ہی مکان کی چھت پر ایک کھرّی چارپائی پر

سوتے ہوئے ملا۔ ابھی وہ ۶ ربرس کا ہی تھا جب اس کے سر سے باپ کا شفیق سایہ اٹھ گیا۔ ملک کی تقسیم کے نتیجے میں اُس خاندان کا سب کچھ ختم ہو گیا اور یہ سب مہاجر بن کر ہندوستان کے پنجاب (اب ہریانہ) کے ایک گاؤں منڈولی میں آباد ہو گئے جہاں اِن کو حکومت کی طرف سے کچھ زمین دی گئی۔ چھوٹے بھائی سوم دت، ماں اور ایک چھوٹی بہن رانی کی ذمہ داری اب پوری طرح بلراج دت کے کاندھوں پر تھی۔ لہٰذا وہ ماں سے یہ وعدہ کر کے کہ وہ بی۔اے۔ تک کی تعلیم ضرور حاصل کرے گا، روزگار کی تلاش میں بمبئ چلا آیا اور ریگل سنیما کے پیچھے ایک نائی کی دُکان میں رات کو سونے کا انتظام کر لیا۔ یہی نائی مفت میں اُن کا شیو بھی کرتا تھا اور کبھی کبھی بال بھی کاٹ دیا کرتا تھا۔

بمبئ آ کر بلراج دت نے بڑی جدوجہد کی اور کسی طرح بیسٹ (بی۔ای۔ ایس۔ٹی۔) میں ورک شاپ ریکارڈسٹ کی ملازمت سو روپے ماہانہ پر حاصل کر لی۔ بمبئ میں ایک ریفیوجی کالج قائم کیا گیا تھا۔ اس میں مارننگ کلاسیس ہوا کرتی تھیں۔ بلراج دت صبح ساڑھے سات بجے کالج جاتا اور پھر دوپہر کو ڈھائی بجے سے رات ساڑھے گیارہ بجے تک کلابہ کے ڈپو میں بمبئ کی بسوں کا حساب کتاب لکھتا تھا۔ کچھ دنوں بعد بلراج دت نے ریڈیو سیلون کے ایک پروگرام "لپٹن کے مہمان" کے لئے فلمی اداکاروں اور فلمسازوں و ہدایتکاروں سے انٹرویو کرنے شروع کر دئے۔ اس پروگرام کے لئے اُسے بہت معمولی سی تنخواہ ملتی تھی، جس میں وہ بڑی تنگدستی کے ساتھ گزر بسر کرتا تھا۔ دن بھر کام کے سلسلے میں ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے چکر لگاتا اور رات کو کافی دیر تک اپنی پڑھائی بھی کرتا تھا۔ ماں سے کیا ہوا بی۔اے۔ کرنے کا وعدہ وہ ہمیشہ یاد رکھتا تھا۔ ریڈیو سیلون میں ملازمت ملنے پر بلراج دت نے کرلا میں ایک مہاراشٹرن کی کھولی میں ۳۰ر روپے ماہوار پر شیئر کر لیا اور پہننے کے لئے اُس کے پاس صرف دو جوڑی کپڑے تھے۔ اُن دنوں وہ ہمیشہ سفید شرٹ اور سفید پائجامہ میں دیکھا جا سکتا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ رات کو ایک جوڑی کپڑے وہ خود ہی دھو لیتا تھا اور صبح کو دوسری جوڑی کپڑے پہن کر اسٹوڈیوز کی طرف نکل پڑتا

تھا۔ ایک بار وہ سفید کپڑے پہن کر ایک اسٹوڈیو سے دوسرے اسٹوڈیو کے لئے چل پڑا تو راستے میں چند شریر لڑکیوں نے اُسے گھیر لیا، جو ہولی کھیل رہی تھیں اور پانی اور رنگ سے آنے جانے والوں کے کپڑے بھگو رہی تھیں۔ بلراج دت یہ دیکھ کر گھبرا گیا۔ اُس نے ان لڑکیوں سے منت سماجت کی کہ اُس کے کپڑوں پر کوئی رنگ نہ ڈالے، کیوں کہ اس کے پاس بدلنے کے لئے کوئی دوسرا جوڑا نہیں ہے۔ مگر لڑکیوں نے اُس کی ایک نہ سنی اور اس کے سارے کپڑوں کو رنگ ڈالا اور بے چارہ بلراج دت اپنی بے بسی پر رو پڑا۔

اس طرح ریڈیو سیلون سے ایک آواز اُبھری...... وہ آواز تھی بلراج دت کی۔ آواز اچھی تھی، اس لئے اس آواز کو کافی مقبولیت ملی، جیسے امین سیانی کا انداز اور آواز مقبول ہے، اسی طرح اُس وقت بلراج دت کے پیش کئے گئے پروگرام بہت مقبول ہوئے۔ ان ہی دنوں اداکارہ نرگس کا انٹرویو کرنے کا خیال اُس کو آیا۔ مشہور و معروف مغنیہ جدّن بائی کی بیٹی نرگس اس وقت ایک مصروف اور مقبول اداکارہ تھیں، لہٰذا بلراج دت بار بار نرگس سے انٹرویو کا وقت لیتے رہے اور ہر بار نرگس وقت پر غائب رہتیں۔ تنگ آکر بلراج دت نے نرگس سے انٹرویو کرنے کا ارادہ ترک کر دیا۔ مگر دل کے کسی کونے میں نرگس سے انٹرویو کرنے کی ان کی یہ خواہش جڑ پکڑ چکی تھی۔ لہٰذا آٹھویں بار پھر انٹرویو کے لئے وقت ملا۔ نرگس نے کمرے میں آتے ہی بڑے تیز لہجے میں کہا...... ''دیکھئے، میرے پاس وقت بالکل نہیں ہے۔ دس منٹ سے زیادہ میں آپ کو وقت نہیں دے سکتی۔ آپ کو جو پوچھنا ہے فٹافٹ پوچھئے، مجھے اسٹوڈیو جانا ہے۔''

نرگس کی بات چیت کا یہ انداز دیکھ کر بلراج دت ہکا بکا رہ گئے۔ ابھی بلراج یہ سوچ ہی رہے تھے کہ اس مغرور عورت سے بات کہاں سے شروع کی جائے، تبھی ان کے کانوں میں وہی تیز طرّار آواز دوبارہ گونجی...... ''اے مسٹر، آپ کس سوچ میں ہیں؟ مجھے لگتا ہے کہ آپ کو کچھ پوچھنا ہی نہیں ہے۔ او۔ کے۔ ...... میں چلتی ہوں۔'' مگر

بلراج دت نے انہیں روک ہی لیا اور دس منٹ کے بجائے یہ انٹرویو پندرہ منٹ تک چلا۔ یہ تھی بلراج دت عرف سنیل دت کی نرگس سے پہلی ملاقات............! پھر وقت نے ذرا سی کروٹ بدلی اور بلراج دت کو فلموں میں کام کرنے کی پیش کش ملی۔ یہ شاید اُن کی آواز کا ہی کرشمہ تھا جو اُن کو فلموں کی طرف لا رہا تھا۔

دلیپ کمار اور نلنی جیونت کی فلم ''شکست'' کی شوٹنگ کسی اسٹوڈیو میں تھی۔ اس فلم کے ہدایتکار رمیش سہگل تھے۔ بلراج دت دلیپ کمار کا انٹرویو کرنے کے لئے سیٹ پر ہی پہنچ گئے۔ انٹرویو کے بعد دلیپ کمار نے بلراج دت سے کہا کہ تمہاری آواز اور شخصیت بہت اچھی ہے، تم خود کیوں ایکٹر نہیں بن جاتے؟ رمیش سہگل نے دلیپ کمار کی پینٹ شرٹ بلراج دت کو پہنوا کر سکرین ٹسٹ لیا اور تین سو روپے کا پہلا سائننگ اماؤنٹ دے کر اپنی اگلی فلم کے لئے سائن کر لیا۔ اس وقت بلراج دت بی۔اے۔ کے تیسرے سال میں تھے۔ انہوں نے کہا کہ میں ماں سے کیا ہوا وعدہ پہلے پورا کروں گا، اس کے بعد آپ کی فلم میں کام کروں گا۔ رمیش سہگل مان گئے اور اس طرح انہوں نے تقریباً ایک سال انتظار کیا اور پھر ۱۹۵۴ء میں شروع ہوئی اس فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' سے بلراج دت نے سنیل دت کے نام سے فلموں میں اداکاری کی شروعات کی۔ یہ فلم ایک سال میں بن کر ۱۹۵۵ء میں ریلیز ہوئی۔ مگر اس فلم کو زیادہ کامیابی حاصل نہ ہو سکی۔ سنیل دت پھر بھی مایوس نہ ہوئے۔ اُسی سال ان کو تین فلمیں اور ملیں۔ جن میں سے ایک بی۔آر۔ چوپڑہ کی ''ایک ہی راستہ'' تھی۔ بی۔آر۔ چوپڑہ اس وقت تک ایک کامیاب فلمساز و ہدایتکار کے طور پر اپنے آپ کو قائم کر چکے تھے اور ان کی فلم میں کام کرنا سنیل دت کے لئے بہت بڑی بات تھی۔ اس فلم کو کامیابی بھی ملی۔ فلم ''ایک، ہی راستہ'' کے بعد سنیل دت بی۔ آر۔ چوپڑہ کے مستقل اداکار بن گئے اور بعد میں انہوں نے چوپڑہ کی ''گمراہ، سادھنا، وقت'' اور ''ہمراز'' جیسی کامیاب فلموں میں کام کر کے اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کو منوایا۔

مشہور فلمساز ہدایتکار محبوب خان نے اپنی کامیاب ترین فلم ''عورت'' کو

دوبارہ ''مدر انڈیا'' کے نام سے بنانے کا اعلان کیا اور برجو کے عجیب و غریب غصیل کردار کے لئے سنیل دت کا نام لیا تو ان کی یونٹ کے بھی لوگ چونک پڑے۔ مگر محبوب صاحب اپنے فیصلے پر اٹل رہے اور بعد میں لوگوں نے دیکھا کہ سنیل دت نے اپنی آواز اور اداکاری سے برجو کے سخت ترین اینگری مین کے کردار میں جان ڈال دی تھی۔ فلم ''مدر انڈیا'' سے سنیل دت کی زندگی کا ایک سب سے اہم واقعہ بھی جڑا ہوا ہے جس نے سنیل دت کی زندگی کو یکسر ہی بدل کر رکھ دیا۔ اسی فلم میں اس وقت کی مقبول اداکارہ نرگس کلیدی رول ادا کر رہی تھیں اور سنیل دت نے ان کے چھوٹے بیٹے کا رول ادا کیا تھا۔ فلم کے ایک منظر میں گاؤں کا سرمایہ دار کنہیالعل سنیل دت کی کٹی ہوئی فصل میں آگ لگوا دیتا ہے اور سنیل دت بھی اسی فصل میں چھپا بیٹھا ہے۔ نرگس کو معلوم ہے کہ اس کا بیٹا بھی آگ کے ان ہی شعلوں میں موجود ہے۔ لہٰذا وہ بیقرار ہو کر 'برجو برجو' کہتی ہوئی اپنے بیٹے کو تلاش کرتی آگ اور دھوئیں میں بھاگتی دوڑتی پھر رہی ہے۔

شوٹنگ کے دوران نرگس کو برجو تو نہیں ملتا، مگر وہ خود حقیقتاً چاروں طرف لگی آگ میں گھر جاتی ہے۔ تب سنیل دت کو معلوم ہوتا ہے کہ نرگس آگ اور دھوئیں میں گھر گئی ہیں، وہ اپنی جان کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اس آگ میں کود جاتا ہے اور نرگس کو زندہ بچا لاتا ہے۔ اس واقعہ سے نرگس اتنی زیادہ متاثر ہوئیں کہ انہوں نے اپنے سارے معاملات پس پشت ڈال کر اور بہت لوگوں کی مخالفت کو نظرانداز کرتے ہوئے، خود سے عمر میں کافی چھوٹے سنیل دت سے شادی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ سنیل دت نے بڑے تذبذب کے ساتھ نرگس کے سامنے شادی کی تجویز رکھی اور آخرکار ۱۱ر مارچ ۱۹۵۸ء کو دونوں نے شادی کر لی۔

نرگس کے بڑے بھائی اختر حسین اس شادی کے خلاف تھے۔ مگر چھوٹے بھائی انور حسین کو کوئی اعتراض نہ تھا۔ شادی کے روز نرگس اپنے گھر سے یہ کہہ کر نکلی کہ وہ اپنی کسی سہیلی سے ملنے جا رہی ہے۔ ہندو مسلم شادیاں اس وقت اور بھی زیادہ

مشکل تھیں، چاہے وہ فلم اسٹار ہی کیوں نہ ہوں۔ سنیل دت سے ملنے کا وقت شام سات بجے کا طے ہوا تھا۔ لنکنگ روڈ پر آریہ سماج کے قریب سنیل دت کھڑے ہوئے نرگس کا انتظار کر رہے تھے۔ ۷ بجے، ۸ بجے، ۹ بجے،...... حتیٰ کہ رات کے دس بجے تک نرگس کا کہیں پتہ نہ تھا۔ وہاں سے ہٹ کر سنیل دت فون تک کرنے نہیں جا سکتے تھے، کیونکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ وہاں سے ہٹیں اور نرگس آئے اور سنیل دت کو خاص مقام پر نہ پا کر لوٹ جائے۔ وہ اسی ادھیڑبن میں رہے کہ کہیں نرگس نے اپنا ارادہ تو نہیں بدل دیا؟ دوسری جانب نرگس ٹریفک میں پھنس گئی۔ اُسی دن پوپ جان پال ہندوستان آئے ہوئے تھے۔ بمبئی میں اس سے قبل اتنا زبردست ٹریفک جام نہیں ہوا تھا۔ نرگس ٹیکسی بھی نہیں چھوڑ سکتی تھی، کیونکہ ٹریفک کی وجہ سے دوسری ٹیکسی نہ ملی تو......؟ اور نہ ہی وہاں پارکنگ کی گنجائش تھی۔ یہ سنیل دت کا ہی حوصلہ تھا کہ اپنے مقام پر ڈٹا رہا اور انتظار کرتا رہا...... پھر خدا خدا کر کے دس بجے کے بعد نرگس وہاں پہنچی اور یہ شادی ہو سکی۔ بعد میں سنیل دت اور نرگس کی یہ شادی فلمی دنیا کی ایک مثالی شادی ثابت ہوئی اور نرگس نے ہر اچھے بُرے وقت میں سنیل دت کا ساتھ ایک بہترین دوست اور ایک غم گسار بیوی کے روپ میں دیا۔

نرگس سے شادی کے بعد سنیل دت کی کامیابیوں کا سلسلہ تیزی سے شروع ہو گیا۔ ان کی ایک کے بعد ایک فلم کامیابی حاصل کرتی چلی گئی۔ ''سادھنا، سجاتا، انسان جاگ اُٹھا، ایک پھول چار کانٹے، میں چپ رہوں گی'' اور ''گمراہ'' جیسی فلموں کی کامیابی نے انہیں ہیرو سے اسٹار بنا دیا۔ فلم ''مجھے جینے دو'' میں تو انہوں نے ڈاکو کے کردار کو اس طرح زندگی بخشی کہ آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں میں وہ کردار محفوظ ہے۔

سنیل دت ایک باہمت، جواں حوصلہ اور مردانہ شخصیت کا نام تھا۔ ''مدر انڈیا'' کے آگ کے واقعہ کی طرح ہی ایک فلم ''ہمالیہ سے اونچا'' کی لداخ میں شوٹنگ کے دوران فلم کی ہیروئین برفانی طوفان میں گھر گئی تھی۔ سنیل دت نے ہمت اور حوصلہ سے

کام لیتے ہوئے اُسی برفانی طوفان میں ہیروئین کو تلاش کیا اور اس کی زندگی بچائی۔

فلموں میں اداکار کے بطور اپنی شخصیت منوانے کے بعد سنیل دت نے ''اجنتا آرٹ گروپ'' کے نام سے نہ صرف فلمسازی و ہدایتکاری شروع کی، بلکہ ملک اور قوم کی خدمت کے لئے بہت سے چیرٹی پروگرام بھی پیش کئے اور ۱۹۶۲ء میں ہند چین کی جنگ کے وقت ملک کی سرحدوں پر جا کر اپنے فوجی بھائیوں کی حوصلہ افزائی، دلجوئی اور تفریح کے لئے دلچسپ پروگرام بھی پیش کئے۔ حالانکہ کئی بار ان کو خطرناک برفیلے علاقوں میں بھی ایسے پروگرام کرنے کے لئے جانا پڑا۔ جب ملک پر کوئی مصیبت آئی، سنیل دت ہمیشہ ملک کی خدمت کے لئے پیش پیش رہے۔

''مدر انڈیا'' میں سنیل دت نے نیگیٹیو رول نہایت کامیابی کے ساتھ ادا کیا تھا، مگر اپنی ہیرو کی امیج کو توڑ کر فلم ''پڑوسن'' میں پہلی بار سنیل دت نے ایک کامیڈی کردار ادا کیا، حالانکہ اس فلم میں محمود اور کشور کمار جیسے کامیڈین بھی موجود تھے، مگر اپنے بھولے پن اور احمقانہ حرکتوں والے اس کردار میں سنیل دت نے بہترین اداکاری پیش کی۔ نرگس کے انتقال کے بعد انہوں نے ایک بار پھر اپنی امیج کو توڑا، اور ویلن اور اینگری مین کے کردار ادا کئے۔ فلم ''زخمی انسان'' اور ''بھائی بھائی'' میں انہوں نے اینگری مین کا کردار ادا کیا اور بی۔ آر۔ فلمز کی فلم ''۳۶ر گھنٹے'' میں انہوں نے ویلن کا کردار ادا کیا۔ اسی طرح فلم ''گیتا میرا نام'' میں بھی وہ اینگری مین اور ویلن کے ملے جلے کردار میں نظر آئے۔ یہ سب کوشش انہوں نے اپنی کردار نگاری اور اداکاری میں تنوع پیدا کرنے کے لئے کی تھی۔

سنیل دت نے نجی زندگی میں جہاں بہت سے سُکھ دُکھ دیکھے وہیں اپنی فلمی زندگی میں کئی تجربے بھی کئے۔ انہوں نے مارکیٹ کی پرواہ نہ کرتے ہوئے فلم ''یادیں'' بنائی۔ یہ ایک عجیب تجرباتی فلم تھی، جس میں سنیل دت پوری فلم میں اکیلے اداکار تھے اور باقی ان کے چاروں طرف بکھری ہوئی آوازیں تھیں، جو اُن کی یادوں سے متعلق تھیں۔ ''یادیں'' کا پریمئر بمبئی کے مراٹھا مندر میں ہوا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے

راجستھان کی ریتیلی اور خشک زندگی پر ایک تجرباتی فلم ''ریشما اور شیرا'' بنائی۔ ان دونوں فلموں کی تعریف دلیپ کمار نے بھی کی تھی۔ فلموں میں سنیل دت کی کامیابی اور مقبولیت کی خاص وجہ تھی اُن کی شخصیت اور دلوں کی گہرائی میں اترتی ہوئی ان کی آواز۔ ان کے مکالموں کی ادائیگی اتنی صاف اور پُر اثر ہوتی تھی کہ فلم بینوں کی توجہ پوری طرح ان کی طرف مرکوز رہتی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بچپن سے ہی اردو پڑھے ہوئے تھے اور آخر تک اردو میں ہی اسکرپٹ لیتے تھے اور خود بھی اپنا اسکرپٹ اردو میں لکھتے تھے۔ ان کا تلفظ بھی بہت صحیح ہوتا تھا۔

ایک وقت تھا جب سنیل دت نے فلم ''وقت'' میں کام کیا تھا اور لوگوں نے اس کو سراہا تھا۔ پھر ''مہربان، مجھے جینے دو، پڑوسن، میرا سایہ، خاندان'' وغیرہ فلموں میں اداکاری کے جوہر دکھا کر شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔ درمیان میں کچھ وقت ایسا بھی آیا جب سنیل دت کی مارکیٹ ویلیو کم ہوئی اور ان کی شہرت میں بھی کمی آئی۔ کچھ ہی برسوں کے بعد فلم ''ہیرا'' اور ''پران جائے پر وچن نہ جائے'' میں وہ پھر ایک نئے روپ میں لوٹ کر آئے۔ ان فلموں کے ہٹ ہوتے ہی سنیل دت ایک بار پھر فلم انڈسٹری پر چھا گئے۔ مگر اسی دوران فلم ''گیتا میرا نام'' میں لوگوں نے سنیل دت کو ایک بالکل نئے انداز میں دیکھا اور جونی کے کردار میں انہوں نے پھر سے انڈسٹری پر یہ ثابت کر دیا کہ وہ صرف ایک سٹار ہی نہیں، بلکہ اداکار ہیں۔ بعد میں فلم ''ناگن'' کی بے پناہ کامیابی نے سنیل دت کو پھر سے شہرت کی اسی بلندی پر پہنچا دیا تھا۔ ان کی آخری فلم ''منّا بھائی ایم۔ بی۔ بی۔ ایس۔'' تھی جس میں ان کے بیٹے سنجے دت نے ہیرو کا کردار ادا کیا تھا۔

سنیل دت نے ایک ذمہ دار باپ کا کردار ادا کرتے ہوئے ۱۹۸۱ء میں اپنے بیٹے سنجے دت کے لئے فلم ''راکی'' بنائی۔ انہوں نے سنجے دت سے صاف الفاظ میں کہہ دیا تھا کہ اس کے بعد وہ سنجو بابا کی کوئی مدد نہیں کریں گے اور اُسے خود اپنی صلاحیتوں کے سہارے ہی فلم انڈسٹری میں اپنا مقام بنانا ہوگا۔ نرگس دت کی بڑی تمنا تھی کہ وہ فلم

''راکی''، مکمل ہونے پر بیٹے کو سنہرے پردے پر دیکھیں۔ مگر ''راکی''، مکمل ہونے سے قبل ہی نرگس دت کی زندگی مکمل ہو گئی اور وہ یہ فلم نہیں دیکھ سکیں۔ حالانکہ ''راکی'' اور اس کے بعد کی کئی فلمیں سنجے دت کو زیادہ کامیابی نہ دے سکیں۔ مگر بعد میں جب اس نے نشہ کی عادت سے توبہ کر لی اور اپنی ساری توجہ اداکاری پر مرکوز کی، تب وہ ایک کامیاب اداکار کے طور پر خود کی پہچان قائم کر سکا۔

دلیپ کمار کے بعد سنیل دت ہی فلمی دنیا کی دوسری شخصیت ہیں جن کو بمبئی کے شیرف کے عہدہ کے لئے نامزد کیا گیا اور انہوں نے سچے دل اور لگن کے ساتھ اپنے فرائض نبھائے۔ ان کی بیوی نرگس دت کو راجیہ سبھا کا ممبر نامزد کیا گیا تھا اور وہ بھی ملک وقوم کی خدمت میں اپنے شوہر کے شانہ بشانہ حصہ لیتی رہیں۔ نرگس کو حکومت ہند کی طرف سے ۱۹۸۰ء میں پدم شری کا اعزاز بھی ملا تھا اور سابقہ وزیر اعظم شریمتی اندرا گاندھی سے ان کے ذاتی تعلقات بھی تھے۔ شریمتی نرگس دت اور سنیل دت نے ہمیشہ کانگریس اور اندرا فیملی کی حمایت کی ہے، شریمتی دت کو جب کینسر کے علاج کے لئے امریکہ جانا پڑا تو سنیل دت نے ان کی خدمت اور تیمارداری میں دن رات ایک کر دیا اور اپنے سارے کام، سارے پروگرام کینسل کر کے نرگس دت کو بچانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر خدا کی مرضی کے آگے انسان کی کب چلی ہے؟ لہٰذا نرگس دت ۳رمئی ۱۹۸۱ء کے دن سنیل دت کو اکیلا چھوڑ کر چلی گئیں اور اس طرح سنیل دت کا سب سے عزیز دوست، محسن اور ہمدرد اس سے جدا ہو گیا۔ سنیل دت کی سیکولر شخصیت کی سب سے بڑی خوبی اسی وقت لوگوں کے سامنے آئی جب اس نے نرگس دت کی وصیت کے مطابق ان کی اسلامی رسوم کے مطابق تدفین وغیرہ کی۔

سنیل دت عزم اور حوصلہ کا ہی دوسرا نام تھا۔ جب ۱۹۸۱ء میں کینسر کے موذی مرض سے نرگس کا انتقال ہو گیا تو وہ جیسے ٹوٹ سے گئے۔ مگر جلد ہی انہوں نے خود پر قابو پایا اور اسی موضوع پر فلم ''درد کا رشتہ'' بنائی، جو اپنے آپ میں ایک بہترین فلم ثابت ہوئی۔ سنیل دت نے اس فلم کی تمام آمدنی کینسر اسپتال میں بطور عطیہ دے دی۔ اس

کے علاوہ ٹاٹا میموریل اسپتال میں کینسر وارڈ نرگس دت کے نام پر کھلوایا تاکہ کینسر جیسے موذی مرض سے حتی الامکان جنگ جاری رکھی جا سکے۔

بعض اتفاق بھی بڑے عجیب ہوتے ہیں۔ فلمساز و ہدایتکار محبوب خان نے راجندر کمار اور سنیل دت کو دو سگے بھائیوں کے طور پر فلم "مدر انڈیا" میں پیش کیا تھا۔ یہ دونوں فلمی دنیا میں کامیاب ہوئے، دونوں نے اپنی اپنی مرضی سے شادی کی۔ دونوں نے آس پاس ہی بنگلے خریدے۔ دونوں کے گھر پہلے ایک ایک لڑکا پیدا ہوا اور بعد میں دو دو لڑکیاں اور چوتھی کوئی اولاد نہیں ہوئی۔ دونوں نے اپنے اپنے بنگلوں میں اپنے اپنے تھیٹر بنوائے۔ دونوں پروڈیوسر بنے، دونوں نے اپنے اپنے لڑکوں کے لئے فلم بنائی اور دونوں کے لڑکے ہیرو بنے۔ دونوں نے لڑکوں کی شادی کی اور بعد میں راجندر کمار کے لڑکے کمار گوروَ کی شادی سنیل دت کی لڑکی نمرتا دت سے ہوئی اور دونوں ایک دوسرے کے سمدھی بنے۔ یہ سب حقیقتیں ہیں مگر حسین اتفاق بھی......!

سابق وزیر اعظم اندرا گاندھی کے قتل کے بعد سنیل دت نے عملی سیاست میں حصہ لینے اور کانگریس (آئی) کو تقویت پہنچانے اور نئے وزیر اعظم شری راجیو گاندھی کے ہاتھ مضبوط کرنے کا مستحکم ارادہ کر لیا اور اسی غرض سے پارلیمنٹ کے الیکشن میں بمبئی سے کانگریس کے امیدوار کی حیثیت سے حصہ لیا۔ حالانکہ ان کے مقابلے پر بہت مشہور اور مقبول سیاسی شخصیت رام جیٹھ ملانی تھے۔ مگر سنیل دت کی اپنی شخصیت اور ہردلعزیزی اور اُن کی سماجی خدمت ایسے میں اُن کے کام آئی اور وہ بڑے شاندار طریقے سے فتح حاصل کر کے ۱۹۸۴ء میں پہلی بار پارلیمنٹ کے ممبر کی حیثیت سے ملک وقوم کی خدمت کرنے کے لئے میدانِ عمل میں اُتر آئے۔ ۱۹۸۶ء میں سنیل دت کو حکومت ہند کی طرف سے "پدم شری" سے نوازا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۸۹ء اور پھر ۱۹۹۱ء میں اُنہوں نے عوامی خدمت کے بل بوتے پر الیکشن جیتے اور اپنی نمائندگی کو برقرار رکھا۔ ۱۹۹۲ء میں بمبئی بم دھماکوں میں اپنے اداکار بیٹے سنجے دت کے ٹاڈا مقدمات میں الجھنے کی وجہ سے سنیل دت نے ۱۹۹۶ء اور ۱۹۹۸ء کے انتخابات میں حصہ نہیں لیا۔ لیکن

۱۹۹۹ء اور ۲۰۰۴ء میں انہوں نے اپنے حلقے سے پھر نمایاں کامیابی حاصل کی اور ۲۰۰۴ء میں کانگریس کی یو۔پی۔اے۔حکومت نے سنیل دت کو امور نوجوانان اور کھیل کا وزیر مقرر کیا۔ سیاست میں رہ کر انہوں نے اپنی ذمہ داریوں کو بخوبی انجام دیا اور خدمت خلق کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔

سنیل دت ایک سوشل ورکر کے طور پر ہمیشہ ہر وقت پیش پیش رہتے تھے۔ ملک وقوم پر جب بھی کوئی مشکل آتی تھی تو دلیپ کمار اور سنیل دت ہمیشہ آگے بڑھ کر ملک کی خدمت میں لگ جاتے تھے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب پنجاب میں دہشت گردی نے سر اُبھارا تو سنیل دت نے امن اور شانتی کا پیغام لے کر بمبئی سے امرتسر کے گولڈن ٹیمپل تک پیدل مارچ کیا۔اُن کے سینے میں شروع سے ہی ایک دردمند انسان کا دل دھڑکتا تھا۔ابھی وہ روزگار کی تلاش میں بمبئی کی سڑکوں پر بھٹک ہی رہے تھے اور پاکستان سے آئے ہوئے ایک مہاجر سے زیادہ ان کی حیثیت نہیں تھی۔ وہ گیٹ وے آف انڈیا کے پاس کھڑے تھے اور ان کے سامنے ایک شخص سمندر میں گر پڑا تھا۔ وہاں اچھا خاصا مجمع اکٹھا ہو گیا اور تمام لوگ لاچاری سے ڈوبتے ہوئے شخص کو دیکھ رہے تھے۔لیکن کسی میں اتنی ہمت نہ تھی کہ وہ طوفان زدہ سمندر کا مقابلہ کر کے ڈوبتے ہوئے شخص کو بچاتا۔ سنیل دت بھی اسے بے بسی سے دیکھ رہے تھے، کیوں کہ خود اُن کو تیرنا نہیں آتا تھا۔لیکن وہ بہت دیر تک اپنے اوپر قابو نہ رکھ سکے اور سمندر میں چھلانگ لگادی۔ کچھ ساعتوں کے لئے انہوں نے موت کو اپنی آنکھوں کے سامنے ناچتے ہوئے دیکھا اور جب وہ خود بھی ڈوبنے لگے تو جیسے اُن میں بلا کی قوت پیدا ہو گئی اور انہوں نے موت کا مقابلہ کرنا شروع کر دیا۔ سمندر میں پھینکی گئی ایک رسّی کی مدد سے انہوں نے ڈوبتے ہوئے شخص کو بچا لیا۔ ان کا یہ عمل اس وقت اس لئے بھی زیادہ قابل قدر مانا گیا کیوں کہ اس وقت اُن کے کاندھوں پر ایک ماں، ایک چھوٹی بہن اور ایک چھوٹے بھائی کی ذمہ داری بھی تھی، جو اس وقت ہریانہ کے جمنانگر کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔

اس طرح انہوں نے یکم اگست ۱۹۵۰ء کو بمبئ کے تمام اخبارات کی شہ سرخیوں میں جگہ بنا کر لوگوں کو چونکا دیا تھا۔ ۱۹۸۹ء میں بمبئ کا شیرف بننے کے بعد سنیل دت کو عام لوگوں کی زندگی کو زیادہ قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ انہوں نے لوگوں کی تکلیفیں دیکھیں، جھونپڑ پٹیاں دیکھیں، برسات میں لوگوں کی جھونپڑیوں کو ڈھتے دیکھا، گرمی میں پانی کے لئے دُور دُور سے سر پر گھڑے لئے لوگوں کو بھٹکتے دیکھا...... اُس ایک برس میں سنیل دت نے زندگی کا سارا درد محسوس کر لیا، تب اُنہیں اپنی زندگی اور اُس کی آسائشیں خود اپنی ہی آنکھوں میں چبھنے لگیں۔ شاید وہی دَرد اُن کے سینے میں آخری دم تک کروٹیں بدلتا رہا اور وہ مستقل سماج کی خدمت کرتے رہے۔

اِسے کہتے ہیں وقت کی ہیرا پھیری، ایک چھوٹے سے دیہات میں پیدا ہونے والے ریڈیو اناؤنسر کو وقت نے پارلیمنٹ میں بیٹھا دیا۔ اِس میں جتنا ہاتھ وقت کا ہے، اُس سے کہیں زیادہ سنیل دت کی اپنی محنت، لگن اور جذبۂ ہمدردی کا بھی دخل ہے۔

تین چار دن کی مسلسل بیماری کے بعد ۲۵ رمئی ۲۰۰۵ء کی صبح تقریباً گیارہ بج کر چالیس منٹ پر سنیل دت کو نیند میں دل کا دورہ پڑا، اور ایک فنکار، ایک سماجی خدمتگار اور کئی فلموں کا خالق اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملا۔ سنیل دت کی آخری رسوم میں ملک کے وزیر اعظم ڈاکٹر منموہن سنگھ اور یو۔پی۔اے۔ کی چیئرپرسن شریمتی سونیا گاندھی اور جمہوریہ ہند کے علاوہ کئی سرکردہ لیڈروں اور وزیروں نے شرکت کی۔ فلم انڈسٹری کی تقریباً تمام ہستیاں اس فرشتہ صفت انسان کو الوداع کہنے آئیں۔ پورے ملک میں ایک دن کے سوگ کا اعلان کیا گیا اور ملک و بیرون ملک سے بے شمار تعزیتی پیغامات آئے۔ سنیل دت کیوں کہ کابینہ میں وزیر تھے، لہٰذا ان کو پورے سرکاری اعزاز کے ساتھ نذرِ آتش کیا گیا۔ سیاست میں انہیں سیکولر نظریات کا چمپئن کہا جاتا تھا اور ان کی شبیہ ہمیشہ بے داغ رہی۔ سنیل دت کو سچے عوامی خدمتگار، ایک بہترین انسان اور دردمند سیاستداں کے طور پر ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

○○
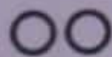
ساحر لدھیانوی

''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں کل کے واسطے''......کل کے لئے خواب بُننے والا وہ مردِ مجاہد، وہ فولادی ارادوں والا انسان، جس نے کبھی حالات سے ہار نہیں مانی، جس نے انتہائی مایوسی اور کشمکش کے دنوں میں بھی اُمید کی روشنی اپنے دل و دماغ میں بسائے رکھی، اب ایک ایسے خواب میں ڈوبا ہوا ہے جس کی تعبیر وہ کسی سے کبھی معلوم نہ کر سکے گا۔

ساحر لدھیانوی کے دادا فتح محمد لدھیانہ کے ایک بہت بڑے رئیس زمیندار تھے۔ ساحر لدھیانوی کے والد کا نام چودھری فضل محمد تھا۔ چودھری فضل محمد نے ۱۹۲۰ء میں ایک معمولی خاندان کی لڑکی سردار بیگم سے نکاح کر لیا جبکہ اُن کی پہلے سے ہی کئی بیویاں موجود تھیں۔ مگر وہ اپنے علاقے کے ایک بڑے جاگیردار تھے اور کئی کئی بیویاں رکھنا اُن کے لیے بڑی شان و شوکت کی بات تھی۔ سردار بیگم کشمیری نسل کی تھیں۔ اس طرح ۸ر مارچ ۱۹۲۱ء کو سردار بیگم سے جو بیٹا پیدا ہوا، چودھری فضل محمد نے اُس کا نام عبدالحئی رکھ دیا۔ چند برسوں کے بعد ہی سردار بیگم کا اپنے شوہر فضل محمد سے جھگڑا ہو گیا اور وہ عبدالحئی کو ساتھ لے کر اپنے بھائیوں کے گھر چلی گئیں۔ اُس وقت عبدالحئی کی عمر صرف سات برس تھی جب چودھری فضل محمد نے اُس کو اپنی سرپرستی میں لینے کے لیے عدالت میں درخواست لگا دی۔ عدالت میں جب عبدالحئی سے پوچھا گیا کہ وہ والدین میں سے کس کے ساتھ رہنا چاہتا ہے، تو اُس نے اپنی کم سخن ماں کی طرف اشارہ کر دیا اور اس طرح عبدالحئی ہمیشہ کے لیے اپنے باپ سے دستبردار ہو کر اپنی ماں کے حصے میں آ گیا۔

شہر لدھیانہ، جسے عبدالحئی کے مولد ہونے کا فخر حاصل ہے، عبدالحئی نے جب اس

شہر کے تہذیبی اور سماجی ماحول میں شعور کی آنکھیں کھولیں تو وہاں ایک طرف زوال یافتہ جاگیرداریت کی فرسودہ باقیات تھیں اور انگریزی سامراج کے زیر سایہ ایک نیم سرمایہ دارانہ صنعتی نظام تشکیل پا رہا تھا، اور دوسری طرف بے زمین کسان تھے جنہیں بھر پیٹ روٹی بھی مشکل سے میسّر آتی تھی۔ عبدالحئ کے ذہن پر اس سب کا تاثر بچپن سے ہی تھا۔

لدھیانہ کے خالصہ اسکول میں ۱۹۲۸ء میں عبدالحئ کا داخلہ ہوگیا اور جب ۱۹۳۷ء میں وہ ہائی اسکول کر کے انٹر میں داخل ہوا تو شعر وشاعری کی طرف راغب ہوگیا اور پہلا شعر کہہ کر عبدالحئ ساحرؔ لدھیانوی بن گیا۔ یہاں اس کی ادبی تربیت ہریانہ کے ایک اُستاد فیاضؔ ہریانوی نے کی، جو خود بھی شعر وشاعری کا ذوق رکھتے تھے۔ ۱۹۳۹ء میں انٹر پاس کرنے کے بعد عبدالحئ عرف ساحرؔ لدھیانوی نے تعلیمی سلسلہ مزید جاری رکھتے ہوئے لدھیانہ کے گورنمنٹ کالج میں داخلہ لے لیا۔ شعر وشاعری سے شوق رکھتے ہوئے ساحرؔ نے یہاں سیاست اور معاشیات کے مضامین پڑھنے میں بھی خاصی دلچسپی دکھائی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب ہندوستان کی تحریکِ آزادی اپنے شباب پر تھی اور انگریز بھی اپنے ظلم و جبر کا استعمال اسلحہ اور سازشوں کے زور پر دل کھول کر کر رہے تھے۔ اُدھر باپ کی ظالمانہ روش سے ساحرؔ کے دل میں جاگیردارانہ نظام کے تئیں نفرت کا بیج پہلے ہی بویا جا چکا تھا۔ لہٰذا یہ سب چیزیں ساحرؔ کی شاعری میں اس طرح گھل مل گئیں کہ اس کا رومان بھی حالاتِ حاضرہ کی بھٹّی میں تپ کر اُس کے شعروں میں ڈھلنے لگا۔

ساحرؔ اپنی والدہ کی سرپرستی اور نگرانی میں تعلیم پاتے رہے۔ اسکول اور کالج میں اُن کا شمار اچھے اور محنتی طالب علموں میں ہوتا تھا۔ اردو اور فارسی کی تعلیم انہوں نے مولانا فیاضؔ ہریانوی سے حاصل کی اور اُن ہی کے فیض تربیت سے نہ صرف ساحرؔ کو اِن زبانوں پر عبور حاصل ہوگیا بلکہ شعر وادب میں بھی انہیں خاصی دلچسپی پیدا ہوگئی۔

ساحرؔ کا ابھی کالج میں بی۔اے کا پہلا ہی سال تھا کہ کالج کے پرنسپل کی لڑکی سے اُسے عشق ہوگیا۔ جس کی پاداش میں ساحرؔ کو کالج سے نکال دیا گیا۔ برسوں بعد جب ساحرؔ ہندوستان کا ایک بڑا شاعر اور فلمی دُنیا کا مقبول ترین نغمہ نگار بن گیا تو اُسی

کالج میں اُس کے اعزاز میں ایک جلسہ ہوا، جہاں ساحرؔ نے اپنی مشہور زمانہ نظم ''نذرِ کالج'' پڑھی، جس کے آخری مصرعے یوں تھے......

لیکن ہم ان فضاؤں کے پالے ہوئے تو ہیں
گر یاں نہیں تو یاں کے نکالے ہوئے تو ہیں

بی۔اے کے آخری سال میں وہ لدھیانہ سے لاہور منتقل ہو گئے، جہاں انہوں نے دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا اور اسٹوڈنٹس فیڈریشن کے صدر چنے گئے۔ ساحرؔ کا اولین مجموعۂ کلام ''تلخیاں'' زمانۂ طالب علمی ہی میں شائع ہو چکا تھا اور وہ ایک اُبھرتے ہوئے نوجوان شاعر کی حیثیت سے ادبی دُنیا میں اپنی شناخت قائم کر چکے تھے۔

۱۹۴۴ء میں طالب علمی کا ہی زمانہ تھا جب ساحرؔ لدھیانوی کا پہلا شعری مجموعہ ''تلخیاں'' شائع ہوا۔ ساحرؔ کا یہ مجموعہ اتنا مقبول ہوا کہ شاید ''دیوانِ غالبؔ'' کے بعد سب سے زیادہ اردو شاعری میں فروخت ہونے والی کتاب ''تلخیاں'' ہی ہے۔ اس مجموعے کے اب تک ۵۰؍ سے زیادہ ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں، جس کے پہلے ہی صفحے پر ساحرؔ کا یہ شعر درج ہے......

دنیا نے تجربات و حوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہا ہوں میں

اِس ایک شعر سے ہی ساحرؔ کی شاعری کا رنگ و آہنگ اپنا تعارف کرا دیتا ہے۔ اِس سے پہلے اور نہ بعد میں کسی اردو شاعر کو یہ امتیاز حاصل ہوا کہ اتنی کم عمر میں اتنی بڑی تعداد میں کسی کا کوئی شعری مجموعہ فروخت ہوا ہو۔

لدھیانہ گورنمنٹ کالج سے نکالے جانے کے بعد جب ساحرؔ لاہور چلے گئے اور وہاں دیال سنگھ کالج میں داخلہ لے لیا تو اس کے ساتھ ہی لاہور میں مکتبہ اردو والوں کا رسالہ ''ادب لطیف'' میں چالیس روپے ماہانہ تنخواہ پر ساحرؔ ایڈیٹر بھی مقرر ہو گئے۔ لاہور ہی میں ساحرؔ کو ''سویرا'' اور ''شاہکار'' رسالوں کی ادارت کے مواقع بھی ملے۔ اُس وقت تک پنجابی کی مشہور شاعرہ اور ناول نگار امرتا پریتم کی شادی ہو چکی تھی اور وہ

آل انڈیا ریڈیو، لاہور میں اناؤنسر تھیں۔ لاہور سے پہلے ساحر کی ایک ملاقات امرتا پریتم سے امرتسر کے قریب پریت نگر کے ایک ادبی سالانہ جلسے میں ہو چکی تھی۔ لاہور میں امرتا اور ساحر کی دوستی ادبی حلقوں میں کافی گفتگو کا موضوع بنی رہی۔ خود امرتا پریتم نے اپنی سوانح ''رسیدی ٹکٹ'' میں ساحر سے اپنی دوستی کے واقعات بڑی ایماندارانہ بے باکی کے ساتھ تحریر کیے ہیں۔

۱۹۸۲ء سے ۱۹۸۸ء کے درمیان، میں خود جب ''سٹار پبلی کیشنز'' کے فلمی ماہنامہ ''مووی اسٹار'' میں مدیر تھا تو بارہا امرتا پریتم کے یہاں میرا جانا ہوا، اور مجھے یہ اعزاز بھی حاصل رہا کہ میں نے کئی بار امرتا اور اِمروز کے ہاتھوں کی بنائی ہوئی چائے پی ہے۔ جب بھی میں امرتا پریتم کے گھر گیا، میں نے ہر بار چاروں طرف، وہاں کے درودیوار پر، ڈرائنگ روم میں اور اِمروز کی پینٹنگ میں، وہاں کی سجاوٹ اور فرنیچر میں، غرض ہر جگہ ساحر کی موجودگی کو محسوس کیا ہے۔ میں نے امرتا پریتم کے بیٹے کے چہرے پر ہر بار ساحر کے نقوش کی جھلک محسوس کی ہے۔ ایک بار جب میں نے امرتا سے یادگار کے طور پر آٹوگراف کی فرمائش کی تو انہوں نے پنجابی زبان میں لکھا......

''پرچھائیوں کے پیچھے بھاگنے والو! سینے میں جو آگ سلگتی ہے،
اس کی کوئی پرچھائی نہیں ہوتی۔''

یہ محض اتفاق ہو سکتا ہے کہ بمبئی میں ساحر کے مکان کا نام بھی ''پرچھائیاں'' تھا اور اس کی ایک مشہور نظم کا عنوان بھی۔ بہرحال، یہاں میرا مقصد امرتا پریتم اور ساحر کی دوستی کی تفصیلات میں جانے کا ہرگز نہیں ہے۔ کچھ دنوں کے بعد ساحر لدھیانہ آ گئے اور پھر جنوری ۱۹۴۶ء میں بمبئی چلے گئے۔ ہندوستان کی آزادی کے نتیجے میں جو فرقہ وارانہ آگ پھیلی، اس میں ساحر بھی جھلسے کیونکہ ان کی ماں سردار بیگم فسادات میں کہیں کھو گئیں۔ ساحر بمبئی چھوڑ کر لاہور گئے اور کافی جدوجہد کے بعد ماں کو تلاش کر لیا۔ ستمبر ۱۹۴۷ء میں جب ساحر دوبارہ لاہور گئے تو تقسیم ہند کے نتیجے میں امرتا پریتم اپنے شوہر اور سسرال والوں کے ساتھ ہندوستان آ چکی تھیں۔ ساحر بھی جون

۱۹۴۸ء میں لاہور سے دہلی منتقل ہو گئے اور تقریباً ایک برس تک دہلی میں رہے۔ دہلی میں ساحر لدھیانوی بدر صاحب اور محمد یوسف جامعی صاحب کے ادارے حالی پبلشنگ ہاؤس سے وابستہ ہو گئے اور یہیں سے انہوں نے ماہنامہ ''شاہراہ'' کا اجراء کیا۔ پرکاش پنڈت اس رسالے کے اسسٹنٹ ایڈیٹر تھے۔ اسی درمیان ساحر سے امرتا کی دوستی میں شدت آ گئی، اور شاید یہی وہ زمانہ تھا جب امرتا پریتم کی اپنے شوہر سردار پریتم سنگھ سے علیحدگی ہو گئی تھی۔ شاید امرتا پریتم ساحر سے شادی کرنا چاہتی تھیں مگر ساحر اپنے ماضی کی تلخیوں سے ذہنی طور پر آزاد نہیں ہو سکے تھے۔ تب امرتا پریتم نے دل سے دُعا کی کہ اس کا ہونے والا بیٹا ساحر کی شکل لے کر پیدا ہو، خدا نے اس کی دعا قبول کی اور امرتا نے بھی اس دوران ساحر کو اتنا سوچا کہ جب اُس کا بیٹا پیدا ہوا تو اُس کی شکل کافی حد تک ساحر سے ملتی تھی۔

جب ۱۹۴۸ء میں ساحر نے دہلی سے ماہنامہ ''شاہراہ'' کا اجراء کیا تو اس کے ساتھ ہی رسالہ ''پریت کی لڑی'' کی بھی ادارت کی۔ ان رسائل کے ذریعہ انہوں نے نئے لکھنے والوں کی ہمت افزائی اور رہنمائی کی۔ ۱۹۴۹ء میں ساحر جب دوسری بار بمبئی گئے تو وہاں ہندوستانی کلامندر کی فلم ''آزادی کی راہ پر'' کے لیے گانے لکھوانے کی غرض سے فلمساز کلونت رائے نے ساحر کو بلوایا تھا۔ اس فلم کے چار گانے ساحر نے لکھے تھے۔ پہلے گانے کے بول تھے...... ''بدل رہی ہے زندگی......'' مگر ان گانوں کو زیادہ مقبولیت نہیں ملی۔ ۱۹۵۰ء میں ساحر نے مستقل طور پر دہلی کو الوداع کہہ کر بمبئی میں سکونت اختیار کر لی اور فلمی نغمہ نگاری پر پوری توجہ لگا دی۔ ۱۹۴۹ء کے بعد فلمی زندگی کی مصروفیات نے ساحر کو اِس طرح گھیر لیا کہ تخلیقی شاعری کے لئے مناسب وقت نکالنا اُن کے لئے مشکل ہو گیا۔ اس کی تلافی انہوں نے اس طرح کی کہ فلمی گیتوں کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنا لیا اور فلموں کے لئے انہوں نے جو گیت اور غزلیں لکھیں، ان میں اپنے سیاسی اور سماجی تصورات کے اظہار کی بھی گنجائش نکال لی۔

۱۹۵۸ء میں ساحر لدھیانوی نے فلمساز رمیش سہگل کی فلم ''پھر صبح ہوگی'' کے نغمے

لکھے۔ یہ فلم عالمی شہرت یافتہ ناول نگار دوستوسکی کے مشہور زمانہ ناول "کرائم اینڈ پنشمینٹ" کے مرکزی خیال پر بنائی گئی تھی۔ راجکپور کے پسندیدہ میوزک ڈائریکٹر شنکر جے کشن اس فلم کا میوزک تیار کرنے والے تھے۔ مگر ساحؔر نے کہا کہ اس فلم کا میوزک وہی بنائے گا جس نے مذکورہ ناول پڑھا ہوگا۔ تب موسیقار خیام کو اس فلم کا میوزک دیا گیا اور انہوں نے ساحؔر کے نغمہ...... "وہ صبح کبھی تو آئے گی......" کی دھن تیار کی، اور مکیش نے اس نغمے کو بہت خوبصورت انداز میں گایا ہے۔ اس کے بعد کئی فلموں میں ساحؔر کے گیتوں کو خیام نے اپنی دھنوں سے سجایا جن میں "کبھی کبھی" بھی ایک اہم فلم ہے۔

ساحؔر نے نہ صرف یہ کہ اپنی شاعری کے معیار کو گرنے نہیں دیا، بلکہ فلمی شاعری کے معیار کو بھی بلند کیا اور اُس بدذوقی کی روک تھام کی جسے فلم بینوں پر مسلط کیا جا رہا تھا۔ فلمی دُنیا سے وابستہ ہونے کے بعد اگرچہ ان کی شعر گوئی کی رفتار نسبتاً کم ہوگئی لیکن شاعر کی حیثیت سے ان کی مقبولیت میں کبھی کوئی کمی نہیں ہوئی۔ بہت کم ادیبوں اور شاعروں کو ان کی زندگی میں اتنی شہرت اور عزت حاصل ہوتی ہے جس کے وہ مستحق ہوتے ہیں۔ اس معاملے میں ساحؔر لدھیانوی اردو شاعروں میں سب سے زیادہ خوش قسمت رہے ہیں۔ ساحؔر اپنے دَور میں نہ صرف ہندوستان کے سب سے محبوب اور ہردلعزیز شاعر تھے، بلکہ عالمی اہمیت کے شعراء میں انہوں نے اپنا مقام پیدا کر لیا تھا۔ دُنیا کی مختلف زبانوں جیسے انگریزی، فرانسیسی، چیک، روسی، فارسی اور عربی میں اُن کی شاعری کے ترجمے کیے جا چکے ہیں۔

ساحؔر جتنے بڑے شاعر تھے، اُتنے ہی عظیم انسان بھی تھے۔ ان کی زندگی اور ان کے فن میں کوئی بھید بھاؤ نہیں تھا۔ اپنی شاعری میں انہوں نے انسان اور انسانیت کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ خود بھی اُس معیار پر بڑی حد تک پورا اُترتے تھے۔

انہوں نے اپنی ادبی شاعری میں جہاں عورت کی عزت وعصمت کی حمایت کی ہے، وہیں اپنے فلمی گیتوں میں بھی وہ عورت پر ہونے والے ظلم وستم کے خلاف کھل کر آواز اُٹھاتے ہیں۔ فلم "پیاسہ" کا نغمہ...... "یہ کوچے یہ نیلام گھر دلکشی کے......" اور فلم "سادھنا"

کا نغمہ...... ''عورت نے جنم دیا مردوں کو......'' اور فلم ''انصاف کا ترازو'' میں ساحر کا لکھا گیت...... ''لوگ عورت کو فقط جسم سمجھ لیتے ہیں......'' اس بات کے بہترین شاہد ہیں۔ وہ زندگی بھر جنگ وجدل کے مخالف رہے۔ وہ جانتے تھے کہ سیاستداں اکثر اپنے سیاسی مقاصد میں کامیابی حاصل کرنے کے لئے ہزاروں بے گناہوں کا خون بہا دیتے ہیں۔ درحقیقت وہ قاتل اور لٹیرے ہیں، وہ انسانی جان کی قیمت نہیں جانتے۔

ساحر شروع سے ہی انجمن ترقی پسند مصنفین سے وابستہ ہو گئے تھے، مگر ساحر کی انقلابی اور سیاسی شاعری حد سے بڑھی ہوئی جذباتیت اور نعرہ بازی سے پاک ہے۔ انہوں نے بے خوفی کے ساتھ دوٹوک انداز میں براہ راست اپنے خیالات اپنی شاعری کے ذریعہ پیش کر دیئے ہیں۔

ساحر کی شاعری محض زلف ورخسار کی آئینہ دار نہیں بلکہ پُر خیال ہے اور وہ انسان کو ذہنی خوراک مہیا کراتی ہے۔ اس کے دل ودماغ میں نئی نئی فکر کے بیج بوتی ہے، نئے نئے احساسات کو جنم دیتی ہے۔ وہ یقیناً ساحر کی روح کی آواز ہے۔ وہ اُس شاعر کی پکار ہے جس نے اپنی زندگی لحہ لحہ انسانی محبت کے چراغ روشن کرتے ہوئے گزار دی۔ ساحر کی بے پناہ مقبول نظموں میں ''تاج محل'' کو اتنا پسند کیا جاتا تھا کہ جب کبھی کسی مشاعرے میں ساحر مائک پر آتے تھے تو لوگ ''تاج محل تاج محل'' کہہ کر چلّانے لگتے تھے۔ حالانکہ تاج محل پر ساحر سے پہلے اور بعد میں بھی کئی شاعروں نے نظمیں لکھی ہیں، مگر اردو شاعری میں ساحر تنہا ایسے شاعر ہیں جنھوں نے صدیوں سے محبت کی عظیم اور لاثانی یادگار مانے جانے والے ''تاج محل'' کے سائے میں اپنے محبوب سے ملنے سے انکار کر دیا اور تاج محل کے بارے میں ایک بالکل نیا اور اچھوتا نظریہ عوام کے سامنے پیش کیا۔ حالانکہ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اس نظم کو لکھنے سے پہلے تک ساحر نے تاج محل دیکھا بھی نہیں تھا۔

ساحر لدھیانوی اور مجروح سلطانپوری سے پہلے فلمی نغمہ نگاری میں ٹھیٹ ادبی قسم کی لفظیات اور ادبی نظموں کے استعمال کی قطعی گنجائش نہیں تھی۔ لیکن ساحر نے اپنی تمام ادبی نظموں کو فلموں میں اس خوبصورتی کے ساتھ استعمال کیا کہ وہ فلم کا حصہ ہی معلوم

ہوتی ہیں۔ جیسے فلم ''گمراہ'' میں سنیل دت نے مہندر کپور کی آواز میں ساحر کی نظم پڑھی...... ''چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں......''، یہ ساحر کا ہی جگر ہے جو وہ اس طرح اپنی محبوبہ سے مخاطب ہوتا ہے، ورنہ تو اردو شاعری محبوبہ کے ناز نخرے اُٹھانے اور اس کی خوشامدوں سے بھری پڑی ہے۔ اسی طرح فلم ''پیاسا'' میں ان کی مشہور زمانہ نظم ''چکلے'' بخوبی استعمال ہوئی ہے اور یہ دونوں نظمیں ہی فلم کا حصہ معلوم ہوتی ہیں۔ اسی طرح فلم ''لیلیٰ مجنوں'' کے ایک نغمے کا یہ بند ملاحظہ ہو......

بہت رنجور ہے یہ، غموں سے چور ہے یہ

خدا کا خوف کھاؤ، بہت مجبور ہے یہ

......اب اس بند میں لفظ ''رنجور'' ساحر لدھیانوی جیسا نغمہ نگار ہی استعمال کر سکتا ہے۔

ساحر اپنی زندگی میں ایک چیلنج تھے ہمارے روایتی شاعروں اور ہماری روایتی شاعری کے لئے، ہمارے روایتی مجنوں کے لئے اور ہمارے روایتی فرسودہ معاشرے کے لئے۔ اس نے اپنا قلم اُٹھایا تو ماضی کی عشقیہ شاعری کو پسینہ آ گیا۔ معاشرے کی فرسودہ روایات کی دھجیاں بکھر گئیں۔ ساحر نے اردو شاعری میں ایک نئے دَور کا آغاز کیا۔ انہوں نے خواص کے بجائے عوام کے لئے انقلابی شاعری کے دروازے کھول دیئے اور اپنی شاعری کو عوامی رنگ میں پیش کیا۔ موجودہ زندگی کے مسائل اور استحصال کو جتنے خوبصورت اور سہل انداز میں ساحر نے پیش کیا ہے، کوئی دوسرا شاعر پیش نہیں کر سکا۔

ساحر اپنے قریبی دوستوں میں شہزادے کے نام سے مشہور تھے، لہٰذا بے پناہ مخلص ہونے کے باوجود ان میں خودداری اور انا کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، شاید اس لیے بھی کہ وہ بچپن سے ہی بہت ضدی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے زندگی کا بڑا حصہ محرومیوں اور نامرادیوں میں گزارا۔ مگر ان کی تخلیقات نے جو عزت اور شہرت، اور بعد میں دولت بھی ان کو دلوائی، وہ بہت کم ہی اردو شاعروں کے حصہ میں آئی ہے۔

ساحر لدھیانوی کی اَنا اور خودداری کی ہی بات تھی جو گلوکارہ لتا منگیشکر کے ساتھ ان کے کاروباری اختلافات ہو گئے اور ساحر نے ایک نئی گلوکارہ سدھا ملہوترہ کو آگے

بڑھانا شروع کیا۔ اسی دوران سدھا ملہوترہ سے ان کے عشق کی داستانیں عام ہونے لگیں، اور دونوں شادی کرنے کے لیے آمادہ بھی ہو گئے۔ مگر سدھا ملہوترہ کے والدین اس شادی کے خلاف تھے۔ لہٰذا انہوں نے سدھا کی شادی کہیں دوسری جگہ طے کر دی۔ سدھا ملہوترہ کی ضد پر ہی ساحرؔ اس کی منگنی میں شریک ہوئے اور انہوں نے وہاں بھری محفل میں اپنی مشہور زمانہ نظم ''چلو اک بار پھر سے اجنبی بن جائیں ہم دونوں......'' سنائی اور سدھا ملہوترہ دلہن بنی زار و قطار روتی رہی۔ کچھ دنوں تک یہ بھی سنا جاتا رہا کہ سدھا ملہوترہ سے پہلے ساحرؔ لتا منگیشکر سے شادی کرنا چاہتے تھے اور اس ناکامی کی وجہ سے ہی ساحرؔ اور لتا میں اختلافات ہوئے تھے۔

ساحرؔ کی شاعری کے ہر معاشقے کا انجام ناکامی کی شکل میں برآمد ہوتا ہے اور ساحرؔ اس ناکامی کا ذمہ دار اُس سماجی ماحول کو قرار دیتے ہیں جس پر سیاست کا رنگ چڑھا ہوا ہے۔ لتا منگیشکر سے ساحرؔ کے عشق کی گواہ اُن کی وہ نظم ہے جو رسالہ ''فنکار'' میں ''تیری آواز'' کے عنوان سے شائع ہوئی اور جو تلخیاں کے بعد کے ایڈیشنز میں شائع ہوئی۔

یوں اچانک تری آواز کہیں سے آئی
جیسے پربت کا جگر چیر کے جھرنا پھوٹے
یا زمینوں کی محبت میں تڑپ کر ناگاہ
آسمانوں سے کوئی شوخ ستارہ ٹوٹے

شہد سا گھل گیا تلخابۂ تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ صدائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگیں ویرانے میں

تو مرے پاس نہ تھی پھر بھی سحر ہونے تک
تیرا ہر سانس مرے جسم کو چھوکر گزرا

قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

اب یہی ہے تجھے منظور تو اے جان قرار
میں تری راہ نہ دیکھوں گا سیہ راتوں میں
ڈھونڈھ لیں گی مری ترسی ہوئی نظریں تجھ کو
نغمہ و شعر کی اُمڈی ہوئی برساتوں میں

(نظم: تیری آواز)

لتا سے اپنی محبت کا اظہار ساحر نے اپنی ایک اور نظم "انتظار" میں بھی کیا ہے
اور یہ نظم بعد میں فلم میں بھی استعمال ہوئی ہے......

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

دور وادی میں دودھیا بادل
جھک کے پربت کو پیار کرتے ہیں
دل میں ناکام حسرتیں لے کر
ہم ترا انتظار کرتے ہیں

ان بہاروں کے سائے میں آجا
پھر محبت جواں رہے نہ رہے
زندگی تیرے نامرادوں پر
کل تلک مہرباں رہے نہ رہے
روز کی طرح آج بھی تارے
صبح کی گرد میں نہ کھو جائیں

آ، ترے غم میں جاگتی آنکھیں
کم سے کم ایک رات سو جائیں

چاند مدھم ہے آسماں چپ ہے
نیند کی گود میں جہاں چپ ہے

(نظم: انتظار)

ساحؔر لدھیانوی جس لب و لہجے میں شاعری کرتے تھے، وہ الگ ہی پہچانا جاتا ہے۔ ۱۸؍فروری ۱۹۶۹ء میں مرزا اسداللہ خاں غالبؔ کے صد سالہ جشن پیدائش پر دہلی کے تاریخی لال قلعہ کے ایک عالیشان مشاعرے میں ساحؔر نے جو نظم پڑھی، وہ نہ صرف ساحؔر کے لب و لہجے کی غماز ہے بلکہ اس نظم میں اردو زبان کے لیے ساحؔر کے دِلی احساسات کی ترجمانی بھی ہوتی ہے، اور ہمارے اس جمہوری نظام کی آئینہ وری بھی ہوتی ہے کہ کس طرح اس ملک کی پیدا ہوئی، پرورش ہوئی اور یہاں کے محلوں، گلی کوچوں میں بسنے والی زبان کو سیاست کی بدبودار کیچڑ میں رچے بچے سیاستدانوں نے غدار ٹھہرا دیا اور بتیس دانتوں کے درمیان رہتے ہوئے یہ زبان آج بھی غیر محفوظ ہے۔
یہ نظم صرف ساحؔر ہی کہہ سکتے تھے۔ ملاحظہ ہو......

اکیس برس گزرے آزادیٔ کامل کو
تب جاکے کہیں ہم کو غالبؔ کا خیال آیا
تربت ہے کہاں اس کی مدفن ہے کہاں اس کا
اب اپنے سخن پرور ذہنوں میں سوال آیا

سو سال سے جو تربت چادر کو ترستی تھی
اب اس پہ عقیدت کے پھولوں کی نمائش ہے
اردو کے تعلق سے کچھ بھید نہیں کھلتا
یہ جشن یہ ہنگامہ خدمت ہے کہ سازش ہے

جن شہروں میں گونجی تھی غالبؔ کی نوا برسوں
اُن شہروں میں اب اردو بے نام و نشاں ٹھہری
آزادیٔ کامل کا اعلان ہوا جس دن
اس ملک کی نظروں میں غدار زباں ٹھہری

جس عہد سیاست نے یہ زندہ زباں کچلی
اس عہد سیاست کو مرحوموں کا غم کیوں ہو
غالبؔ جسے کہتے ہیں اردو ہی کا شاعر تھا
اردو پہ ستم ڈھاکے غالبؔ پہ کرم کیوں ہو

یہ جشن یہ ہنگامے دلچسپ کھلونے ہیں
کچھ لوگوں کی کوشش ہے کچھ لوگ بہل جائیں
جو وعدۂ فردا پر اب ٹل نہیں سکتے تھے
ممکن ہے کہ کچھ عرصے اس جشن سے ٹل جائیں

یہ جشن مبارک ہو پر یہ بھی صداقت ہے
ہم لوگ حقیقت کے احساس سے عاری ہیں
گاندھی ہو کہ غالبؔ ہو انصاف کی نظروں میں
ہم دونوں کے قاتل ہیں، دونوں کے پجاری ہیں

ساحرؔ کی خودداری کا ایک اور واقعہ اس طرح ہے کہ ایک بار ریش چوپڑا کے کسی فلمی نغمے کی ریکارڈنگ تھی جس میں ساحرؔ بھی موجود تھے، کیونکہ وہ نغمہ ساحرؔ نے ہی لکھا تھا۔ ساحرؔ سے یش چوپڑا کی بہت اچھی دوستی بھی تھی۔ ریکارڈنگ کے وقت جب لتا منگیشکر آئیں تو ان کا بڑا پرتپاک خیرمقدم کیا گیا، گلدستے پیش کیے گئے اور پھولوں کے ہار گلے میں ڈالے گئے۔ جبکہ ساحرؔ کے ساتھ ایسا کچھ نہیں کیا گیا تھا۔ یہ بات ساحرؔ کو بہت ناگوار گزری۔ انہوں نے شام سے ہی خوب شراب پی اور دیر رات ایک بجے

یش چوپڑا کو فون کیا۔ اتنی رات کو فون پر ساحر کی آواز سن کر یش چوپڑا گھبرا گئے۔ ساحر نے یش چوپڑا سے فون پر پنجابی لہجے میں کہا۔ ''اوئے یش! لتا کی آواز بہت خوبصورت ہے نا...... تم ایسا کرو کہ اس کی آواز ریکارڈ کرا لو اور میرے لفظ واپس دے دو۔'' یش چوپڑا نے فون پر ساحر کو سمجھانے کی بہت کوشش کی مگر وہ اپنا ہی جملہ دوہراتے رہے۔

صبح کو یش چوپڑا نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ وہ ساحر کے گھر ''پرچھائیاں'' پہنچے اور اس بات کے لیے ساحر سے معذرت کی۔ صبح تک ساحر کا نشہ بھی اُتر چکا تھا۔ بات آئی گئی ہوگئی اور دونوں کی دوستی لمبے عرصے تک برقرار رہی۔

فلم ''بازی'' کے نغمے ساحر نے لکھے تھے اور موسیقار ایس۔ ڈی برمن نے دھنیں تیار کی تھیں۔ اس فلم کے سارے گیت ہٹ ہوئے تھے۔ اس کے بعد ایک فلمی پارٹی میں ایس۔ ڈی برمن نے ساحر کی موجودگی میں یہ کہا کہ میری دھنوں کی وجہ سے اس فلم کے نغمے مقبول ہوئے ہیں، نہ کہ ساحر کی شاعری کی وجہ سے۔ لہٰذا ساحر نے اُسی وقت طے کر لیا کہ وہ اب کسی مشہور میوزک ڈائریکٹر کے لیے گیت نہیں لکھے گا اور دنیا کو بتا دے گا کہ میوزک ڈائریکٹر سے کہیں زیادہ بڑا شاعر ہوتا ہے۔ فلم ''بازی'' کے بعد ساحر نے کسی مخصوص یا سکہ بند میوزک ڈائریکٹر کے لیے گیت نہیں لکھے، بلکہ نئے نئے موسیقاروں کے لیے نغمے تحریر کیے اور نتیجہ یہ نکلا کہ ساحر کے گیت لگاتار مقبول ہوتے رہے۔

اپنے زمانے کے مقبول فلمساز وہدایتکار گرودت بھی ساحر کی شاعری سے بے حد متاثر تھے اور وہ اپنی فلموں کے نغمے ساحر سے ہی لکھواتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنی مشہور زمانہ فلم ''پیاسا'' میں ساحر کی زندگی کی جھلک بھی پیش کی اور نہ صرف یہ کہ اس فلم کے نغمے بہت مقبول ہوئے بلکہ یہ فلم گرودت کی زندگی کی کامیاب ترین فلم ثابت ہوئی۔ کافی عرصے بعد یش چوپڑا نے بھی اپنی فلم ''کبھی کبھی'' میں ساحر کی زندگی کی عکاسی کی اور اس فلم کے نغمے بھی ساحر نے ہی تحریر کیے تھے۔ فلم ''کبھی کبھی'' یش چوپڑا کی بے حد کامیاب فلموں میں سے ایک ہے۔

ساحر لدھیانوی کو ۱۹۶۳ء میں سب سے پہلے فلم ''تاج محل'' کے نغموں کے لیے

فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا اور دوسری بار ۱۹۷۶ء میں فلم ''کبھی کبھی'' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ ملا۔ حکومت ہند کی طرف سے انہیں ۱۹۷۱ء میں پدم شری سے نوازا گیا اور ان کے تیسرے شعری مجموعہ ''آؤ کہ کوئی خواب بُنیں'' کے لیے ۱۹۷۲ء میں سوویت لینڈ نہرو ایوارڈ سے نوازا گیا۔ اس کے بعد مہاراشٹر اردو اکیڈمی اور مہاراشٹر اسٹیٹ ایوارڈ سے بھی ان کو نوازا گیا۔

ساحرؔ ایک نظم نگار کی حیثیت سے زیادہ شہرت رکھتے ہیں اور انہوں نے زیادہ تر نظمیں ہی لکھی ہیں، لیکن صنف غزل میں بھی ان کی اپنی انفرادیت نمایاں ہے اور وہ اس معروضے کی نفی کرتے ہیں کہ ایک نظم نگار شاعر اچھا غزل گو نہیں ہو سکتا۔ ساحرؔ کو غزل گوئی سے فطری مناسبت بھی ہے، کیونکہ ان کی نظمیں بھی تغزل سے خالی نہیں ہوتیں۔

ساحرؔ نے فلموں کے لئے جو گیت لکھے ہیں ان میں سے اکثر گیت عام فلمی گیتوں کی ڈگر سے ہٹے ہوئے ہیں۔ کہیں بھی یہ محسوس نہیں ہوتا کہ یہ فرمائشی گیت ہیں اور کسی داخلی تحریک کے بغیر موسیقار کی دی ہوئی دُھنوں پر لکھے گئے ہیں۔ ان میں شعریت کے ساتھ ساتھ جذبے واحساس کی شدت بھی پائی جاتی ہے۔

اپنی طرز کا یہ واحد اور مقبول ترین شاعر ۲۵ راکتوبر ۱۹۸۰ء کو سانجھ ڈھلے ۵۸ ربرس کی قیدِ حیات سے نجات پا کر اور اپنے الفاظ کا جادو پوری آب وتاب کے ساتھ لوگوں کے دل ودماغ پر چلتا ہوا چھوڑ کر چُپ چاپ گہری اور ابدی نیند سو گیا...... کبھی نہ جاگنے کے لئے۔ مگر اس کی شاعری لوگوں کو ہمیشہ جگاتی رہے گی۔ خود ساحرؔ کے الفاظ میں......

جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے
جسم مر جانے سے انسان نہیں مر جاتے
دھڑکنیں رکنے سے ارمان نہیں مر جاتے
ہونٹ جم جانے سے فرمان نہیں مر جاتے
جسم کی موت کوئی موت نہیں ہوتی ہے

OO

کشور کمار

کشور کمار کے والد جناب کنج بہاری گانگولی کھنڈوا (مدھیہ پردیش) کے مقبول بیرسٹر تھے۔ ۴؍اگست ۱۹۲۹ء کو کشور کمار کا جنم کھنڈوا میں ہوا تھا۔ سب سے پہلے کشور کمار کے سب سے بڑے بھائی اشوک کمار کو ہندوستانی سنیما میں داخل ہونے کا موقع ملا۔ اشوک کمار کے بہنوئی ایس۔ مکھرجی ان دنوں ممبئی ٹاکیز کے کرتا دھرتاؤں میں سے ایک تھے۔ لہٰذا اُن دونوں کے تعلقات کی وجہ سے ہی کشور کمار کو بھی فلموں میں آنے کا موقع ملا۔

کشور کمار کو بچپن سے ہی گانے کا شوق تھا، اور وہ سہگل کو دیوانگی کی حد تک پسند کرتے تھے۔ یہی دیوانہ پن ان کو بمبئی لے آیا تھا۔ ان دنوں ہر طرف سہگل کے ہی چرچے تھے۔ بمبئی آکر سب سے پہلے کشور کمار نے سہگل سے ملاقات کی اور ان کو اپنی آواز میں ایک گانا سنایا...... اور سہگل سے کہا کہ وہ بھی ان ہی کی طرح مشہور گلوکار بننا چاہتے ہیں۔ سہگل اس نوجوان کی لگن اور جادو بھری آواز سے متاثر ہوئے اور انہوں نے کشور کمار کو مشورہ دیا کہ ایک تو وہ گاتے وقت اپنے جسم کو بے حرکت رکھا کریں، اس طرح سامعین کا دھیان گانے پر ہی رہے گا۔ دوسری بات یہ کہ گاتے وقت چہرے پر ہمیشہ سکون بنائے رکھیں۔ سہگل کا یہ مشورہ اس وقت کشور کمار نے گرہ میں باندھ لیا تھا۔

بطور اداکار کشور کمار کی پہلی فلم ''آندولن'' تھی، لیکن بطور گلوکار کشور کمار کی پہلی فلم بمبئی ٹاکیز کے لئے بنائی گئی، شاہد لطیف کی فلم ''ضدی'' تھی۔ اس فلم میں کشور کمار کا گایا ہوا گانا...... ''مرنے کی دعائیں کیوں مانگوں......'' بہت مقبول ہوا تھا اور پھر وقت

کے ساتھ ساتھ فلمی دنیا میں کشور کمار کے قدم جمنے لگے۔ انہوں نے بطور اداکار اور گلوکار بہت کامیابی حاصل کی۔ انہوں نے اپنی فلموں کی فلمسازی بھی کی۔ ''دور گگن کی چھاؤں میں، دُور کا راہی، جھمرو، چلتی کا نام گاڑی، ہم سب ڈاکو'' اور ''بڑھتی کا نام داڑھی'' وغیرہ فلموں میں کشور کمار نے زندگی کے مختلف پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ فلم ''چلتی کا نام گاڑی'' میں اشوک کمار، انوپ کمار اور کشور کمار، ان تینوں سگے بھائیوں نے اچھی کامیڈی پیش کی ہے۔ کشور کمار نے اپنی فلموں کو کبھی بھی سنجیدگی سے ریلیز کرنے کی طرف توجہ نہیں دی، یا شاید کشور کمار کے مالی مشیروں نے خسارہ دکھانے اور ٹیکس بچانے کے مقصد سے ہی ان سے فلمیں بنوائیں۔

کشور کمار نے اپنے گانے خود گانے والے ہیرو کے طور پر جو مقام بنالیا تھا، وہ اُس دور میں شاید ہی کسی دوسرے اداکار کو نصیب ہوا ہو۔ ''نئی دلی، بندی، بھائی بھائی، شرارت، مسافر'' اور ''آشا'' جیسی فلمیں آج بھی کشور کمار کی وجہ سے یاد کی جاتی ہیں۔ فلمساز ایم۔ وی۔ رمن کی فلم ''لڑکی'' اور ''بہار'' خود کشور کمار کو بے حد پسند تھیں۔

کشور کمار نے چار شادیاں کیں۔ پہلی بیوی روما دیوی سے ایک لڑکا اجیت کمار ہے، جو خود بھی گلوکار ہے۔ روما دیوی سے طلاق کے بعد کشور کمار نے سلور اسکرین کی وینس مدھوبالا سے شادی کی، لیکن مدھوبالا زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں۔ مدھوبالا کی موت کے بعد کشور کمار نے اداکارہ یوگیتا بالی سے شادی کی، لیکن دونوں میں زیادہ دنوں تک بن نہیں پائی اور جلد ہی دونوں کا طلاق ہو گیا۔ کشور کمار کی چوتھی بیوی اداکارہ لینا چندراورکر سے بھی ایک لڑکا ہے۔ اس کے علاوہ کشور کمار اور اداکارہ سلکھشنا پنڈت میں کافی عرصہ تک رومانس چلا۔ دونوں کے شادی جیسے مقدس رشتے میں بندھنے کی خبر آنے ہی والی تھی مگر دونوں کے مزاج میں زمین آسمان کا فرق ہونے کی وجہ سے دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔

اس بات کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے کہ کشور کمار کو اداکاری میں زیادہ مہارت حاصل تھی یا موسیقی میں؟ لیکن یہ قبول کرنا پڑے گا کہ کشور کمار میں بے شمار صلاحیتیں

تھیں۔ اداکار، موسیقار، ہدایتکار، اسکرپٹ رائیٹر، ڈانس ڈائرکٹر، فوٹوگرافر، نغمہ نگار، فلمساز کے علاوہ انہوں نے گلوکار کے طور پر سب سے زیادہ کامیابی اور مقبولیت حاصل کی۔ فلمسازی کا کوئی بھی شعبہ ایسا نہ تھا جس سے کشور کمار کو دلچسپی نہ ہو یا جس سے ان کا تعلق نہ رہا ہو۔

کشور کمار کے ہم عصر گلوکاروں میں محمد رفیع اور مکیش سب سے زیادہ مقبول تھے۔ زندگی نے ان دونوں کلاکاروں کے ساتھ بھی وفا نہ کی اور موت کے بے رحم ہاتھوں نے ان دونوں عظیم گلوکاروں کو سامعین سے چھین لیا۔ یہ عجیب اتفاق ہے کہ محمد رفیع اور مکیش کی طرح کشور کمار کی موت بھی دل کا دورہ پڑنے سے ہوئی۔ کشور کمار کی زندہ دلی، سچ بولنے کی عادت اور ہنسی مذاق میں ڈوبی شخصیت کی داستانوں کے ساتھ ہی کئی دلچسپ واقعات بھی مشہور ہیں۔ جب کبھی کشور کمار کو ان کی مرضی کے خلاف کام کرنے کے لئے مجبور کیا گیا، لیکن دماغ سے زیادہ دل کی بات ماننے والے کشور کمار نے کسی بھی دباؤ میں آنے سے انکار کر دیا۔ ملک میں نافذ ایمرجنسی کے وقت کی بات ہے...... اس وقت کے وزیرِ اطلاعات جناب وی۔ سی۔ شکلا نے ناراض ہو کر ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر کشور کمار کے گانوں پر پابندی لگا دی تھی۔ مگر اس پابندی کے باوجود کشور کمار کی شہرت پر کوئی فرق نہیں پڑا۔

یہ بات بھی یہاں بتانی ضروری ہے کہ کشور کمار نے کامیڈی گانوں کے ساتھ ساتھ دل کو چھو لینے والے جو غمگین نغمے فلمی دنیا کو دئے ہیں، انہیں آسانی سے بھلایا نہ جا سکے گا......

......میرے نینا ساون بھادو، پھر بھی میرا من پیاسا۔

......بیقرار دل...... تو گائے جا۔

......جیون کے سفر میں راہی، ملتے ہیں بچھڑ جانے کو۔

......میرے محبوب قیامت ہوگی، آج رسوا تیری گلیوں میں محبت ہوگی۔

وغیرہ ایسے ہی گانے ہیں جو آج بھی دل کے تاروں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔

حالانکہ بہت کم موسیقار ایسے ہوں گے جن کی بنائی دھنوں پر کشور کمار نے اپنی شیریں آواز کا جادو نہ بکھیرا ہو۔ معروف موسیقار نوشاد علی نے ایک یا دو گانے ہی کشور کمار سے گوائے ہیں۔ اسی طرح موسیقار او۔ پی۔ نیر نے بھی شاید ہی کبھی کشور کمار کی شیریں آواز کا فائدہ اُٹھایا ہو۔ کشور کمار نے تقریباً تمام مقبول و مشہور پلے بیک گلوکاروں کے ساتھ بھی دوگانے گائے ہیں۔ شمشاد بیگم، لتا منگیشکر، آشا بھونسلے، سمن کلیان پور اور سلکشنا پنڈت وغیرہ کے ساتھ کشور کمار کے دوگانے مقبول ہو چکے ہیں۔ کشور کمار نے تقریباً چار دہائیوں تک فلمی دنیا میں اپنا ایک خاص مقام بنائے رکھا۔ کشور کمار کے چلے جانے کے بعد ایسا لگتا ہے جیسے فلمی موسیقی کی ایک صدی کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد رفیع اور مکیش کی موت کے بعد فلمی دنیا میں جو ایک خلاء پیدا ہو گیا تھا، کشور کمار نے اپنی جادو بھری آواز سے اسے پورا کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی، لیکن کشور کمار کی موت سے جیسے سب کچھ ختم سا ہو گیا۔ موت کے سنگ دل ہاتھوں سے کوئی نہیں بچ پاتا، اور کشور کمار کو تو موت کا ذاتی تجربہ تھا۔ کشور کمار نے تو موت کو بڑے نزدیک سے دیکھا تھا۔ کشور کمار نے مدھوبالا کو اپنی آغوش میں موت کی نیند سوتے دیکھا تھا۔ تب ہی سے کشور کمار کو دو باتیں ستا رہی تھیں...... ایک تو موت کا احساس اور دوسرے تنہائی اور اکیلا پن۔ اتنی زیادہ شہرت، بھرپور خاندان اور موسیقی سے بھرے ہوئے ماحول کے باوجود کشور کمار نے خود کو ہمیشہ اکیلا ہی محسوس کیا۔ اسی اکیلے پن کی جھلک کشور کمار کے کئی گیتوں میں بھی ملتی ہے...... یہ موت کا احساس ہی تھا جسے کشور کمار نے اپنے اکیلے پن کا علاج سمجھ رکھا تھا۔ موت سے بے حد لگاؤ تھا کشور کمار کو۔ اسی لئے یہ بات یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ کشور کمار کو موت پر جتنا اعتبار تھا، اُتنا زندگی پر نہیں تھا۔

گلوکار آئیں گے اور چلے جائیں گے، لیکن موسیقی کو، خاص طور پر ہندوستانی فلمی موسیقی کو کشور کمار نے جو کچھ دیا ہے، وہ شاید ہی اب کوئی دوسرا دے پائے۔ کشور کمار کی موت سے فلمی موسیقی کے ایک سنہرے دور کا خاتمہ ہو گیا۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۸۷ء کو فلمی موسیقی کی یہ شمع ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئی۔ OO

بی۔ آر۔ چوپڑہ

غیر منقسم ہندوستان کے صوبہ پنجاب کے مردم خیز شہر لدھیانہ کو کئی اہم اور غیر معمولی شخصیات کے مولد ہونے کا شرف حاصل ہوا ہے۔ ساحر لدھیانوی کے علاوہ ہندوستانی فلمی دنیا کی معروف ترین اور مقبول شخصیت بی۔ آر۔ چوپڑہ بھی اِسی لدھیانہ شہر میں ۲۲راپریل ۱۹۱۴ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ولایتی رام چوپڑہ کاروباری قسم کے سیدھے سادے انسان تھے۔ ان کی والدہ کا نام دروپدی دیوی تھا، جو ایک نیک طبیعت گھریلو خاتون تھیں۔

پیدائش کے بعد ان کا نام بلدیو راج رکھا گیا۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ کے بچپن کا بیشتر حصہ اور جوانی کے دن لاہور میں گزرے، جہاں انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے انگریزی ادب میں ایم۔اے کا امتحان پاس کیا۔ بلدیو راج چوپڑہ نے آئی سی ایس کا امتحان دینے کا ارادہ کیا، مگر عین امتحان سے قبل ان کو ٹائیفائڈ ہو گیا اور وہ امتحان کی تیاری زیادہ اچھی طرح نہیں کر سکے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ امتحان میں شریک تو ہوئے مگر کامیابی حاصل نہ کر سکے۔ ادب کے مطالعہ کا شوق ان کو طالب علمی کے زمانہ سے ہی تھا، لہٰذا لکھنے کا بھی ذوق پیدا ہو گیا اور ۱۹۳۷ء میں، جبکہ ان کی عمر صرف ۲۳ربرس کی تھی، انہوں نے لاہور سے شائع ہونے والے انگریزی اخبار میں بطور صحافی کام کرنا شروع کر دیا۔ ۱۹۳۸ء میں انہوں نے ایک دوست کی پارٹنرشپ میں لاہور ہی سے انگریزی میں ایک فلمی اخبار ''سنے ہیرالڈ'' Cine Herald کا اجراء کیا اور ۱۹۴۷ء تک اسی سے وابستہ رہے۔ ابھی بی۔ آر۔ چوپڑہ کی عمر صرف ۲۶ربرس کی ہی تھی کہ

۱۳رنومبر ۱۹۴۰ء کو ان کی شادی پرکاش نام کی لڑکی سے کر دی گئی اور وہ ایک ذمہ دار شوہر کا کردار بھی ادا کرنے لگے۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ ۱۹۴۷ء میں انگریزی ہی کے ایک جریدے The Listener میں معاون مدیر کی حیثیت سے فرائض انجام دینے لگے۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے لاہور میں ایک ذاتی پروڈکشن کمپنی کھولنے کا منصوبہ بھی بنایا۔ مگر قسمت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

۱۴راگست ۱۹۴۷ء کو پاکستان کا قیام عمل میں آیا اور لاہور پاکستان کی جھولی میں چلا گیا۔ اگلے ہی دن ۱۵راگست ۱۹۴۷ء کو جب ہندوستان آزاد ہوا تو دونوں طرف سے ہجرتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اور بادلِ نخواستہ بلدیوراج چوپڑہ اور ان کے چھوٹے بھائی یش راج چوپڑہ کو ہمیشہ کے لئے لاہور کو خیر آباد کہہ کر ہندوستان کی طرف ہجرت کرنی پڑی۔ کل ملا کر یہ ۲۵رافراد کا کنبہ تھا جو لاہور سے ہجرت کر کے بمبئی میں آباد ہوا۔

بڑے کنبہ کی ذمہ داری اور اپنے شوق وذوق کے مطابق روزگار حاصل کرنے کی تگ و دو میں بی۔ آر۔ چوپڑہ بمبئی آنے کے بعد بھی فلمی دنیا سے ہی وابستہ ہو گئے اور انہوں نے ۱۹۴۸ء میں شری گوپال پکچرس کے ساتھ مل کر فلم ''کروٹ'' بنائی۔ اس فلم کی ہدایت پرکاش بیدی نے کی تھی اور موسیقی ہنس راج بہل نے ترتیب دی تھی۔ گیتا نظامی، ستیش، جیون، لیلا مصرا، ککو، کلدیپ، بے بی تبسم، پران، کیسری اور پارو وغیرہ نے اس فلم میں کردار ادا کئے تھے۔ مگر قسمت نے ابھی بی۔ آر۔ چوپڑہ کا ہاتھ تھاما نہیں تھا، لہٰذا یہ فلم ناکام ہو گئی۔ اپنی پہلی ہی فلم ''کروٹ'' کی ناکامی کے بعد بھی چوپڑہ صاحب نے ہمت نہیں ہاری اور خود ہی ایک فلم کی اسکرپٹ تیار کی۔ رائٹر تو وہ پہلے سے ہی تھے، صحافتی کام کا بہترین تجربہ بھی ان کے پاس تھا، لہٰذا فلم ''افسانہ'' انہوں نے شری گوپال پکچرس کے بینر تلے ہی بنانی شروع کی۔ اس فلم کے فائنانسر گووردھن اگروال تھے، جو بی۔ آر۔ چوپڑہ صاحب کی صلاحیتوں سے متاثر بھی تھے اور ان پر بھروسہ بھی کرتے تھے۔ لہٰذا گووردھن اگروال نے فلم میں سرمایہ کاری کرنے کے لئے ایک شرط یہ رکھی کہ اس فلم کی ہدایتکاری خود بی۔ آر۔ چوپڑہ ہی کریں۔ بہرحال اپنے فائنانسر کی

خواہش کا احترام کرتے ہوئے اور وقت کی ضرورت اور نزاکت کو سمجھتے ہوئے اس فلم ''افسانہ'' کی ہدایتکاری خود بی۔ آر۔ چوپڑہ نے کی۔ کیونکہ اُس زمانہ میں فلم کے لیے فائنانسر ملنا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ تقسیم ملک کے بعد ابھی ملک کے حالات زیادہ بہتر نہیں ہوئے تھے۔ اس فلم میں اپنے وقت کے مقبول ترین ہیرو اشوک کمار نے دوہرا کردار ادا کیا تھا۔ ہیرو کے طور پر اشوک کمار اس وقت فلمی دنیا کے آسمان پر چھائے ہوئے تھے۔ فلم ''افسانہ'' ۱۹۵۱ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی اور اپنے دور کی سُپر ہٹ فلم ثابت ہوئی۔ اس فلم میں حسن لال بھگت رام نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس طرح بلدیوراج چوپڑہ کی ہدایت میں بنی اولین فلم ''افسانہ'' کے کامیاب ہوتے ہی بی۔ آر۔ چوپڑہ کا شمار ہندی فلموں کے کامیاب ہدایتکاروں میں ہونے لگا اور ہر طرف ان کی کامیاب ہدایتکاری کے چرچے ہونے لگے۔

فلم ''افسانہ'' کی کامیابی سے سرشار بی۔ آر۔ چوپڑہ نے اشوک کمار کو ہیرو لے کر ہیرا فلمز کے بینر تلے فلم ''شعلے'' کی ہدایتکاری کی۔ اس فلم کی موسیقی دھنی رام اور آرچاریہ مہیش بھٹ نے ترتیب دی تھی۔ اشوک کمار کے علاوہ دیگر اداکاروں میں بینا رائے، جیون، پورنیا، مرزا مشرف، بے بی ناز اور اومادت وغیرہ نے اہم کردار ادا کئے تھے۔ ۱۹۵۳ء میں ریلیز یہ فلم ''شعلے'' بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''افسانہ'' جیسی کامیابی حاصل نہیں کر پائی مگر تجارتی لحاظ سے نقصان کا سودا بھی نہیں رہا۔ اس کے بعد ۱۹۵۴ء میں بی۔ آر۔ چوپڑہ کی ہدایت اور موسیقار روشن کی موسیقی سے سجی فلم ''چاندنی چوک'' نمائش کے لئے پیش ہوئی۔ اس فلم میں ملکۂ جذبات مینا کماری کے ساتھ شیکھر، کمار، جیون، آغا، سمرتی بسواس، سندر اور یشودرا کاجو نے اہم کردار ادا کئے تھے۔ فلم ''افسانہ'' کی طرح اس فلم ''چاندنی چوک'' نے بھی کافی کامیابی حاصل کی۔ اس فلم کی کامیابی کا ایک فائدہ یہ ہوا کہ بی۔ آر۔ چوپڑہ ایک کامیاب اور مشہور ہدایتکار کے طور پر فلم انڈسٹری میں اپنی شناخت قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اس کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ نے کبھی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ۱۹۵۵ء میں انہوں نے اپنی ذاتی فلم کمپنی بی۔ آر۔ فلمز کی بنیاد

رکھی اور اشوک کمار کے ساتھ مینا کماری کو ہیروئن لے کر فلم ''ایک ہی راستہ'' شروع کی۔ سنیل دت، جیون، اور ڈیزی ایرانی وغیرہ دیگر ستارے اس میں شامل تھے اور ڈیزی ایرانی کو بطور چائلڈ آرٹسٹ پہلی بار اسی فلم سے متعارف کرایا گیا تھا۔ اس فلم کی موسیقی ہیمنت کمار نے ترتیب دی تھی۔ یہ فلم ۱۹۵۶ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی۔

فلم ''ایک ہی راستہ'' کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ نے اس وقت کے سپر اسٹار دلیپ کمار کو ہیرو لے کر فلم ''نیادور'' شروع کی۔ اس فلم میں انہوں نے موسیقی ترتیب دینے کے لئے او۔ پی۔ نیّر کا انتخاب کیا۔ شروع میں اس فلم میں دلیپ کمار کی ہیروئن مدھوبالا تھیں، مگر ان کے والد عطااللہ خاں کے غلط رویے اور بعد میں مقدمہ بازی وغیرہ تک بات پہنچنے کے بعد وجینتی مالا کو اس فلم کی ہیروئن بنایا گیا، اور یہیں سے دلیپ کمار اور مدھوبالا کے رومانی تعلقات بھی ختم ہو گئے۔ اجیت، جیون، جانی واکر اور چاند عثمانی، لیلا چٹنس اس فلم کے دیگر اداکار تھے۔ بمبئی کے لبرٹی سنیما میں اس فلم کی نمائش ۱۹۵۷ء میں ہوئی اور یہ فلم سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئی۔ لبرٹی سنیما کو مشہور ومقبول فلمساز وہدایتکار محبوب خان کی فلم ''مدرانڈیا'' کی نمائش کے لئے تیار کیا گیا تھا مگر اس فلم کے پرنٹ لندن سے تیار ہوکر آنے میں تاخیر ہو رہی تھی۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ نے نہایت سعادت مندی سے محبوب خان کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ تھیئٹر کیونکہ خالی ہے، لہٰذا ''مدرانڈیا'' سے پہلے ان کی فلم ''نیادور'' کو اسی تھیئٹر میں نمائش کرنے کی اجازت دے دیں۔ محبوب خان نے ایک شرط پر اجازت دے دی، کہ جب بھی ''مدرانڈیا'' کے پرنٹ لندن سے آجائیں گے تو فوری طور پر بی۔ آر۔ چوپڑہ کو تھیئٹر خالی کرنا ہوگا تاکہ ''مدرانڈیا'' کی نمائش ہو سکے۔ ان کا اندازہ تھا کہ تقریباً تین ہفتے میں لندن سے پرنٹ تیار ہوکر آجائیں گے۔ چوپڑہ صاحب نے محبوب خان کی شرط مان لی اور ''نیادور'' کی نمائش کر دی۔ محبوب خان فلم ''نیادور'' سے زیادہ مطمئن نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ اس فلم میں تانگہ، ریل اور موٹر لاری کی دوڑ اور مشینوں کی حمایت کی باتیں دیکھنے کون آئے گا۔ مگر ''نیادور'' کی نمائش کے پہلے دن سے ہی ملی کامیابی نے سب کو اپنی طرف متوجہ

کرنا شروع کر دیا اور محبوب خان نے فلم کی تعریف سن کر خود تھیٹر پر جا کر فلم دیکھی۔ فلم کے اختتام پر انہوں نے بی۔ آر۔ چوپڑہ کی کمر تھپتھپا کر داد بھی دی۔ اس کے ساتھ ہی محبوب خان نے اپنی فلم ''مدر انڈیا'' کی نمائش کو اس وقت تک کے لئے ملتوی کر دیا جب تک کہ فلم ''نیادور'' نے لبرٹی سنیما میں جوبلی نہ منا لی۔

فلم ''نیادور'' کی بے پناہ کامیابی کے بعد بی۔آر۔ فلمز کی فلم ''دھول کا پھول'' شروع ہوئی۔ اس فلم کی ہدایتکاری کی ذمہ داری بی۔ آر۔ چوپڑہ نے اپنے بھائی لیش راج چوپڑہ کے سپرد کی۔ لیش چوپڑہ شروع سے ہی اپنے بڑے بھائی کے ساتھ معاون کے بطور کام کر رہے تھے۔ لہٰذا لیش چوپڑہ نے اپنے بھائی کی طرز پر ہی فلم ''دھول کا پھول'' تیار کی اور کامیابی حاصل کی۔ ۱۹۵۹ء میں ریلیز ہوئی اس فلم میں اشوک کمار کے ساتھ راجندر کمار، مالا سنہا، نندہ، من موہن کرشن اور موہن چوٹی تھے۔ این۔ دتہ کی موسیقی سے بجی اس فلم کے کیمرہ مین دھرم چوپڑہ تھے اور اسی فلم سے چائلڈ اسٹار کے طور پرہنی ایرانی کو متعارف کرایا گیا تھا۔ یہ فلم سلور جوبلی ہٹ ثابت ہوئی۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ ہماری فلمی دنیا کے ایک ایسے باصلاحیت فلمساز وہدایتکار تھے جن کی کئی باتیں انہیں دوسروں سے مختلف اور اہم بناتی ہیں۔ انہیں فلموں میں نئے نئے تجربات کرنے کا شوق تھا اور دوسری بات یہ کہ ایک اردو ادیب اور صحافی ہونے کے تعلق سے ان کی فلموں میں کوئی سبق، کوئی پیغام ضرور ہوتا تھا۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ نے تجربے کے طور پر ۱۹۶۰ء میں ہندوستان کی پہلی بغیر گانوں والی ہندی فلم ''قانون'' بنائی۔ حالانکہ وہ اس حقیقت سے واقف تھے کہ ہماری فلموں کی کامیابی میں موسیقی ریز فلموں کی کتنی اہمیت ہوتی ہے۔ مگر انہوں نے اس فلم کو کہانی اور بہترین منظرنامے کے ذریعہ اتنا دلچسپ بنا دیا کہ فلم بینوں کو پوری فلم میں نغموں کی کمی کا احساس ہی نہیں ہوا اور فلم بھی بے پناہ کامیاب ہوئی۔ ان کی فلم میں عدالت کے مناظر کی فلمبندی اس قدر خوبصورت اور ڈرامائی انداز میں ہوئی تھی کہ فلم بین اس فلم کی پیچیدگی میں کھوکر بھی دَم سادھے بیٹھے رہتے تھے، تاکہ سسپنس پر سے پردہ ہٹتے وقت کوئی ایک منظر بھی چوک نہ

جائے۔ عدالت میں وکیلوں کی جرح اور جرم کی نوعیت، گواہوں کے بیان، جج کی دلچسپی اور قتل جیسے جرم کی پیچیدہ گتھی کو سلجھانے کا طریقہ، کل ملا کر بڑا دلچسپ ڈرامہ کر کے پیش کرتے تھے اور فلم بینوں کی بڑی تعداد یہی سب کچھ دیکھنے بار بار سنیما گھر کا رُخ کرتی تھی۔ فلم ''قانون'' میں اشوک کمار، راجندر کمار، نندہ، محمود، جیون اور نانا پلسیکر نے اداکاری پیش کی تھی اور سلیل چودھری نے موسیقی ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے لئے بی۔ آر چوپڑہ کو بہترین ہدایتکار کا نیشنل ایوارڈ دیا گیا تھا، اور فلم نے سلور جوبلی منائی تھی۔ اس سے قبل بی۔ آر۔ چوپڑہ فلم ''سادھنا'' پیش کر چکے تھے، جس کو ہندوستانی عوام نے کافی پسند کیا تھا۔ فلم ''قانون'' کی کامیابی کے بعد ۱۹۶۳ء میں فلم ''گمراہ'' اور ۱۹۶۷ء میں ''ہمراز'' فلمیں بی۔ آر۔ چوپرہ نے پیش کیں اور دونوں ہی فلموں نے کامیابی حاصل کی۔ فلم ''نیا دور'' سے ہی ساحر لدھیانوی بطور نغمہ نگار بی۔ آر۔ فلمز سے وابستہ ہو گئے تھے۔ لہٰذا ''نیا دور، دھول کا پھول، گمراہ'' اور ''ہمراز'' فلموں کے نغموں نے بھی ان فلموں کی کامیابی میں اہم کردار ادا کیا، اور پھر ۱۹۶۲ء میں یش چوپڑہ کی ہدایت میں فلم ''دھرم پتر'' اور ۱۹۶۵ء میں فلم ''وقت'' نے تو بی۔ آر۔ فلمز کا نام سنہری حروف میں آسمانِ فلم پر تحریر کر دیا۔ ان فلموں میں نے ساحر لدھیانوی کے نغموں نے فلم بینوں کو بے حد متاثر کیا تھا۔ فلم ''وقت'' میں ایک بار پھر بی۔ آر۔ چوپڑہ کے عدالتی مناظر کے فارمولے کو بڑے پیمانے پر آزمایا گیا تھا اور فلم کی کامیابی میں ان عدالتی مناظر کو بھی بڑی اہمیت حاصل تھی۔ فلم ''وقت'' نے سلور جوبلی منائی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۶۹ء میں یش چوپڑہ ہی کی ہدایت میں بنی بی۔ آر۔ فلمز کی فلم ''آدمی اور انسان'' پیش کی گئی۔ اس فلم میں دھرمندر، سائرہ بانو اور فیروز خان، ممتاز، اجیت اور جانی واکر فلم کے مرکزی کرداروں میں تھے۔ روی کی موسیقی اور ساحر کے نغمے اس فلم کی جان تھے۔ سیاسی پس منظر میں بنی بی۔ آر۔ فلمز کی یہ پہلی فلم تھی۔ اس درمیان فلم ''قانون'' کی کامیابی سے متاثر ہو کر یش چوپڑہ صاحب کی ہدایت میں انہوں نے ایک نیا تجربہ کیا اور فلم ''اتفاق'' بنائی۔ اس فلم میں بھی کوئی نغمہ نہیں تھا اور پوری فلم میں ایک سسپنس کی فضا برقرار رہتی

ہے۔اس فلم میں اس وقت کے سُپر اسٹار راجیش کھنہ کے ساتھ نندا ہیروئن تھیں اور ساتھ میں سجیت کمار تھے۔ فلم کی موسیقی سلیل چودھری نے ترتیب دی تھی اور اس فلم نے بھی سلور جوبلی منائی تھی۔ یش چوپڑہ کی ہدایت میں بنی بی۔آر۔ فلمز کی یہ آخری فلم تھی، کیونکہ اس کے بعد یش چوپڑہ نے خود کو بی۔آر۔ فلمز سے الگ کر لیا اور اپنی ذاتی فلم کمپنی ''یش راج فلمز'' کی بنیاد ڈالی۔ اس طرح بلدیوراج چوپڑہ کا جوائنٹ فیملی کا خواب چکنا چور ہو گیا۔ اس واقعہ سے متاثر ہو کر حساس دل و دماغ کے چوپڑہ صاحب نے مسلسل چھ ماہ تک خواب آور گولیاں کھا کر خود کو اس غم واندوہ سے بے گانہ ہو کر سنبھلنے کی ناکام کوشش کی۔

اپنے حالات سے باہر نکلنے کے لئے بی۔آر۔ چوپڑہ نے اپنی پُرانی اور کامیاب فلم ''افسانہ'' کو نئے اداکاروں کے ساتھ دوبارہ بنانے کا فیصلہ کیا اور دلیپ کمار، شرمیلا ٹیگور، پریم چوپڑہ، آئی۔ایس۔ جوہر، بندو اور نانا پلسیکر کو لے کر ''داستان'' کے نام سے بنایا۔ ساحر لدھیانوی کے نغموں اور لکشمی کانت پیارے لال کی موسیقی سے سجی یہ فلم ''افسانہ'' جیسی کامیاب نہ ہو سکی۔ اس فلم کی بنیادی کہانی آئی۔ایس جوہر کی لکھی ہوئی تھی۔ آئی۔آیس۔ جوہر حالانکہ مزاحیہ اداکار تھے مگر بے حد پڑھے لکھے انسان تھے۔ انہوں نے تین تین مضامین میں ایم۔اے کیا ہوا تھا۔ فلم ''داستان'' (۱۹۷۲ء) کی ناکامی کی پرواہ نہ کرتے ہوئے بی۔آر۔ چوپڑہ نے ۱۹۷۳ء میں فلم ''دھند'' کی نمائش کی۔ یہ ایک چھوٹے بجٹ کی تجرباتی سسپنس فلم تھی۔ روی کی موسیقی میں ساحر کے نغمے تھے اور سنجے خان کے ساتھ زینت امان، ڈینی، نوین نشچل، دیوین ورما، مدن پوری اور مہمان اداکار کے طور پر اشوک کمار اس فلم میں جلوہ گر تھے۔ مگر یہ بی۔آر۔ چوپڑہ کا کمزور دور تھا، لہٰذا فلم ''دھند'' کے بعد بھی ''کرم'' (۱۹۷۷) اور ''ضمیر'' (۱۹۷۶ء، اس فلم کی ہدایت روی چوپڑہ کی تھی)، چھوٹی سی بات، دی برننگ ٹرین، اگنی پریکشا، مزدور، آج کی آواز، دہلیز، کرایہ دار، عوام، پرتگیا بدھ'' اور ''کل کی آواز'' جیسی فلاپ فلمیں پردہ سیمیں پر پیش کی گئیں۔

کئی برس کی ناکامی کے بعد ۱۹۷۸ء میں نمائش کے لئے پیش کی گئی بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''پتی، پتنی اور وہ'' نے سلور جوبلی منائی اور بی۔ آر۔ فلمز کو اس فلم کی کامیابی سے کافی سہارا ملا۔ اس فلم میں سنجیو کمار، ودیا سنہا، رنجیتا اور اسرانی مرکزی کرداروں میں تھے اور موسیقی رویندر جین نے ترتیب دی تھی۔ اس فلم کے فوراً بعد ۱۹۸۰ء میں بی۔ آر۔ چوپڑہ نے ایک نئے موضوع پر فلم ''انصاف کا ترازو'' پیش کی اور اس فلم میں بھی انہوں نے عدالتی منظرنامے والے فارمولے کو آزمایا۔ زینت امان، راج ببر، پدمنی کولہاپوری، سمی گریوال، دیپک پراشر اور ڈاکٹر شری رام لاگو اس فلم میں موجود تھے۔ ساحر کے نغموں کو رویندر جین نے اپنی موسیقی سے سجایا تھا۔ اس فلم نے بھی سلور جوبلی منائی اور دیپک پراشر اور راج ببر کو اس فلم سے پہلی بار متعارف کرایا گیا تھا۔

اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں ''نکاح'' اور ۱۹۸۵ء میں ''طوائف'' نام کی فلمیں بی۔ آر چوپڑہ نے پیش کیں، جو کافی کامیاب رہیں۔ ان کے علاوہ بی۔ آر۔ چوپڑہ نے چند دستاویزی فلمیں جیسے ''تیری میری کہانی، بیٹا، دھرتی، آکاش'' اور ''غزل'' کے علاوہ ٹیلی سیریل ''بہادر شاہ ظفر، مہابھارت'' اور ''سودا'' کے نام سے بنائے۔ سیریل ''مہابھارت'' تو ان کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس سیریل نے ٹی۔ وی کی تاریخ میں میل کے پتھر کی حیثیت حاصل کی اور بین الاقوامی سطح پر شہرت اور کامیابی حاصل کی۔

ہندوستانی فلموں کی اس مثالی شخصیت نے نصف صدی پر محیط اپنی فلمی زندگی میں کل ملا کر تقریباً ۳۲ فیچر فلمیں، چار دستاویزی فلمیں اور تین ٹی۔ وی سیریل بنائے۔ ہندوستانی فلموں کو زبردست پختگی اور بلوغت سے روشناس کرانے والے اس عظیم فنکار بلدیوراج چوپڑہ کو ۱۹۶۲ء میں فلم ''دھرم پتر'' کے لئے بہترین فلم، ۱۹۶۳ء میں فلم ''گمراہ'' کے لئے بہترین فلم، ۱۹۶۸ء میں فلم ''ہمراز'' کے لئے بہترین ہدایتکار، اور ۱۹۶۲ء میں فلم ''قانون'' کے لئے بہترین ہدایتکار کے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔

۱۹۹۹ء میں حکومت ہند نے بلدیوراج چوپڑہ کو ان کی زندگی بھر کی فلمی خدمات کے اعتراف میں ''دادا صاحب پھالکے'' ایوارڈ سے نوازا۔ ان کے لئے یہ بھی ایک

اعزاز کی بات تھی کہ فلم ''مغل اعظم'' کومکمل طور پر رنگین فلم میں تبدیل کرنے کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ ہی کی فلم ''نیادور'' کو ان کی زندگی میں ہی رنگین کر کے پیش کیا گیا۔ ۱۹۹۲ء میں ریلیز ان کی فلم ''کل کی آواز'' کے بعد بی۔ آر۔ چوپڑہ نے مکمل طور پر فلمسازی اور ہدایتکاری سے دستبرداری اختیار کر لی تھی اور سارا کام اپنے بیٹے روی چوپڑہ کو سونپ دیا تھا۔ تقریباً ۱۹۶۲ء میں ہی انہوں نے فلم ''باغبان'' کی کہانی لکھنی شروع کی تھی اور وہ دلیپ کمار کو لے کر یہ فلم بنانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ناروے کے ایک سفر کے دوران وہاں ایک اولڈ ایج ہوم دیکھا تھا جہاں ان کو اس فلم کی کہانی کا خیال آیا تھا۔ مگر اُن دِنوں حالات سازگار نہ ہونے کی وجہ سے یہ کہانی ادھوری ہی رہ گئی تھی۔ اب ان کے بیٹے روی چوپڑہ نے اُسی کہانی پر امیتابھ بچن اور ہیما مالینی کو لے کر فلم ''باغبان'' بنائی جو بے حد مقبول ہوئی۔ بی۔ آر۔ چوپڑہ نے نہ صرف یہ کہ بہترین فلمیں ہی ہندوستانی سنیما کو دی ہیں بلکہ یش چوپڑہ جیسا کامیاب ترین فلمساز و ہدایتکار بھائی اور روی چوپڑہ جیسا ہونہار فلمساز وہدایتکار بیٹا تیار کر کے فلم انڈسٹری پر ایک احسان ہی کیا ہے۔

زندگی کے پچیانوے سرد و گرم دیکھنے والے فلمساز و ہدایتکار بلدیوراج چوپڑہ کافی دنوں سے بستر علالت پر تھے اور جب ۵رنومبر ۲۰۰۸ء بروز بدھ کی صبح کو داعی اجل نے بلایا تو لبیک کہہ کر اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ پسماندگان میں بھائی یش چوپڑہ کے علاوہ ان کی دو بیٹیاں ششی مگن اور بینا کپور اور ایک بیٹا روی چوپڑہ ہیں۔ ہندوستانی سنیما کی تاریخ بی۔ آر۔ چوپڑہ کو کبھی فراموش نہ کر سکے گی۔

○○

وی۔ شانتارام
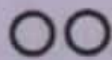
۱۸ر نومبر ۱۹۰۱ء کو کولہاپور کے ایک عام سے خاندان میں شانتارام راجہ رام وڈ کندرے کا جنم ہوا تھا۔ ان کی زندگی کے شروعاتی چند برس کچھ خاص نہیں تھے۔ عام بچوں کی طرح وہ بھی اسکول جانے لگے، جہاں زبان کے علاوہ مصوری میں ان کی خاص دلچسپی تھی۔ تعلیم حاصل کرنے کے مقابلے وہ اس کوشش میں رہتے تھے کہ کسی طرح اسکول کے جلسوں میں کئے جانے والے کسی ناٹک میں ان کو کردار مل جائے اور آخرکار اپنے دو خالہ زاد بھائیوں بابو راؤ اور بھال جی پنڈارکر کے ساتھ ان کو بھی ایک ناٹک میں قلعے کے باہر پہرہ دینے والے سنتری کا کردار مل گیا۔ اِس کے بعد تو نقل اُتارنے کا اُن کا شوق بڑھتا ہی چلا گیا۔ پھر ایک دن شانتارام کے ذوق وشوق کو دیکھتے ہوئے اس زمانے کے مشہور گلوکار، اداکار گووند راؤ ٹیبے نے ان کے والد سے کہا کہ شانتارام کو ناٹک کمپنی میں بھرتی کروا دیا جائے اور صرف ۱۲ر برس کے شانتارام گندھرو ناٹک کمپنی میں بھرتی کرا دئے گئے۔

یہاں سے وی۔ شانتارام کی زندگی کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ ڈانس اور گانا بھی انہوں نے سیکھا، لڑکیوں کی طرح بال بھی بڑھانے پڑے۔ مگر کچھ ہی دنوں بعد اِن سب باتوں سے شانتارام کا من اچاٹ ہو گیا۔ ساڑی پہن کر ناچنا انہیں گوارا نہ ہوا اور وہ گھر لوٹ آئے۔ اپنے لمبے بال کٹوا کر پھر سے پرانے انگریزی ہائی اسکول کے درجہ چہارم میں جا کر بیٹھ گئے۔ جیسے تیسے پاس ہوتے ہوئے جب میٹرک میں پہنچے تو

سنسکرت میں فیل ہو گئے اور یہیں سے ان کی اسکولی تعلیم کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

بابوراؤ پینٹر کی فلم کمپنی کے بارے میں وہ سن چکے تھے۔ بس، ایک دن جا کر اُسی میں بھرتی ہو گئے، اور بلا معاوضہ ہر طرح کے چھوٹے موٹے کام کرنے لگے۔ اداکاری کے لئے ان کی صلاحیتوں اور لگن کو دیکھتے ہوئے بابوراؤ پینٹر نے ۱۹۲۱ء میں فلم ''سریکھا ہَرن'' (Surekha Haran) میں بھگوان شری کرشن کا کردار ادا کیا۔ اس کے بعد ۱۹۳۲ء میں بابوراؤ پینٹر کی ہی دوسری کامیاب فلم ''سنگھ گڑھ'' (Singh Garh) میں شانتارام نے ''شیلیندر راما'' کا کردار ادا کیا۔ اس کے بعد تو اداکاری کا سلسلہ ہی شروع ہو گیا اور شانتارام مختلف قسم کے کردار ادا کرتے ہوئے کامیابی کی نئی منزلیں سر کرنے لگے۔ اگلے کچھ ہی برسوں میں انہوں نے ''کرشن اوتار، ستی پدمنی، شہالاشبہہ، سادکاری، پاش، رانا ہمیر، مایا بازار، گج گوری، بھگت پرہلاد، مرلی والا، رانی صاحب'' اور ''دیش پانڈے'' وغیرہ کئی خاموش فلموں میں اداکاری کی۔

۱۹۲۶ء میں بابوراؤ پینٹر نے شانتارام کو فلم ''نیتاجی پالکر'' کی ہدایتکاری کی ذمہ داری سونپی۔ اس فلم کے فوراً بعد ہی شانتارام نے کمپنی کو الوداع کہہ دیا اور اپنے کئی ساتھیوں کے ساتھ مل کر سیٹھ سیتارام ککلرنی کی نگرانی میں یکم جون ۱۹۲۹ء کو ہندوستانی فلم انڈسٹری کی بنیاد کہی جانے والی ''پربھات فلم کمپنی'' کی بنیاد کولہاپور میں ڈالی، اور اسی سال تین ہزار روپے کی رقم سے پہلی فلم ''گوپال کرشن'' شروع کی گئی۔ فوٹوگرافر دھیبر (Dhebar)، آرٹ ڈائرکٹر فتح لعل، داملے اور ان کے ساتھ شانتارام کی ہدایت نے فلم کو کامیاب بنا دیا۔ اسی کے ساتھ پربھات فلم کمپنی کی گاڑی چل نکلی...... اگلے ہی برس ۱۹۳۰ء میں شانتارام نے ''خونی خنجر، چندرسین'' اور ''بجر بٹو'' جیسی کامیاب فلموں میں اداکاری بھی کی اور ہدایتکاری بھی۔

اُن دنوں ہندوستانی آزادی کی تحریک زور پکڑ رہی تھی۔ اس تحریک سے متاثر ہو کر سب سے پہلے پربھات فلم کمپنی نے ہی فلم ''سوراج تورن'' بنائی جس کی ہدایت شانتارام نے کی۔ شیواجی مہاراج کی زندگی پر مبنی اس فلم میں شیواجی کا کردار خود

شانتارام نے ادا کیا۔ انگریزی سرکار ''سوراج'' کا لفظ سننے کو تیار نہ تھی۔ لہٰذا فلم پر پابندی لگادی گئی۔ مجبور ہوکر فلمسازوں نے فلم میں تراش خراش کر کے فلم کا نام بھی بدل دیا اور اس فلم کو ''اودے کال'' کے نام سے نمائش کے لئے پیش کیا گیا۔ شانتارام کی ہدایت میں بنی اور ان کی اداکاری سے سجی یہ آخری خاموش فلم تھی۔ ۱۴ مارچ ۱۹۳۱ء کو فلم ''عالم آرا'' کی نمائش کے ساتھ ہی ہندوستان میں متکلم فلموں کا دور شروع ہو گیا۔

شانتارام اور ان کی پربھات فلم کمپنی نے بھی اپنی اس نئی ذمہ داری کو سمجھا اور انہوں نے ہندوستان کی پہلی فیچر فلم ''راجہ ہریش چندر'' کو بنیاد بنا کر اپنی پہلی متکلم فلم ''ایودھیا کا راجہ'' بنائی۔ ہیروئین کے بطور درگا کھوٹے کی یہ پہلی فلم تھی۔ شانتارام کی ہدایت میں یہ فلم ہندی اور مراٹھی دونوں زبانوں میں بنائی گئی تھی۔ یہی وہ فلم تھی جس میں پہلی بار سیٹ لگائے گئے۔ ۱۹۳۲ء میں ہی پربھات کی دوسری فلم ''مایا مچھندر'' میں اور بھی زیادہ خوبصورت سیٹ بنائے گئے۔

۱۹۳۳ء میں اپنے استاد بابوراؤ پینٹر کی دو کامیاب خاموش فلموں ''سیرندھی'' اور ''سنگھ گڑھ'' کو شانتارام نے ان کی عقیدت کے طور پر متکلم فلم کی شکل میں بنایا۔ ہندوستان میں بنی یہ پہلی رنگین فلم تھی جس کے پرنٹ جرمنی سے تیار ہوکر آئے تھے۔ یہی وہ پہلی فلم تھی جس کے گراموفون ریکارڈز تیار ہوئے۔ جرمنی کی ٹیلی فنکن کمپنی نے یہ ریکارڈ تیار کئے تھے اور اگلے ہی برس پربھات فلم کمپنی کو کولہاپور سے پونا منتقل کر دیا گیا۔ ۱۹۳۴ء میں یہاں شانتارام کی ہدایت میں کمپنی کی پہلی فلم ''امرت منتھن'' تیار ہوئی، اور صحیح معنوں میں پہلی بار ہی شانتارام کی معیاری فلمسازی اور ہدایتکاری کا تعارف فلمی دنیا اور شائقین کو ہوا۔

تکنیکی اعتبار سے بھی اس فلم کو بہت سراہا گیا کیوں کہ اس فلم میں پہلی بار کلوز اپ، اور راؤنڈ شاٹ کا استعمال شانتارام نے کیا تھا۔ مکالموں کے ساتھ بیک گراؤنڈ موسیقی کے استعمال کا فن بھی اسی فلم سے شروع ہوا تھا۔ یہی وہ پہلی فلم تھی جس نے ممبئی میں سلور جوبلی منائی اور جسے ملک و بیرون ملک کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

اس کے بعد شانتارام کی ایک اور اہم فلم ''دھرماتما'' کی نمائش ہوئی۔ اس وقت گاندھی جی سیاسی اور سماجی زندگی پر چھائے ہوئے تھے۔ اس فلم میں ان کے نظریات کو کھل کر بیان کیا گیا تھا۔ پہلے اس فلم کا نام ''مہاتما'' رکھا گیا تھا، مگر بعد میں انگریزی سرکار کے اعتراض پر ''دھرماتما'' کے نام سے اس فلم کی نمائش ہوئی۔

۱۹۳۶ء میں سال کی اہم فلم کے طور پر شانتارام کی ہدایت میں بنی فلم ''امرجیوتی'' آئی۔ ہندوستانی عورت کے انقلابی کردار والی شاید یہ پہلی فلم تھی۔ اس فلم میں شانتا آپٹے نے مرکزی کردار ادا کیا تھا۔ اس فلم کو وینس فلم فیسٹیول میں بھی اعزاز سے نوازا گیا۔

''دنیا نہ مانے'' پربھات اور شانتارام کی ایک اور انقلابی فلم تھی۔ ۱۹۳۷ء میں بنی یہ فلم آج بھی فلمسازی کے میدان میں دستاویز کی حیثیت رکھتی ہے۔ اشاروں کنایوں کے سہارے فنکاری سے بنائی گئی یہ فلم اس وقت کی بے میل شادیوں کے خلاف ایک تحریک تھی۔

شانتارام کا نام اب ہندوستانی فلمی آسمان پر چمکنے لگا تھا۔ اپنی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے شانتارام نے ۱۹۳۹ء میں ''آدمی'' جیسی عظیم فلم پیش کی۔ آج بھی اس فلم کو شانتارام کا عظیم کارنامہ تسلیم کیا جاتا ہے۔ طوائفوں کی زندگی پر اس سے پہلے بھی کئی فلمیں بن چکی تھیں اور بعد میں بھی بنیں، مگر ایک طوائف کے اندرونی نسوانی جذبات، اُس کی بے بسی، لاچاری، اُس کے درد اور پیار کو فلم ''آدمی'' میں جس حقیقی انداز میں پیش کیا گیا ہے، ویسا کبھی کسی فلم میں ممکن نہ ہو سکا۔ اس کے ساتھ ہی شانتارام سماج سدھارک فلمساز کے روپ میں شہرت حاصل کرتے رہے۔

اپنی اگلی فلم ''پڑوسی'' (۱۹۴۱ء) میں انہوں نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی اور ہندو مسلم ایکتا کو موضوع بنایا۔ مگر اس فلم کی تیاری کے دوران ہی ان کے ساتھی آپس میں ایکتا قائم نہ رکھ سکے اور خود شانتارام بھی اداکارہ جئے شری کے عشق میں گرفتار ہو چکے تھے۔ یہ سب کچھ پربھات فلم کمپنی کے اصولوں کے منافی تھا۔ آخرکار شانتارام پربھات فلم کمپنی سے الگ ہو گئے اور ممبئی آکر انہوں نے پریل میں ''راج کمل کلامندر'' کی بنیاد رکھی۔

۱۹۴۲ء میں قائم یہ فلم اسٹوڈیو ہندوستانی فلم انڈسٹری کی تاریخ میں میل کا پتھر ثابت ہوا اور اپنے قائدے قانون اور اصولوں کی وجہ سے پوری فلمی دنیا میں ایک مثال بنا رہا۔

۱۹۴۳ء میں شانتارام نے راج کمل کی پہلی فلم کے طور پر ''شکنتلا'' بنائی، جو بے حد کامیاب رہی۔ ان کی دوسری فلم ''چاند'' میں خون کے عطیہ کا پرچار کیا گیا تھا اور اس سے اگلی فلم ''پربت پر اپنا ڈیرہ'' میں ایک ایسے نوجوان کی کہانی بیان کی گئی تھی جو خودی کی بلندی سے گر کر نفسانی خواہشات کی گہری کھائی میں ڈوب جاتا ہے۔ ان فلموں کے بعد شانتارام کی ایک بہت اہم فلم ۱۹۴۶ء میں ''ڈاکٹر کوٹینس کی امر کہانی'' آئی۔ فلم کی کہانی خواجہ احمد عباس کی انگریزی کتاب ''دی ون ہو ڈڈ ناٹ کم بیک'' (The One Who Did Not Come Back) پر مبنی تھی۔ یہ اس ہندوستانی ڈاکٹر کی کہانی تھی جو ایک ڈاکٹری مشن پر جاپانیوں کے ذریعہ ستائے گئے چینی لوگوں کی خدمت کرنے اُن کے ملک جاتا ہے اور وہاں اپنی جان دے دیتا ہے۔ ڈاکٹر کوٹینس کا کردار خود شانتارام نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کو انگریزی میں بھی بنایا گیا اور وینس کے فلمی میلہ میں شامل ہونے کے ساتھ ساتھ یہ فلم امریکی سنیما گھروں میں بھی دکھائی گئی۔

۱۹۴۷ء میں شانتارام نے مہاراشٹر کے پیشوا راج دربار کے مقبول شاعر رام جوشی کی زندگی پر فلم ''متوالا شاعر'' بنائی۔ اس کے بعد ۱۹۵۵ء تک شانتارام نے ایک کے بعد ایک ''دہلیز، پرچھائی، سرنگ، اپنا دیش، تین بتی چار راستے'' اور ''صبح کا تارہ'' فلمیں بنائیں۔ اسی دوران ۱۹۵۲ء میں شانتارام کی مراٹھی فلم ''امرِ بھوپالی'' کو پریس میں اعزاز سے نوازا گیا۔

اور پھر ۱۹۵۵ء میں شانتارام کی بے حد مقبول فلم ''جھنک جھنک پائل باجے'' آئی۔ یہ فلم خالص ہندوستانی موسیقی اور رقص و نغمہ کی قوس وقزح تھی۔ گوپی کرشن اور سندھیا کے رقص میں شانتارام نے اتنے رنگ بھر دئے تھے کہ اپنے وقت میں یہ فلم سنیما گھروں سے اترنے کا نام ہی نہیں لیتی تھی۔ اس فلم نے شانتارام پر عزت، شہرت اور

دولت کی برسات سی کر دی۔ بعد میں اس فلم کو 70MM کے پرنٹ پر بنا کر پیش کیا گیا۔ اس فلم نے ۱۹۵۶ء میں چار فلم فیئر ایوارڈ حاصل کیے۔ ۱۹۵۶ء ہی میں شانتارام نے فلم ''طوفان اور دیا'' بنائی جو ایک عمدہ فلم تھی۔ اس کے بعد ان کی ایک اور اہم فلم آئی ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ''۔ اس فلم میں آدی ناتھ نام کے ایک ایسے جیلر کی کہانی تھی جو گاندھی وادی اصولوں سے مجرموں کو سدھارنا چاہتا ہے اور اپنے اس تجربے میں اپنی جان تک نچھاور کر دیتا ہے۔ جیلر کا کردار خود شانتارام نے ادا کیا تھا۔ اس فلم کو ملک اور بیرون ملک کئی اعزازات حاصل ہوئے۔ ۱۹۵۷ء کا صدر جمہوریہ ہند کا اعزاز اسی فلم کو ملا تھا۔ ۱۹۵۸ء میں اس فلم نے تین بین الاقوامی اعزاز حاصل کیے۔

اس کے بعد ۱۹۵۸ء میں ''موسی''، ۱۹۵۹ء میں ''نورنگ''، ۱۹۶۰ء میں ''پھول اور کلیاں'' اور ۱۹۶۱ء میں اپنی پرانی فلم ''شکنتلا'' کو ''استری'' کے نام سے دوبارہ بنایا۔ مگر یہ فلم اعلیٰ معیار کی ہوتے ہوئے بھی ناکام ہو گئی، اور پھر یہیں سے شانتارام کا اپنا ستارہ بھی مدھم پڑنے لگا، مگر انہوں نے ہار نہ مانتے ہوئے ۱۹۶۳ء میں ''سہرا''، ۱۹۶۴ء میں ''گیت گایا پتھروں نے''، ۱۹۶۷ء میں ''بوند، جو بن گئی موتی''، ۱۹۷۱ء میں ''جل بن مچھلی، نرتیہ بن بجلی''، ۱۹۷۲ء میں ''پنجرہ'' اور ۱۹۷۷ء میں ''چانی'' فلمیں بنائیں۔ مگر شانتارام کی چھاپ اور اپنے موضوعات میں تنوع ہونے کے باوجود یہ سبھی فلمیں ناکام ثابت ہوئیں۔

اپنی ان آخری چند فلموں میں شانتارام نے حقیقت کے بجائے تخئیل اور تصوّر پر زیادہ دھیان دیا تھا۔ اس لئے ''دنیا نہ مانے، آدمی، پڑوسی'' اور ''دو آنکھیں بارہ ہاتھ'' کا فلمساز ان میں کہیں نظر نہیں آیا۔ ایسا لگا جیسے بیس برس کی شان وشوکت نے شانتارام کو تھکا دیا تھا۔ شانتارام کی ناکامیوں کی ایک وجہ تھی اداکارہ سندھیا۔ اُن کی زندگی سے جئے شری کا جانا اور سندھیا کا آنا اُن کی تخلیقی صلاحیتوں کو گمنامی کی طرف لے گیا۔ اپنی دو اور ناکامیوں کے باوجود اُنہوں نے ہار نہیں مانی۔ اُن کی زندگی بھر کی فلمی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے اُنہیں ۱۹۸۶ء کا ''دادا صاحب

پھالکے اعزاز'' پیش کیا گیا۔

۱۸رنومبر ۱۹۹۰ء کو ٹھیک اپنے نواسی ویں جنم دن کے موقع پر اُن کا انتقال ہو گیا۔ وی۔ شانتارام کی محنتوں اور اصول پرستی اور تخلیقیت کا گواہ ''راج کمل اسٹوڈیو'' آج بھی اسی شان سے ممبئی میں موجود ہے۔ جدید تکنیکی آلات سے بھرپور اس اسٹوڈیو کو ممبئی کے بہترین اسٹوڈیوز میں شمار کیا جاتا ہے۔ مگر بے شمار یادگار فلموں کے خالق وی۔ شانتارام کی 'ایکشن' اور 'کٹ' کہنے والی آواز اب یہاں سنائی نہیں دیتی۔ فلمی دنیا سے عقیدت رکھنے والوں کے لئے یہ جگہ آج بھی ایک مقدس مقام کی حیثیت رکھتی ہے۔

OO

زیب النساء

نئی نسل کے فلم بینوں میں جن لوگوں نے دلیپ کمار کی فلم ''رام اور شیام'' دیکھی ہوگی، انہوں نے شیر کے مجسمے کے پاس کھڑی ہوئی اس عورت کی خونخوار آنکھیں بھی نہیں بھلائی ہوں گی۔ ایک ویلن ٹائپ کے لڑکے (پران) کی ویمپ ٹائپ کی ماں کا کردار ادا کیا تھا اپنے زمانے کی مشہور و معروف اداکارہ زیب النساء نے......جن لوگوں کی یادداشت اچھی ہے انہوں نے ان خونخوار آنکھوں کو دیکھنے کے ساتھ ہی اپنے ذہن کے گوشوں میں بہت سی تصویریں دیکھی ہوں گی اور یہ ساری تصویریں اُسی زیب النساء کی ہوں گی، جس نے متحرک فلموں کے شروع کے دور میں ہی شہرت اور مقبولیت کا سکہ اپنے نام پر چلا دیا تھا۔

ہندوستان میں متحرک فلموں کے اس دور میں سلوچنا روبی میئرس جس قدر مقبول ہوئی تھیں، بالکل اتنی ہی مقبولیت تھی زیب النساء کی۔ زیب النساء کے فلمی سفر کا آغاز خاموش فلموں سے ہوا تھا، مگر ان کے فلموں میں داخل ہونے کے ساتھ ہی بولتی فلموں کا دور شروع ہو گیا۔ زیب النساء ۱۹۱۶ء میں پنجاب کے شہر پشاور میں پیدا ہوئیں، جو آج کل پاکستان میں ہے۔ صرف ۲۳ ربرس کی عمر میں انہوں نے ۱۹۳۹ء میں امپیریل فلم کمپنی کی ملازمت اختیار کر لی۔ حالانکہ زیب النساء نے فلموں سے اُس وقت واسطہ جوڑا تھا، جب وہ ٹین ایجر ہی تھیں، یعنی کہ نوجوانی کے ابتدائی دنوں میں ہی امپیریل فلم کمپنی کی فلم ''قلفی ملائی'' میں پہلی بار زیب النساء نے کام کیا تھا۔ بعد میں جب شاردا فلم کمپنی نے ان کو اپنے یہاں چانس دیا تو وہ بہت جلد ایک سٹار کے طور پر اپنے آپ کو

منوانے میں کامیاب ہوگئیں۔ انہوں نے نانو بھائی ڈیسائی کی متحرک اور متکلم فلموں میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ ان فلموں میں ان کے ہیرو ''انڈین ڈگلس'' کہلائے جانے والے ماسٹر وٹھل ہوا کرتے تھے اور ان ہی دنوں زیب النساء خود بھی ''انڈین میری پک فورڈ'' کے نام سے پہچانی جاتی تھیں۔

ان دنوں ''سسی پنو'' یا ''سوہنی مہیوال'' جیسی کہانیوں پر بننے والی فلموں میں زیب النساء سسی یا سوہنی ہوا کرتی تھیں اور ماسٹر وٹھل پنو یا مہیوال کا کردار ادا کیا کرتے تھے۔

جب ہندوستانی فلموں نے متکلم فلموں کی ابتداء کی اور فلموں میں مکالمہ آ گیا تو متحرک فلموں کی کئی مشہور اداکاراؤں کی چھٹی ہوگئی کیونکہ ان میں زیادہ تر ہیروئنیں ہندی یا اردو زبان کی ادائیگی صحیح تلفظ کے ساتھ نہیں کر پاتی تھیں۔ خوش قسمتی سے زیب النساء کے ساتھ یہ ٹریجڈی نہیں ہوئی کیونکہ وہ شمال مغرب سرحدی علاقے کی رہنے والی ہوتے ہوئے بھی ملی جلی ہندوستانی زبان کی ادائیگی بہت اچھی صحت الفاظی کے ساتھ کرلیا کرتی تھیں۔ اس طرح ''سروج موویٹون'' کے جھنڈے تلے بنی فلم ''گل بکاؤلی'' میں نانو بھائی ڈیسائی کے مقابل زیب النساء کو ہی بطور ہیروئن منتخب کیا گیا تھا۔

فلم ''راجہ بھرتری ہری'' کی تکمیل کے ساتھ ہی زیب النساء کے فلمی سفر میں ایک نیا اور نہایت اہم موڑ آیا۔ اس فلم میں انہوں نے ایک بے وفا رانی کا بے مثال کردار ادا کیا تھا۔ اس طرح متحرک فلموں کی مقبول اداکارہ متکلم فلموں کی ویمپ کی شروعات کر بیٹھی۔ ''فلم شاہ بہرام'' اور ''دلارا'' میں موتی گڈوانی کے ساتھ کام کرنے کے بعد زیب النساء نے انہیں کے ساتھ شادی کر لی۔ نانو بھائی ڈیسائی کے ساتھ ان کی آخری فلم ''کل کی بات'' تھی۔ اس فلم کے دوسرے کردار تھے درگا کھوٹے، روزی، سریندر، اور مبارک...... مرحوم محبوب خان کی فلم ''اعلان'' میں بھی انہوں نے ایک بُری عورت کا کردار ادا کیا تھا۔

تیس برس تک زیب النساء گھریلو قسم کی عورت کا کردار ادا کرتی رہی ہیں۔ عمر

ڈھلنے کے ساتھ ہی بھلا دیے جانے کا جو رواج ہماری فلم انڈسٹری میں چلتا آرہا ہے، اس سے دل برداشتہ ہونے کے ساتھ ہی وہ مرحوم گرودت کو بہت مانتی ہیں۔ گرودت نے اپنی اس پرانے وقتوں کی ساتھی کو اپنی فلموں میں برابر یاد رکھا اور فلم ''چودھویں کا چاند'' میں ایک بہترین کردار کے لیے ان کو خود ہی آفر کیا تھا۔

زیب النساء کی مقبول اور کامیاب فلموں میں ''گل بکاؤلی، شکنتلا، کل کی کہانی، شاہ بہرام، عید کا چاند، اعلان جنگ، مصر کا خزانہ، بہار سلیمان، طلسمی تلوار، میرا خواب، سرور کی سندری، بولتی مینا، راجہ بھرتری ہری، مالتی'' اور ''مدھو'' فلمیں قابل ذکر ہیں۔ انھوں نے ہیروئن کی حیثیت سے سریندر، اشرف خاں، ماسٹر نثار، انل کمار، عبدل اور ماسٹر وٹھل کے ساتھ بھی کام کیا ہے۔

زیب النساء نے فلموں میں کام حاصل کرنے کے لیے کبھی کسی اسٹوڈیو کے چکر نہیں کاٹے۔ یہی وجہ ہے کہ دھیرے دھیرے وہ فلمی پردے سے فیڈ آؤٹ ہوتی چلی گئیں۔ فلم ''رام اور شیام'' کے بعد فلم ''سمندر'' میں بھی انھوں نے ایک بہترین کردار ادا کیا تھا۔ ہندوستانی فلموں کی تاریخ زیب النساء کو یاد رکھنے کے لیے مجبور ہے۔

○○

نسیم بانو

عام زندگی میں جہاں بہت سے لوگوں کو ان کے نام سے کم اور عرفیت سے زیادہ پہچانا جاتا ہے، ٹھیک اُسی طرح فلمی دنیا میں بھی کئی فنکار اپنے لقب سے زیادہ مشہور ہوئے۔ ایسے ہی بہت سے لوگوں میں ایک فنکارہ ایسی بھی ہے جس کو اس کی خوبصورتی کی وجہ سے شناخت ملی۔ خوبصورت تو ساری ہی فنکارائیں ہوتی ہیں، مگر اس فنکارہ کا چہرہ ہی اتنا خوبصورت تھا کہ اس کو شروع سے ہی ''پری چہرہ'' کے خطاب سے نوازا گیا۔ آج بھی اگر کوئی ''پری چہرہ'' کہہ کر تذکرہ کرتا ہے تو ذہن میں فوراً ''پکار'' کی نور جہاں اپنا معصوم اور پریوں جیسا چہرہ لے کر نمودار ہو جاتی ہے نسیم بانو۔

اُس وقت نسیم بانو کی عمر صرف ۱۴ برس کی تھی جب وہ میٹرک کی تعلیم حاصل کر رہی تھیں اور گرمیوں کی چھٹیوں میں 'سلور کنگ'' کی فلم کی شوٹنگ دیکھنے گئی تھیں۔ اس فلم کے ستارے اُس وقت کے مشہور فنکار موتی لعل اور سویتا تھے۔ ان ہی دنوں ایک پارٹی میں نسیم بانو گئی ہوئی تھیں اور وہاں سہراب مودی بھی موجود تھے۔ سہراب مودی نے اپنی فلم ''ہیملیٹ'' میں مرکزی کردار ادا کرنے کی پیش کش نسیم بانو کے سامنے رکھی۔ پھر یہ فلم ڈھائی ماہ کی گرمیوں کی چھٹیوں میں مکمل کر لی گئی۔ اس طرح نسیم بانو کی پڑھائی کا کوئی حرج نہیں ہوا۔

جب نسیم بانو نے میٹرک کا امتحان دیا تو ان ہی دنوں ان کی پہلی فلم ''ہیملیٹ'' بھی ریلیز ہوئی۔ یہ فلم دیکھ کر لوگ نسیم بانو کی کافی تعریف کر رہے تھے،

مگر ان کے کالج کے پرنسپل نے ان کو خاص طور پر اپنے پاس بلایا اور سمجھایا......
''تمہاری وجہ سے کالج کا ماحول متوازن نہیں رہے گا، تمہاری طرح دیگر لڑکیاں بھی فلموں میں کام کرنے کے خواب دیکھیں گی۔''

اس واقعہ کے بعد سات آٹھ ماہ تک نسیم بانو نے گھر رہ کر ہی ٹیچر سے پڑھائی جاری رکھی مگر تعلیم حاصل کرنے میں اُن کی بالکل دلچسپی نہیں رہ گئی تھی۔ گھر کے لوگ ان کو ڈاکٹری کی تعلیم دلوانا چاہتے تھے۔

''ہیملیٹ'' کے بعد سہراب مودی نے کسی دوسری ہیروئن کو لے کر اگلی فلم ''آتما ترنگ'' بنائی مگر یہ فلم ناکام ہوگئی۔ تب مودی صاحب نے ایک مراسلہ بھیج کر نسیم بانو کو دہلی سے بمبئی بلوا لیا اور ''خان بہادر''، ''میٹھا زہر'' اور ''وانتی'' کے بعد ''پکار'' فلمیں بنائیں۔ ان فلموں میں کمال امروہوی کی لکھی فلم ''پکار'' بہت کامیاب ثابت ہوئی اور اس کے ساتھ ہی نسیم بانو کو بھی بہت پسند کیا گیا۔ ''پکار'' میں نسیم بانو کا نورجہاں والا کردار بہت سنجیدہ اور مشکل قسم کا تھا۔ اسی فلم سے نسیم بانو اسٹار بن گئیں اور ''پری چہرہ'' کا خطاب بھی حاصل کیا۔

اُن ہی دنوں مسٹر احسان نے نسیم بانو کو ہیروئن لے کر فلم ''اُجالا'' شروع کی۔ یہ تقریباً ۱۹۴۰ء کی بات ہے۔ اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی نسیم بانو اور مسٹر احسان کے عشق کی کہانیاں افواہوں کے روپ میں پھیلنے لگیں۔ پھر کچھ ہی دن بعد پتہ چلا کہ نسیم بانو نے مسٹر احسان سے دہلی میں شادی کر لی ہے۔ اس لومیرج کے بعد نسیم بانو نے فلموں میں کام کرنا ترک کر دیا۔ ہمایوں، شاہجہاں، قانون، قسمت، اور ''بسنت'' جیسی فلموں کے لئے ان کو پیشکش کی گئی، مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ تھوڑے دنوں کے بعد ہی جب گھر میں اُن کا من نہیں لگا تو انہیں پھر سے فلموں میں آنا پڑا۔

نسیم بانو کے شوہر مسٹر احسان نے ''بیگم، ملاقات، چاندنی رات'' اور ''عجیب لڑکی'' فلمیں بنائیں۔ ششدھر مکھرجی نے ''چل چل رے نوجوان'' بنائی تھی۔ نسیم

بانو نے ''چاندنی رات'' کے ساتھ ''شیش محل'' میں بھی کام کیا تھا۔ اس فلم میں نسیم بانو کا کردار کچھ بدلا ہوا تھا۔ ایک خاندان میں باپ کے علاوہ بڑی بہن اور بھائی کی پرورش کے لئے کسی امیر آدمی کے گھر میں ملازمت کرنے والی لڑکی کا کردار تھا اور وہاں پر یہ ملازمہ اُس امیر آدمی کی لڑکی کو اُس کے جھوٹے عاشق کے ساتھ بھگانے سے بچاتی ہے۔

فلم ''اُجالا'' کا کردار اس سے مختلف تھا۔ ایک اسٹیج کی رقاصہ کا کردار، جس کو مشرقی موسیقی بہت پسند ہے۔ یہ گلیمرس کردار تھا۔ لہٰذا فلم کی بے پناہ کامیابی کے ساتھ نسیم بانو کی فنکارانہ اداکاری نے بھی فلم بینوں کو بہت متاثر کیا۔

نسیم بانو اور مسٹر احسان کا عشق کن حالات میں پروان چڑھا، اس کے بارے میں مشہور اداکار اشوک کمار کی بیان کردہ کہانی کافی مشہور ہوئی تھی۔ اشوک کمار کیپٹن صدیقی کے کافی قریبی دوست تھے اور کیپٹن صدیقی مسٹر احسان کے قریبی دوست تھے۔ فلم ''اُجالا'' میں کیپٹن صدیقی نے بھی کافی روپیہ لگایا تھا۔ اشوک کمار لگ بھگ روز ہی کیپٹن صدیقی کے یہاں جاتے تھے اور کچھ دنوں سے وہاں ایک عجیب سی خوشبو محسوس کر رہے تھے۔

ایک دن جب اشوک کمار صدیقی صاحب کے گھر گئے تو صدیقی صاحب گھر پر موجود نہیں تھے، مگر وہ مخصوص خوشبو مکان میں بکھری ہوئی تھی۔ اشوک کمار وہ خوشبو سونگھتے ہوئے بالائی منزل پر پہنچ گئے۔ کمرے کے کواڑ تھوڑے سے کھلے ہوئے تھے۔ اشوک کمار نے جھانک کر دیکھا، نسیم بانو پلنگ پر لیٹی ہوئی تھیں اور ان کے پہلو میں مسٹر احسان بیٹھے ہوئے راز و نیاز کی باتیں بہت دھیمی آواز میں کر رہے تھے۔ اشوک کمار نے جب کیپٹن صدیقی سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ مسکراتے ہوئے بولے...... ''یہ سلسلہ کافی دنوں سے جاری ہے۔''

''پُکار'' کی نسیم بانو اور ''چل چل رے نوجوان'' کی نسیم بانو میں بڑا نمایاں فرق ہے۔ ''پُکار'' میں ملکہ نور جہاں کے کردار میں وہ زرق برق لباس پہنے پوری

سنجیدگی کے ساتھ جلوہ افروز ہوئی تھیں، اور ''چل چل رے نوجوان'' میں بھارت سیوا دل کی ایک رضا کارہ کی وردی میں نمودار ہوئیں۔ مگر دونوں جگہ ان کا ذاتی حسن برقرار رہا۔

لباس کے انتخاب میں نسیم بانو ہمیشہ بہت محتاط رہیں۔ رنگوں کے انتخاب کا ایک خاص سلیقہ اور قرینہ ان کے مزاج میں تھا۔ وہ اپنے مزاج کے اعتبار سے ایک مکمل گھریلو قسم کی عورت تھیں۔ جب ان کی فلم ''بیگم'' شروع ہوئی تو کاسٹیوم کا سارا کام انہوں نے سنبھال لیا۔ اندازہ تھا کہ دس بارہ ہزار روپے اس مد میں خرچ ہو جائیں گے۔ مگر نسیم بانو نے درزی کو گھر پر بلا کر اپنی پرانی ساڑیوں، قمیصوں اور غراروں سے تمام لباس تیار کرالیا۔

نسیم بانو کی نانی امرتسر کی کشمیرن تھیں۔ پنجابی زبان انہوں نے اپنی نانی سے ہی سیکھی تھی۔ اردو اس لئے بہت خالص اور رواں دواں بولتی تھیں کہ دہلی میں اپنی ماں کے ساتھ رہی تھیں، انگریزی اس لئے جانتی تھیں کہ کانونٹ میں تعلیم حاصل کی تھی۔ موسیقی میں اس لئے دلچسپی تھی کہ ماں شمشاد بیگم سے اس کی تعلیم حاصل کی۔ مگر ماں جیسا گلا اُن کو نہیں ملا۔ کچھ دنوں تک فلموں میں اپنے گانے خود ہی گائے، مگر زیادہ مقبول نہ ہونے کی صورت میں فلموں میں پلے بیک دینا بند کر دیا۔

نسیم بانو ہمیشہ تر وتازہ رہنے والی شخصیت تھی۔ وہ بہت ہلکا پھلکا میک اپ کرتی تھیں۔ شوخ رنگوں سے اُن کو سخت نفرت تھی۔ وہ صرف اُن ہی رنگوں کے لباس استعمال کرتی تھیں جو اُن کے مزاج کے مطابق موزوں ہوتے تھے۔ عطریات سے انہیں بے پناہ عشق تھا۔ کئی طرح کی خوشبوئیں ان کے استعمال میں رہتی تھیں اور کئی سینٹ تو کافی قیمتی اور نایاب ہوتے تھے۔ اسی طرح زیورات کا بھی بڑا شوق تھا اور ایک سے ایک اعلیٰ اور قیمتی زیور ان کے پاس ہوتے تھے، مگر وہ ہمیشہ ان میں لدی پھدی نہیں رہتی تھیں۔

نسیم بانو کے دو بچے تھے جو زیادہ تر اپنی نانی کے یہاں رہتے تھے۔ کیونکہ وہ

اپنے بچوں کو فلمی ماحول سے الگ رکھنا چاہتی تھیں۔ مگر بعد میں سائرہ بانو کو انہوں نے فلموں میں کام کرنے کی اجازت دے دی تھی۔ اپنے مرحوم باپ سے ان کو بہت پیار تھا اور وہ ہر وقت اپنے وینٹی بیگ میں ان کی تصویر رکھا کرتی تھیں۔ اپنی مقبولیت کے عروج کے زمانے میں بھی نسیم بانو کافی گھریلو قسم کی عورت تھیں اور رات کو سونے سے قبل چہرے سے میک اَپ صاف کر کے وضو کرنے کے بعد نماز ادا کرتی تھیں اور اس کے بعد قرآن پاک کی تلاوت کر کے نسیم بانو سو جاتی تھیں۔ پتہ نہیں اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے یا وقت کے نشیب وفراز نے ان کے معمولات میں کوئی فرق ڈالا ہے۔ اتنا ضرور ہے کہ اُس وقت کی پری چہرہ نسیم بانو آج بھی پری چہرہ ہیں اور اسی نام سے پہچانی جاتی ہیں۔

OO

ستیہ جیت رے

۲رمئی ۱۹۲۱ء کو کلکتہ کے ایک مہذب خاندان میں ستیہ جیت رے کا جنم ہوا۔ اُن کے دادا شری اوپندر کشور رائے چودھری بذات خود ایک ادیب، السٹریٹر، فلاسفر اور پبلشر تھے۔ شری رائے چودھری برہمو سماج کے ایک سرگرم کارکن بھی تھے، جو اُنیسویں صدی کے بنگال میں سماج سُدھار کی ایک مقبول تنظیم تھی۔ ان کے والد سوکمار رائے مصوری کے ساتھ شاعری کا بھی شوق رکھتے تھے۔ جب ستیہ جیت رے صرف ڈھائی برس کے تھے، ان کے والد سوکمار رائے کا ۱۹۲۳ء میں انتقال ہو گیا۔ اپنے والدین کے اکلوتے بیٹے ہونے کی وجہ سے ستیہ جیت رے کی پرورش ان کی بیوہ ماں نے اپنے چچا کے یہاں کی۔ حالانکہ کلکتہ میں ستیہ جیت رے کا آبائی مکان تھا لیکن دیہات میں ان کی زمینداری کی زمین قرضوں کی ادائیگی میں ختم ہو گئی۔ انہوں نے بالی گنج کے سرکاری اسکول سے دسویں تک کی تعلیم حاصل کی اور ۱۹۴۰ء میں کلکتہ کے پریسی ڈینسی کالج سے بی۔اے پاس کیا۔ اُن کی والدہ سوپر بھا رائے نے اُن کی پرورش بڑی جدوجہد سے کی تھی۔ اُن کی ہی کوشش سے ستیہ جیت رائے نے شانتی نکیتن میں داخلہ لیا تھا۔ انہوں نے حیاتیات، کیمیات، طبعیات اور اقتصادیات کے مضامین کا مطالعہ کیا اور بعد ازآں وہ شانتی نکیتن چلے گئے، جہاں گرودیو رویندر ناتھ ٹھاکر سے متاثر ہو کر آرٹ سینٹر میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ وشو بھارتی میں تین برس تک مصوری کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد ستیہ جیت رائے نے کلکتہ کی ایک اشتہاری ایجنسی میں کمرشیل آرٹسٹ کے طور پر کام کرنا شروع کر دیا حالانکہ ان کی دلچسپی فلموں میں تھی۔

۱۹۴۷ء میں انہوں نے اپنے کچھ دوستوں کے ساتھ مل کر کلکتہ فلم سوسائٹی قائم کی۔ ۱۹۴۸ء میں ان کی ملاقات مشہور فلم ہدایت کار جین رینواں سے ہوئی، جو اس وقت کلکتہ میں اپنی فلم "دی ریور" کی شوٹنگ کے لیے آئے ہوئے تھے۔ ۲۰ر اکتوبر ۱۹۴۸ء کو ان کی شادی وجیا کے ساتھ ہوگئی جو ایک عام گھریلو قسم کی لڑکی تھی۔ وجیا کے والد پٹنہ میں بیرسٹر تھے۔ اپنے والد کے انتقال کے بعد وجیا اپنی بہن کے ساتھ کلکتہ آگئی۔ اس وقت وجیا کی عمر تقریباً بارہ برس کی تھی، اور ان کے پاس مغربی موسیقی کا اچھا خاصا ذخیرہ بھی تھا۔ ستیہ جیت رے کو بھی موسیقی سے عشق تھا۔ لہٰذا دونوں خاندانوں میں پہلے سے ہی اچھی طرح جان پہچان تھی۔

۱۹۴۳ء میں شانتی نکیتن سے فارغ التحصیل ہو کر انہوں نے ایک برٹش اشتہاری کمپنی "ڈی۔ جے۔ کیمر اینڈ کو" میں بحیثیت مصور ملازمت کر لی، جہاں ان کو ۸۰ر روپے ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ ڈی۔ جے۔ کیمر نے ہی ستیہ جیت رے کو ۱۹۵۰ء میں خصوصی تربیت حاصل کرنے کے لیے لندن بھیجا تھا۔ اس اشتہاری کمپنی میں وہ آرٹ ڈائیریکٹر کے عہدے تک پہنچے اور جب ۱۹۵۲ء میں ڈی۔ جے۔ کیمر نے اپنی اشتہاری کمپنی بند کر دی تو ستیہ جیت رے نے اپنی ذاتی کلیرین ایڈورٹائزنگ ایجنسی قائم کر لی اور خود اس کے ڈائرکٹر بنے۔ ستیہ جیت رے کچھ عرصہ تک ڈی۔ کے گپتا کے پریس سے بھی وابستہ رہے اور انہوں نے بہت سی کتابوں کے سرورق بنائے۔ ان میں جواہر لعل نہرو کی کتاب "ڈسکوری آف انڈیا" بھی شامل ہے، جس کا سرورق بھی ستیہ جیت رے نے ہی بنایا تھا۔

ستیہ جیت رے ۱۹۵۰ء میں جب لندن گئے تو انہوں نے وہاں اپنے قیام کے ساڑھے چار ماہ کے عرصے میں تقریباً سو فلمیں دیکھیں۔ ان فلموں سے وہ نہ صرف بے حد متاثر ہوئے بلکہ انہوں نے فلم سازی کے بہت سے تکنیکی پہلو بھی سیکھ لئے۔ وہاں ان فلموں میں سے جس فلم نے ستیہ جیت رے کو سب سے زیادہ متاثر کیا، اُس کا نام "بائیسکل تھیوز" تھا، اور تب تھیٹر سے باہر نکلتے وقت ہی انہوں نے طے کر لیا تھا کہ ان

کو ایک فلمساز ہی بنتا ہے۔

جب ستیہ جیت رے لندن سے پانی کے جہاز کے ذریعہ ہندوستان واپس آرہے تھے تو اِس طویل سفر کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے انہوں نے بنگال کے مشہور ادیب و ناول نگار وبھوتی بھوشن بندھوپادھیائے کے مشہور ناول ''پاتھیر پانچالی'' کا فلم کے لیے منظر نامہ خود تحریر کیا۔ بعد میں اس کہانی پر انہوں نے ''پاتھیر پانچالی'' کے نام سے اپنی پہلی فلم بنائی۔ اس فلم کو بنانے کے لیے کوئی فلم ساز تیار نہ تھا اور نہ ہی کوئی ساتھ دینے والا تھا۔ تب ان کی والدہ نے اس وقت کے بنگال کے وزیر اعلیٰ ڈاکٹر بی۔ سی۔ رائے کے کسی رشتہ دار کی معرفت صوبائی حکومت سے مدد کرنے کی عرضی دی، اور اس طرح مغربی بنگال حکومت نے اس فلم کو بنانے میں ستیہ جیت رے کی مدد کی۔ اس کے باوجود ان کو اس فلم کی تیاری کے لیے اپنی بیوی کے زیور بھی فروخت کرنے پڑے۔ ستیہ جیت رے اپنی فلم کی شوٹنگ کے دوران تقریباً بھی کاموں پر خود توجہ دیتے تھے۔ وہ کیمرے کے پیچھے بھی رہتے تھے اور فلم کی ایڈیٹنگ بھی خود کرتے تھے۔ ان کو موسیقی کی بھی بڑی اچھی سمجھ تھی۔

جب یہ فلم بن کر نمائش کے لیے ۱۹۵۵ء میں پیش کی گئی تو ملک اور بیرون ملک اس فلم ''پاتھیر پانچالی'' کو بڑی شہرت حاصل ہوئی، اور ان کے اچھے دنوں کی شروعات ہو گئی۔ ۱۹۵۶ء میں کانس فلم میلہ میں اس فلم کی نمائش ہوئی اور عالمی سطح پر اس فلم کے ساتھ ستیہ جیت رے کو بھی مقبولیت حاصل ہوئی۔

اس کے بعد ۱۹۵۷ء میں ان کی ایک اور فلم ''اپراجیتو'' کی نمائش ہوئی۔ اس فلم کو بھی پسند کیا گیا اور پھر ستیہ جیت رے نے پیچھے مڑ کر نہیں دیکھا۔ ۱۹۵۸ء میں ''پارس پتھر'' اور اسی برس ان کی فلم ''جل سادھر'' نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ ۱۹۵۹ء میں ''اپور سنسار'' اور ۱۹۶۰ء میں ''دیوی'' فلموں کی نمائش ہوئی۔ ستیہ جیت رے نے ۱۹۶۱ء میں گرودیو رویندر ناتھ ٹھاکر کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم ''رویندر ناتھ ٹیگور'' کے نام سے ہی بنائی اور اس کے ساتھ ہی اسی برس ان کی ایک اور فلم ''تین دیویاں'' کی نمائش

بھی ہوئی۔ ستیہ جیت رے اپنی زندگی میں ٹیگور سے بہت متاثر تھے لہٰذا ٹیگور پر ان کی اس فلم کو بہت پسند کیا گیا۔

ستیہ جیت رے نے اپنی تمام فلموں میں مختلف قسم کے سماجی مسائل کو بیان کیا ہے اور ان مسائل کے حل کے لیے فلم بیٹوں کی حصہ داری کی ضرورت پر بھی زور دیا ہے۔ ان کا خیال تھا کہ یہ سب معاشرتی مسائل ہیں اور ان کا حل بھی معاشرے کے ہر طبقے کے لوگوں کو مل جل کر ہی تلاش کرنا ہوگا۔ ستیہ جیت رے نے ہندوستانی سنیما کو اعلیٰ درجے کی تبدیلیاں بخشیں۔ انہوں نے اپنی ہدایتکارانہ صلاحیتوں، تکنیکی اہلیت، نئے موضوعات اور بامقصد استعداد سے فلموں کو باکس آفس کی غلامی سے آزاد کرایا۔

۱۹۶۲ء میں ستیہ جیت رے کی دو فلمیں نمائش کے لیے پیش کی گئیں۔ ''کنچن جنگا'' اور ''ابھی جن'' ان میں ''کنچن جنگا'' کو کافی شہرت ملی اور اس کے بعد ۱۹۶۳ء میں انہوں نے فلم ''مہانگر'' بنائی۔ ستیہ جیت رے کی ایک اور اہم فلم ''چارولتا'' ۱۹۶۵ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ یہ فلم ٹیگور کی ایک مختصر کہانی پر مبنی تھی، جس کی ہیروئن ایک شادی شدہ عورت ہے جو اکیلے پن کا شکار ہو جاتی ہے۔ ۱۹۶۵ء تک کی ستیہ جیت رے کی سب سے بہترین جزیات نگاری کی مثال فلم ''چارولتا'' ہی بن سکی ہے۔ ۱۹۷۰ء میں ان کی فلم ''آرنیئر دن راترے'' کو بھی کافی شہرت حاصل ہوئی۔

۱۹۷۷ء میں جب ان کی پہلی ہندی فلم ''شطرنج کے کھلاڑی'' کی نمائش ہوئی تو ایک بار پھر ان کو عالمی سطح پر شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ یہ فلم اردو کے مشہور افسانہ و ناول نگار منشی پریم چند کی کہانی پر بنائی گئی تھی۔ اُن کی فلمیں انسانی سماج اور اس کے مسائل کی آئینہ دار ہوتی ہیں۔ خاص طور پر انہوں نے اپنی فلموں کے ذریعہ بنگال کے مختلف طبقوں کی سماجی حیثیت کو مدنظر رکھ کر فلموں کی تخلیق کی ہے۔ وہ اپنی فلموں کی اسکرپٹ لکھنے کے علاوہ ہدایتکاری، کاسٹنگ، کیمرہ کا استعمال اور آرٹ ڈائریکشن کے علاوہ اپنی فلموں کے اشتہار اور دیگر پبلسٹی کا سامان بھی خود تیار کرتے تھے۔ وہ خود ایک تجربہ کار ادیب، پبلشر، السٹریٹر، گرافک ڈزائنر اور فلموں کے بہترین ناقد بھی تھے۔

۱۹۸۱ء میں ستیہ جیت رے کی ایک اور بہترین فلم ''سدگتی'' کی نمائش ہوئی اور اس فلم کو بھی بہت سراہا گیا۔ ۱۹۹۱ء میں ان کی آخری فلم "آگنتُک" (Agantuk) کی نمائش ہوئی۔

عالمی شہرت یافتہ فلمساز و ہدایتکار ستیہ جیت رے ہمہ جہت قسم کے فنکار ہونے کے باوجود غرور ان کے مزاج میں بالکل نہیں تھا۔ چھوٹے سے چھوٹے فنکار کے لئے بھی ان کے دل میں عزت اور پیار بھرا رہتا تھا۔ چھوٹے اور معصوم بچوں کے ساتھ وہ بھی بچے بن جاتے تھے۔ بچوں کے ساتھ خصوصی لگاؤ اور پیار کی ہی وجہ سے انہوں نے بچوں کے لیے کئی جاسوسی اور سبق آموز کہانیاں لکھیں، نظمیں لکھیں اور بچوں کے ایک رسالہ ''سندیش'' کی ۳۰ر برس تک کامیابی کے ساتھ ادارت بھی کی۔ اس کے ساتھ ہی بچوں کے لیے کئی ایوارڈ یافتہ فلمیں جیسے ''پنکو'' اور ''ہیرک راجر دیشے'' کی فلمسازی اور ہدایتکاری بھی کی۔

ستیہ جیت رے نے ہالی ووڈ (امریکہ) کے لیے ایک سائنس فکشن فلم ''دی ایلین'' کے نام سے اسکرپٹ تیار کی تھی۔ یہ دوسری دُنیا کے ایک ایسے کردار کی کہانی تھی جو ہماری زمین پر آجاتا ہے اور یہاں ''بابا'' نام کے ایک لڑکے سے اس کی دوستی ہو جاتی ہے۔ بعد میں انہوں نے خود ہی اس پروجیکٹ کو پس پشت ڈال دیا۔ کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ستیہ جیت رے کی اس اسکرپٹ اور اسٹیون اسپیل برگ کی فلم ''ای۔ٹی۔'' میں کافی یکسانیت ہے۔

ستیہ جیت رے کے ذریعہ بنائی گئی تقریباً سبھی فلمیں مقبول ادبی شہ پاروں پر مبنی تھیں۔ کچھ ان کی اپنی کہانیوں پر بھی بنائی گئی تھیں۔ انہوں نے اپنے تقریباً چالیس برس کے فلمی سفر میں ۲۹ر فیچر فلموں کے علاوہ کئی دستاویزی فلمیں بھی بنائیں۔ جن میں ''سکم'' (Sikkim)، ''دی اِنر آئی''، ''جے بابا فیلوناتھ'' اور ''سوکمار رائے'' وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ ستیہ جیت رے جتنے خاموش مزاج تھے اتنے ہی وہ زود رنج بھی تھے۔ ان کو غصہ اس وقت آتا تھا جب کوئی ان کی فلموں پر تنقید کرتے ہوئے یہ کہتا تھا کہ ان

کی فلم آرٹسٹک تو ہے لیکن کمرئل نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ فلموں سے ان کی آمدنی کم ہو گئی تھی لیکن کتابوں اور دیگر تصانیف سے جو رائلٹی ان کو ملتی تھی، وہ بھی کچھ کم نہ تھی۔

ستیہ جیت رے بے حد سیدھے سادے مزاج کی شخصیت کے مالک تھے اور خاموش طبع بھی۔ خاندان کے سبھی لوگ اُن کو مانک دا کہتے تھے۔ انہوں نے کبھی اپنے لیے سکریٹری نہیں رکھا۔ اپنے تمام کام وہ خود کرتے تھے۔ چاہے خطوط کا جواب دینا ہو، ٹیلیفون اُٹھانا ہو یا پھر کسی کے لیے دروازہ کھولنا ہو۔ اُن کی ضروریات بھی بہت کم تھیں۔ صاف ستھرا کرتا پائجامہ اور سادہ کھانا اُنہیں بے حد پسند تھا۔

بمبئی کے کئی فلم اداکاروں کو وہ پسند کرتے تھے۔ خاص طور پر اوم پوری، سمتا پاٹل اور موہن آگاشے کی اداکارانہ صلاحیتوں سے وہ متاثر تھے۔ وہ مانتے تھے کہ بمبئی کے اداکاروں میں زیادہ صلاحیتیں ہیں، جبکہ بنگال کے اداکار اس معاملے میں انہیں قدرے مایوس کرتے تھے۔ ایک بار دلیپ کمار نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ اگر اُن کو موقع ملے اور ان کے لائق کوئی بہتر کردار ہو، تو وہ ضرور ستیہ جیت رے کے ساتھ کام کرنے میں فخر محسوس کریں گے۔

ستیہ جیت رے کو فلموں سے متعلق دُنیا کے تقریباً سبھی بڑے اعزازات سے نوازا گیا۔ ایک سنجیدہ اور باوقار فلمساز کے طور پر کانس، وینس، برلن وغیرہ کے مقبول عالمی فلمی میلوں میں ان کو اعزازات سے نوازا جانا بڑی اہم بات ہے۔ ۱۹۵۵ء میں اُن کی پہلی ہی فلم ''پاتھیر پانچالی'' سے اعزازات کا یہ سلسلہ شروع ہو گیا تھا اور ان کی آخری فلم "آگنتک" کو ۱۹۹۱ء میں یوروپ کے مقبول فلمی میلوں میں شہرت اور اعزازات کا اعلیٰ مقام حاصل ہوا۔ ۱۹۶۷ء میں میگسیسے اعزاز، ۱۹۷۱ء میں ''سٹار آف یوگوسلاویہ'' اعزاز، ۱۹۷۴ء میں رائل کالج آف آرٹس کی ڈی۔لٹ کی ڈگری، ۱۹۷۶ء میں پدم وبھوشن، ۱۹۷۸ء میں آکسفورڈ یونیورسٹی کی ڈی۔لٹ کی ڈگری اور برلن کا خصوصی اعزاز، ۱۹۸۵ء میں سوویت لینڈ کا نہرو انعام، ۱۹۸۷ء میں فرانس کا خصوصی اعزاز وغیرہ ایسے بیشمار انعام واعزاز ہیں جن سے ستیہ جیت رے کو نوازا گیا۔

۳۰/مارچ ۱۹۹۲ء کو لاس اینجلس میں ان کو زندگی بھر کی فلمی خدمات کے لیے دنیا کے سب سے بڑے فلمی اعزاز ''آسکر'' سے نوازا جانا نہ صرف ان کے لیے بلکہ پورے ملک ہندوستان کے لیے فخر کی بات ہے۔ ستیہ جیت رے نے دُنیا بھر کے متعدد فلمی میلوں میں جیوری کے صدر کے فرائض بھی انجام دیے۔

۱۹۸۵ء میں حکومت ہند نے ستیہ جیت رے کو ان کی زندگی بھر کی فلمی خدمات کے لیے دادا صاحب پھالکے ایوارڈ سے نوازا، اس کے ساتھ ہی ان کو ''بھارت رتن'' کا اعزاز بھی دیا گیا۔

۲۷/جنوری ۱۹۹۲ء کو ستیہ جیت رے کو ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا۔ اُن کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس سے قبل بھی ایک بار ۱۹۸۳ء میں اُن کو دِل کا دورہ پڑ چکا تھا۔ دل کے دُوسرے دورے کے بعد سے اُن کی صحت برابر بگڑتی چلی گئی اور پھر ۲۳/اپریل ۱۹۹۲ء کی شام پانچ بج کر ۳۰/منٹ پر انھوں نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی اور اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ اُن کا ایک بیٹا سندیپ رے ہے، جو خود بھی ایک بہترین مصنف اور فلمساز وہدایتکار ہے۔

○○
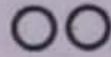
رنجن

فلمساز رنجن کے نام سے نئی نسل کے فلم بین شاید واقف نہ ہوں، جبکہ درمیانی عمر کے فلم بین آج بھی رنجن کو ایک اسٹنٹ ہیرو کے طور پر جانتے ہیں۔ صرف بڑی عمر کے فلم بین ہی ہیں جو رنجن کو ایک اچھے ہیرو کے طور پر جانتے پہچانتے ہیں، یہ وہی رنجن تھے جنہوں نے نے پہلی بار ''چندر لیکھا'' میں آکر بمبئی کی فلمی دنیا میں ہنگامہ مچا دیا تھا۔

''چندر لیکھا'' کے بعد رنجن نے جیمنی پروڈکشنز کی دوسری فلم ''نشان'' میں اداکاری کے جوہر دکھائے، اس فلم میں رنجن کا ڈبل رول تھا۔ صرف اداکاری ہی نہیں، رنجن میں اور بھی بہت سی خوبیاں تھیں۔ وہ ایک اسکالر تھے۔ لٹریچر میں ایم۔اے، ماہر موسیقی، کلاسیکی رقص وموسیقی میں ایک اتھارٹی، وہ ایک ماہر مقرر، گھوڑسوار بھی تھے۔ کلاسیکل ڈانس کی پوری جانکاری ان کو تھی۔ اس کے ساتھ ہی تصنیف وتالیف کا بھی شوق تھا۔ فلمستان کی فلم ''منیم جی'' کا بنیادی خیال ڈائیریکٹر ایس۔ کے۔ اوجھا نے دیا تھا، جبکہ اس فلم کی کہانی رنجن نے قلم بند کی تھی۔ رنجن ایک اچھے مصور بھی تھے۔ فزکس میں بی۔اے۔ کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی رقص رقص وموسیقی پر مبنی ایک میگزین ''ناٹیم'' کی ادارت کی ذمہ داری بھی سنبھال رکھی تھی۔

امر واقعہ یہ ہے کہ ان خوبیوں کی وجہ سے اس عظیم فنکار کو دو مرتبہ سوویت یونین اور چین بلایا گیا، جہاں اس نے فنون لطیفہ پر لیکچر دیا۔ انتقال سے قبل رنجن امریکہ میں تھے۔ وہاں کی مختلف یونیورسٹیز میں موسیقی، رقص، سنسکرت اور ویدک لٹریچر وغیرہ پر رنجن نے لیکچر بھی دیے تھے۔

فلموں میں آنے کے بعد رنجن نے جنوبی ہند کی فلموں میں کام کرنا چھوڑ دیا تھا۔ پہلی فلم ''چندر لیکھا'' بمبئی کے پروڈوسروں کے لئے ایک چیلنج ثابت ہوئی تھی۔ فلم کے عظیم سیٹ، ملبوسات، نظر فریب لوکیشنز، بڑے پیمانے پر فلمائی گئی اس شہرۂ آفاق تخلیق کو ایک طرح سے ''منی مغلِ اعظم'' کا نام دیا جا سکتا ہے۔ اس فلم کی ہیروئین ٹی۔ آر۔ راجکماری تھی۔ ''نشان'' میں رنجن نے بھانومتی کے مقابل ہیرو کا ڈبل رول ادا کیا تھا۔ جہاں تامل کی فلم ''منگلا'' نے رنجن کو جنوبی ہند کا مقبول اسٹار بنا دیا تھا، وہیں ہندی فلم ''چندر لیکھا'' سے رنجن پورے ہندوستان کا محبوب ستارہ بن گئے تھے۔ وہ ایک دھاکہ کے ساتھ فلموں میں آئے اور زوردار پبلیسٹی کے سہارے دیکھتے ہی دیکھتے ہندوستان کے فلم بینوں کے دلوں پر چھا گئے۔

رنجن کی سب سے بڑی خامی زبان کی جانکاری نہ ہونا تھی۔ وہ اپنے تامل لب ولہجہ کو آخر تک نہ چھوڑ پائے۔ تامل سے اُن کو ازحد لگاؤ تھا۔ اسی وجہ سے وہ عام آدمیوں سے ملنا جلنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ پروفیشنل فرنٹ پر ایک ایکشن ہیرو کے طور پر ان کو جواب نہیں تھا۔ لیکن زبان کا مسئلہ ایک اچھا ہیرو بننے کی راہ میں اڑچن بنا ہوا تھا۔ اس وجہ سے وہ ایک ایکشن ہیرو بن کر رہ گئے۔

چندر لیکھا، نشان، منگلا کے بعد سُپر ہٹ فلم ''مداری'' میں رنجن کے ساتھ چترا نے ہیروئین کا رول ادا کیا تھا۔ اس فلم کا ایک گانا ''پیا میرا مجبور پردیسی سیاں'' کافی مقبول ہوا تھا۔ ''مایا جال'' میں بھی رنجن کی جوڑی چترا ہی کے ساتھ بنی۔ جبکہ فلم ''دو شہزادے'' اور ''فلائیٹ ٹو آسام'' جیسی فلموں میں رنجن کے ساتھ شکیلہ نے ہیروئین کا رول ادا کیا تھا۔ رنجن کی ایک ابتدائی فلم ''سندباد جہازی'' میں سائرہ بانو کی والدہ نسیم بانو ہیروئین تھیں۔

جہاں تک شخصیت کا تعلق ہے، کاروباری اعتبار سے وہ انتہائی بالغ ذہن تھے۔ عام زندگی میں انتہائی محتاط، خوش مزاج، بذلہ سنج، خرچیلے، لیکن کسی حد تک خود پسند بھی، دانشورانہ مباحثہ میں وہ اپنی ذاتی رائے کو بدلنے کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ مثال

کے طور پر کسی بھی فلم کے بارے میں ان سے دریافت کیا جائے تو وہ ایک ایک کر کے اس کی خامیاں گنوا دیتے تھے۔ ان کو ہر اچھی شے کے بخیے ادھیڑنے کا شوق تھا۔

اگرچہ وہ ہر فن مولا تھے، لیکن کسی ایک فن میں بھی انہوں نے اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کا بھرپور مظاہرہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ فلمسازی کی تکنیک سے وہ بخوبی واقف تھے۔ فلم ڈائریکٹ کرنے کے لئے اُن کو کئی آفر بھی آئے، لیکن کوئی ایک بھی اپنے انجام کو نہ پہنچ سکی۔ رنجن کے ظاہری خدوخال اور شکل وصورت سے بھی لوگوں کو مغالطہ ہو جاتا تھا۔ اگرچہ وہ ایک انتہائی ذہین دانشور تھے، لیکن دیکھنے میں وہ بہت ہی کرخت اور خشک مزاج سے لگتے تھے۔ شاید اداکار کے طور پر کسی حد تک ناکامی کی بھی یہی ایک وجہ تھی۔

سگریٹ نوشی کے انتہائی شوقین، ہونٹوں سے ہمیشہ سگریٹ لگا رہتا تھا۔ نہ شراب پیتے تھے اور نہ ہی گوشت کھاتے تھے۔ اس لحاظ سے وہ کٹر برہمن تھے۔ ان کی دو بیویاں تھیں۔ پہلی بیوی کملا ایک ڈاکٹر تھی، جس سے وہ ایک عرصہ قبل الگ ہو چکے تھے۔ جبکہ دوسری بیوی لکشمی تھی جو کہ بمبئی میں ان کے ساتھ رہا کرتی تھی۔ وہ ایک پڑھی لکھی عورت تھی، وہ ایل۔ ایل۔ بی۔ تھی۔

ایک بار بمبئی آنے کے بعد رنجن نے جنوبی ہند کی فلموں میں کام کرنا بند کر دیا تھا۔ انہوں نے مدراس میں میوزک اور ڈانس کا اسکول بھی کھولا تھا اور اپنا ایک نجی گروپ بھی بنایا تھا۔ رنجن کی دونوں بیویوں میں سے کسی ایک سے بھی اولاد نہیں تھی۔ اسکرین پر انہوں نے تلوار بازی کے بے پناہ جوہر دکھائے۔ ان کے آخری دَور کی چند فلموں میں ''چیتالی، عشق عشق عشق، چور چور، اور گرہ پرویش'' قابل ذکر ہیں۔

رنجن نے سب سے پہلے ۱۹۴۷ء میں تامل فلم ''رشیہ بیرنگ'' میں کام کیا تھا۔

تقریباً چالیس برس کے فلمی کیریئر میں انہوں نے ساٹھ سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔

رنجن کا انتقال امریکہ میں ہوا۔ آپ کے جسد خاکی کو لندن میں مقیم ان کے بھائی کے مطابق وہیں دفنا دیا گیا۔

○○

گوھر بائی

خاموش اور متکلم فلموں کی نامور ہیروئن، پروڈیوسر اور اسٹوڈیو کی مالکن گوہر بائی کا جنم ۱۹رنومبر ۱۹۱۰ء کو لاہور میں ہوا تھا۔ گوہر کا پورا نام گوہر عبدالقیوم ماماجی والا تھا۔ گوہر نے چائلڈ اسٹار کے طور پر تو کام نہیں کیا، لیکن پندرہ برس کی چھوٹی عمر میں فلم لائن اختیار کر لی تھی اور پہلی ہی فلم ''باپ کمائے'' میں ہیروئن کا رول کیا تھا۔ اس خاموش فلم کے ساتھ ہندی میں سب ٹائٹلس لگائے گئے تھے اور یہ فلم ہدایتکار کے۔ راٹھور نے ۱۹۲۵ء میں کرشنا فلم کمپنی کے لئے بنائی تھی۔ اس فلم میں گوہر کے ساتھ تنکی اور گلاب گنگارام نے بھی کام کیا تھا۔ باکس آفس پر فلم زبردست ہٹ ثابت ہوئی۔ فلم نے بمبئی کے کرشنا تھیٹر میں جو کہ آج کل ڈریم لینڈ کے نام سے مشہور ہے، کامیابی کے شاندار ریکارڈ قائم کئے۔ بہت کم ہیروئنیں ایسی ہوں گی جو اپنی پہلی ہی فلم سے اسٹار بن گئی ہوں۔ گوہر بائی کو یہ فخر حاصل رہا ہے کہ وہ پہلی ہی فلم کی ریلیز کے ساتھ اسٹار کہلانے والی اولین ہیروئن تھیں۔

اس کے بعد گوہر بائی کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے گوہر بائی کے چرچے ملک بھر میں ہونے لگے۔ ان دنوں کوہ نور فلم کمپنی صف اول کی فلم کمپنی کہلاتی تھی۔ گوہر بائی نے اپنی تمام تر صلاحیتوں اور فنی خوبیوں کی وجہ سے کوہ نور کمپنی میں اعلیٰ مقام حاصل کر لیا تھا۔ پروڈیوسر دوارکاداس سمپت کی فلم کمپنی کوہ نور میں گوہر کو جو عزت ملی وہ شاید کسی اور ایکٹریس کو حاصل نہ ہو پائی۔ فلم کمپنی کا ہر چھوٹا بڑا ملازم گوہر بائی کی بے حد عزت کرتا تھا اور گوہر بھی ان کے ساتھ بڑے پیار سے پیش

آتی تھیں، جیسے سب ایک ہی خاندان کے فرد ہوں۔ اسی دوران گوہر نے کچھ عرصہ جگدیش فلم کمپنی کے لئے بھی کام کیا۔ اُن دنوں گوہر کی جو فلمیں زیادہ مشہور اور کامیاب رہیں، ان میں ''جنگل کا پھول، مس ۱۹۳۳ء، ندیا کے پار، سورگ سندری'' اور ''بیرسٹر کی بیوی'' خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ وہ کوہِ نور فلم کمپنی ہی تھی جہاں گوہر کی ملاقات ایک ایسے نوجوان سے ہوئی جس نے اس کی زندگی میں نہ صرف اہم رول ادا کیا، بلکہ ان کی قربت، دوستی، تعلقات اور رشتوں کی کڑیاں اس قدر مضبوط ثابت ہوئیں کہ بادِ مخالف کا ایک بھی جھونکا کسی ایک کڑی کو کبھی نہ ہلا سکا۔ مسٹر سمپت نے چندولعل شاہ کو اپنی ایک فلم مکمل کرنے کے لئے سائن کیا تھا۔ اس فلم میں ہیروئن کا رول گوہر ادا کر رہی تھیں۔ اس موقع پر ہی گوہر اور چندولعل شاہ میں پہلی ملاقات ہوئی، ہیروئن اور ہدایتکار کی دوستی ہی کا نتیجہ تھا کہ دونوں نے مل کر ۱۹۲۵ء میں رنجیت فلمز کی بنیاد رکھی اور اس کے فوراً بعد ہی دادر، بمبئی میں شری رنجیت مووی ٹون کے جھنڈے تلے گوہر بائی کی پہلی خاموش فلم ''پتی پتنی'' تھی جس میں سردار چندولعل شاہ کی ڈائریکشن کے تحت گوہر نے ہیرو راجہ سینڈو کے ساتھ کام کیا تھا۔ ۱۹۳۲ء میں کمپنی نے اولین متکلم فلم ''دیوی دیویانی'' بنائی۔ اس میں بھی ایک بار پھر گوہر نے ماسٹر بھگوان داس کے مقابل ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ گوہر نے رنجیت مووی ٹون کی کئی فلموں میں کام کیا۔ ان تمام فلموں کے ہدایتکار چندولعل شاہ تھے۔ چوتھی دہائی کے اوائل میں ایک بار پھر رنجیت مووی ٹون نے پہلی گجراتی فلم ''ستی ساوتری'' پروڈیوس کی جس میں ہیروئن کا رول گوہر بائی نے ادا کیا تھا۔ گوہر کی آخری فلم ''اچھوت'' تھی جس میں گوہر نے موتی لعل کے مقابل ہیروئن کا رول ادا کیا تھا۔ یہ فلم ۱۹۴۰ء میں ریلیز ہوئی تھی۔

اگرچہ ۱۹۴۰ء سے گوہر بائی نے فلموں میں کام کرنا بند کر دیا تھا، لیکن فلم لائن سے پوری طرح کنارہ کشی اختیار نہیں کی تھی۔ رنجیت مووی ٹون اور اسٹوڈیوز کی ذمہ داریاں کچھ کم نہ تھیں۔ سردار چندولعل شاہ کے تعاون سے گوہر نے تمام تر ذمہ داریاں نہایت خوش اسلوبی اور اعتماد کے ساتھ نبھائیں۔ یہ کوئی معمولی کام نہیں تھا۔ اسٹوڈیو

بہت بڑا تھا، کاروبار بہت پھیلا ہوا تھا۔ اسٹوڈیو میں چار شوٹنگ اسٹیج (فلور) تھے جو اُس زمانہ میں بہت بڑی بات تھی۔ اس کے ساتھ ہی ایڈیٹنگ روم، ریکارڈنگ روم، ایک لیبارٹری، منی تھیٹر، میوزک ڈپارٹمنٹ، اس کے ساتھ ہی سُر اور سنگیت سے تعلق رکھنے والا مستقل اسٹاف، بڑھئی کے کام کا ایک الگ ڈپارٹمنٹ تھا۔ ایک پینٹنگ ڈپارٹمنٹ تھا، پبلسٹی ڈپارٹمنٹ الگ سے تھا۔ کاسٹیوم اور میک اپ ڈپارٹمنٹ بھی تھے۔ غرضیکہ فلمسازی سے تعلق رکھنے والا ہر شعبہ رنجیت اسٹوڈیو میں موجود تھا جس کی دیکھ ریکھ چندولعل شاہ سے زیادہ گوہر بائی کرتی تھیں۔ جنگ کے زمانہ میں اسٹوڈیو میں ایک راشن شاپ بھی کھول دی گئی۔ تقریباً چار سو افراد اسٹوڈیو میں کام کرتے تھے۔ اُن دنوں کی فلمی سرگرمیوں کے اعتبار سے یہ ایک بہت بڑی تعداد تھی۔ راشن کے زمانے میں اسٹوڈیو اسٹاف کی سہولت کے لئے راشن کی دُکان کھولنا بہت ضروری تھا۔ اس سے ہی پتہ چلتا ہے کہ گوہر بائی کے دل میں اسٹوڈیو کے ملازمین کے لئے کتنا پیار تھا۔ تقریباً ۲۳ر برس (۱۹۲۵ء تا ۱۹۵۲ء) تک رنجیت مووییٹون کا کام کاج جاری رہا۔ اس ۲۳ر برس کے عرصہ میں اس فلم کمپنی نے ۱۶۰ر سے زائد فلمیں بنائیں۔ اسٹوڈیو تو بند ہو گیا، لیکن گوہر بائی اور چندولعل شاہ کے درمیان دوستی کی جو کڑیاں تھیں، وہ چندولعل شاہ کی زندگی ۲۹ر نومبر ۱۹۷۵ء تک قائم رہیں۔ حالانکہ گوہر بائی نے اس سے بہت قبل سرگرم فلمی زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی تھی۔ گزشتہ بیس برسوں سے گوہر بائی کا فلموں سے کوئی خاص تعلق نہیں تھا۔ وہ بڑے آرام سے پُرسکون ماحول میں زندگی بسر کر رہی تھی۔ ۲۸ر ستمبر ۱۹۸۵ء کو قضا نے اس عظیم فنکارہ کو اپنے دامن میں سمیٹ لیا۔ موت کے وقت گوہر کی عمر ۷۵ر برس تھی۔ ہوسکتا ہے نئی نسل نے گوہر بائی کا نام نہ سنا ہو۔ عین ممکن ہے آنے والی نسلیں بھی گوہر بائی کو یاد نہ رکھ سکیں، لیکن فلموں کو گوہر بائی نے جو کچھ دیا ہے، اُسے کبھی فراموش نہیں کیا جا سکتا۔

OO
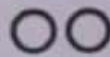
جیون

جموں کشمیر کے علاقہ گلگت کے وزیر دُرگا پرساد ڈار کے سب سے چھوٹے لڑکے اونکار ڈار جیون کا جنم ۱۹۱۵ء میں سری نگر میں ہوا۔ جب جیون کی عمر صرف بیس برس تھی اور دیال سنگھ کالج، لاہور میں زیر تعلیم تھے، تو انہیں ۱۹۳۵ء میں ایک مرتبہ چھٹیاں گزارنے بمبئی جانے کا اتفاق ہوا۔ کسی کو کیا علم تھا کہ اس کے بعد جیون کو پھر کبھی لاہور کا منہ دیکھنا نصیب نہ ہوگا۔ بمبئی میں جیون کی ملاقات دوارکا دویچہ سے ہوئی، جو فلموں میں فوٹوگرافر بننا چاہتے تھے۔ جیون نے بھی فلموں میں کام کرنے کا فیصلہ کرلیا اور دونوں کام کی تلاش میں نکل پڑے۔ انہیں کام تو مل گیا لیکن سینماٹوگرافر کا نہیں، بلکہ اس سے متعلق انہیں ریفلکٹروں پر چمکدار کاغذ چسپاں کرنے کا کام دیا گیا۔ دونوں اُسی کام سے خوش تھے کہ چلو فلموں تک تو پہنچے۔ اُن ہی دنوں ہدایت کار موہن سنہا (اداکارہ وِدیا سنہا کے نانا) ایک فلم "فیشن ایبل انڈیا" بنا رہے تھے۔ انہیں فلم کے لئے ایک نئے ہیرو کی تلاش تھی۔ بہت سے نئے چہروں کا انٹرویو لینے کے بعد بھی جب انہیں اپنی پسند کا ہیرو نہیں ملا، تو ایک دن ان کی نظر اچانک ہی جیون پر پڑی۔ جو ریفلکٹر پر کاغذ چپکا کر اس کے سوکھنے کا انتظار کر رہا تھا۔ موہن سنہا نے اُس سے پوچھا کہ کیا تم ایکٹر بنو گے؟

پروڈیوسر ڈائریکٹر وجے بھٹ کی فلم "پولس" سے جیون کی شہرت کا آغاز ہوا۔ اس فلم میں جیون نے اس وقت کے نامور ہیرو پریم ادیب کے مقابل سائیڈ ہیرو کا رول اس خوبی سے ادا کیا تھا کہ فلم کی ریلیز کے بعد جیون کا نام تو سب کو یاد رہا، ہیرو

ہیروئین پس پشت رہ گئے۔ بس اس کے بعد جیون کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا موقع نہیں ملا۔
''کوہ نور، نیا دور، قانون، وقت، جونی میرا نام، میلہ، امر اکبر انتھونی، اور نصیب'' وغیرہ لاتعداد فلمیں ہیں جن میں جیون نے اپنے پینتالیس برس کے فلمی کیرئیر میں کام کیا۔
جیون کے لئے اس سے اچھا موقع اور کیا ہو سکتا تھا؟ اس کے بعد جیون نے پیچھے مڑ کر نہ دیکھا۔

جیون نے ۶۵۰ سے زیادہ فلموں میں کام کیا ہے۔ ۶۰۰ سے زائد فلموں میں نارد منی کا رول ادا کیا ہے۔ جیون کا کہنا تھا کہ انہوں نے اتنی بار ''نارائن'' کا نام لیا ہے کہ مرنے کے بعد اُن کی آتما سیدھی سورگ میں جائے گی۔
جیون کے آخری ایام کا ذکر کرتے ہوئے ان کے بیٹے کرن کمار نے بتایا۔
''میرے والد نہیں چاہتے تھے کہ ان کی موت میرے کام میں رُکاوٹ بنے۔ جب وہ بیمار تھے، تو مجھے کبھی گھر پر دیکھتے تو کہتے کہ میں کام پر کیوں نہیں گیا۔ لہٰذا اُن کے جذبات کی قدر کرتے ہوئے میں تو کل ہی سے کام پر جانا چاہتا ہوں، لیکن رشتہ داروں کا کہنا ہے کہ میں اٹھاونی کی رسم کے بعد ہی کام پر جاؤں۔''
''وہ اس بات سے بہت خوش تھے کہ میں بھی اب فلموں میں ویلن کا رول کرنے لگا ہوں۔'' کرن کمار نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا...... ''وہ اکثر کہا کرتے تھے کہ کسی نے ہیرو کے بیٹے کو یا ویلن کے بیٹے کو ہیرو بنتے تو سنا ہوگا، لیکن یہ پہلا موقع ہوگا کہ ویلن کا بیٹا ویلن بنا ہے۔''
ہندی فلموں میں تقریباً تیس برس تک نارد منی کا رول ادا کرنے والے نامور فنکار جیون کے انتقال کی خبر بڑے افسوس کے ساتھ سنی گئی۔ ۱۰رجون ۱۹۸۷ء کو جیون کو دل کا دورہ پڑا جس سے وہ جانبر نہ ہو سکے۔ موت سے تین روز قبل جیون کو ناناوتی اسپتال سے باندرا میں گھر لایا گیا تھا۔ اسپتال میں برین ہیمرج یعنی دماغ کی نسیں پھٹ جانے کا علاج چل رہا تھا۔ اسپتال سے واپس آنے کے بعد ہی جیون کی حالت بگڑ گئی اور وہ اپنے ہوش وحواس کھو بیٹھے۔ ہوش میں آنے سے پہلے ہی ان پر دل کا دورہ

پڑا جو جان لیوا ثابت ہوا۔

جیون کی عمر ۷۲ برس تھی۔ اس عظیم فنکار کی موت سے فلم انڈسٹری اور خاص طور سے ان کے رشتہ داروں اور لواحقین کو جو نقصان پہنچا ہے، اس کی تلافی مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ پسماندگان میں جیون کی پتنی، دو لڑکے کرن کمار اور بھوشن ڈار (دونوں ہی ایکٹر ہیں) اور دو لڑکیاں ہیں۔

○○

گیتا بالی

ہالی ووڈ کے ہدایتکار رابرٹ زیڈ پوپ لیونارڈو کا کہنا ہے کہ "کوئی بھی لڑکی بھلے ہی اپنی زبان بند رکھے، لیکن اسے اپنی آنکھیں ہمیشہ کھلی رکھنی چاہئیں۔ جو جذبات الفاظ کے ذریعہ ادا نہ کئے جا سکتے ہوں، وہ آنکھوں کی زبانی کہہ جانے کی صلاحیت لڑکیوں میں ہوتی ہے۔" ایسی ہی دو بولتی آنکھیں تھیں گیتا بالی کے پاس۔ یہ ایک ایسا نام ہے جو اپنے چہرے سے کم اور اپنی آنکھوں سے زیادہ پہچانا جاتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ معمولی شکل وصورت ہونے کے باوجود نرگس، مدھوبالا، ثریا، نگار سلطانہ جیسی خوبصورت دوشیزاؤں کی بھیڑ میں گیتا بالی نے اپنا ایک الگ مقام پیدا کر لیا تھا۔ اپنی آنکھوں سے اپنے جذبات کو پُر اثر طریقے پر ادا کر دینے میں گیتا بالی کو کمال حاصل تھا۔ اس کے دبلے پتلے جسم اور گورے رنگ کے چہرے پر اگر کوئی خاص کشش تھی تو وہ تھیں اس کی دو بڑی بڑی آنکھیں، جن میں حیرت تھی، جستجو تھی، پیار تھا اور بہت کچھ کہہ دینے کی صلاحیت تھی۔ اُس کی آنکھیں ہر وقت متلاشی رہتی تھیں اور ہر بات کی اصلیت جاننے کے لئے بے قرار اور بے چین دکھائی دیتی تھیں۔ شاید اِس کی وجہ یہ رہی ہو کہ اس کو ایک طویل سفر صرف چالیس سال میں طے کرنا تھا۔

آنکھیں جو نہ صرف دل کا آئینہ ہوتی ہیں، بلکہ باہری دنیا کو بھی دیکھتی ہیں اور اس کا عکس دل میں اتار لیتی ہیں۔ وہ بات کرنے والے کی طرف ایک ٹک یوں دیکھتی رہتی تھی کہ اکثر سامنے والا گھبرا جاتا تھا لیکن اس کو گیتا اور اپنے رشتے کے بارے میں فوراً ہی پتہ چل جاتا تھا۔ ابھی وہ آپ کی دوست ہے، ابھی وہ دشمن، اور تھوڑی ہی دیر

میں نہ دوست ہے اور نہ دشمن۔

گیتا بالی کی پہلی فلم تھی کیدار شرما کی ''سہاگ رات''۔ اس فلم کی شوٹنگ کے دوران ہی کیدار شرما نے گیتا بالی کی نظریں اُٹھنے اور جھکنے کے درمیان اُن اَن کہی باتوں کو محسوس کر لیا تھا جو اس کی آنکھوں نے کہی تھیں اور یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنی اگلی فلم کا نام ''باورے نین'' رکھا تھا۔ گیتا بالی بنیادی طور پر دوسروں کے لئے قربانی دینے والی اداکارہ تھی۔ اس کی فلموں کے زیادہ تر کرداروں میں دوسری عورتوں کے لئے اُسے اپنی زندگی قربان کرنا پڑی۔ اس کی پہلی ہی فلم ''سہاگ رات'' کا ہیرو بھارت بھوشن بیگم پارہ سے عشق کرتا ہے اور یہ خود ہیرو سے محبت کرتی ہے اور اپنے محبوب کی محبت کو پائندہ کرنے کے لئے اپنی محبت کی قربانی دے دیتی ہے۔ اس کے بعد ''نیکی اور بدی، کوی، جل پری، دلاری'' اور ''بازی'' جیسی فلموں میں اسے اپنی زندگی اور محبت کی قربانی دینی پڑی۔ اس کی یہ قربانیاں اس کے پرستاروں اور فلم بینوں کے دل کی گہرائیوں میں اترتی چلی گئیں۔

ماسٹر بھگوان کی فلم ''البیلا'' کا ایک منظر تھا۔ ایک بیکار سا آدمی پیارے (بھگوان) آشا (گیتا بالی) کی زندگی میں آتا ہے اور اس کی تحریک پر پیارے ایک بڑا فنکار بن جاتا ہے۔ آشا اُسے پیار کرنے لگتی ہے لیکن وہ بدھو سمجھ نہیں پاتا۔ آخر وہ گاتی ہے...... ''بلما بڑا نادان رے، پریت کی نہ جانے پہچان رے''۔ اس گیت میں اس کی آنکھیں محبت کی زبان بولتی ہیں، پھر بھی وہ بدھو اپنے بھولے پن سے پوچھتا ہے...... ''یہ کون سے ناٹک کا گانا ہے۔'' آشا بالکل غیر جذباتی ہو کر جواب دیتی ہے۔ ''جو ناٹک میں زندگی میں کھیل رہی ہوں۔''

''البیلا'' میں ہی ''بھولی صورت دل کے کھوٹے، نام بڑے اور درشن چھوٹے'' گیت کے بعد پارٹی میں پیارے کو کئی لڑکیاں گھیر لیتی ہیں۔ ایک لڑکی سے وہ گھل مل کر باتیں کرنے لگتا ہے۔ آشا ایک دل ٹوٹی ہوئی عورت کی جذبات نگاری کرتے ہوئے باہر جا کر کار میں بیٹھ کر رونے لگتی ہے۔ پیارے پوچھتا ہے۔ ''کیوں رو رہی ہو؟'' آشا

روتے روتے ہی پوچھتی ہے۔ ''پارٹی میں اس لڑکی سے کیا باتیں ہو رہی تھیں؟'' اور پیارے پھر بھولا سا جواب دیتا ہے۔ ''اس لڑکی کی آنکھیں کچھ کہہ رہی تھیں۔'' اس کے بعد آشا کی وہ غصیلی آنکھیں اور اس غصے میں اس کا جواب تھا۔ ''پہلی ملاقات میں ہی تم جان گئے کہ اس لڑکی کی آنکھیں کچھ کہہ رہی ہیں، اور مہینوں سے میری آنکھیں جو کہانی تمہیں بتانے کی کوشش کر رہی ہیں وہ تمہاری سمجھ میں نہیں آئی؟'' آشا کا اس طرح اپنی محبت کا اظہار اور اس وقت کی عورت کی شرم وحیا، اتنے برسوں بعد بھی گیتا بالی کی آنکھوں کی وہ زبان بھلائے سے نہیں بھولی جاتی۔

''البیلا'' کی ہیروئن کا رول قبول نہ کرنے کی صلاح گیتا بالی کو اس کے کئی خیرخواہوں نے دی تھی۔ اس کی وجہ تھی بھگوان کا اِسٹنٹ فلموں کا ایک معمولی سا اداکار ہونا۔ مگر یہ ہمت بھی گیتا بالی نے کر دکھائی تھی۔

ویسے گیتا بالی بڑے اداکاروں کی ہیروئن بہت کم ہی رہی۔ راجکپور کے ساتھ وہ صرف ''باورے نین'' میں ہیروئن تھی۔ ''بازی'' کے بعد دیو آنند کے ساتھ گیتا بالی کی جوڑی بن گئی تھی۔ مگر دوسری طرف وہ ایسے اداکاروں کے ساتھ کام کر رہی تھی جن کے بارے میں سوچنا بھی عجیب لگتا تھا۔ ماسٹر بھگوان، البیلا جھمیلا، آغا (چھورا چھوری)، آئی۔ ایس۔ جوہر (مسٹر انڈیا) جیسے مزاحیہ اداکار بھی تھے اور امرناتھ (جوہری) جگدیو (گناہ)، بلراج (وچن)، یو گیتا بالی کے والد جسونت (سہاگن، زندگی) جیسے گمنام اداکاروں کی بھی وہ ہیروئن بنتی رہی، لیکن اس سب کے باوجود وہ کبھی معمولی اداکارہ نہیں مانی گئی۔ گیتا بالی کو کسی کے سہارے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

گیتا بالی کی شخصیت کچھ کچھ مردانہ سی تھی۔ ''اجی بس شکریہ، البیلی، چھورا چھوری'' جیسی فلموں کی مزاحیہ ہیروئن کے کردار اس کی شخصیت پر بہت جچتے تھے۔ ''اجی بس شکریہ'' کی فلموں کی دیوانی دوشیزہ اور ''وچن'' کی وہ بہن جو بھائی کی تعلیم کے لئے ہر مصیبت اُٹھانے کو تیار ہے اور ایک حادثے میں بھائی کی موت کے بعد خاندان کی ذمہ داری سنبھالنے والی ہیروئن ایک ہی گیتا بالی کے دو متضاد کردار تھے۔

گیتا بالی کو اُس وقت موت نے لبیک کہا جب اس کی زندگی اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ عروج پر تھی۔ اس پر چیچک کا مہلک حملہ ہوا تھا اور اُس نے سب کے سمجھانے کے باوجود چیچک کا ٹیکہ لگوانے سے انکار کر دیا تھا۔ گیتا بالی، جو ایک اچھی بیٹی، بہن، بیوی، ماں اور دوست تھی، وہ سب کا کہنا مانتی تھی، لیکن اس معاملے میں وہ کیوں اپنی ضد پر قائم رہی، شاید اس لئے کہ اس کے باپ کو بھی چیچک ہو گئی تھی جس سے ان کی آنکھیں ہمیشہ کے لئے بجھ گئی تھیں۔ ہو سکتا ہے گیتا بالی اپنی ضد پر قائم رہنے کی بھول نہ کرتی تو وہ اپنے بچوں، مکی اور کاجل، اپنے شوہر شمی کپور، اپنے بھائی بہنوں، اپنے خیر خواہوں اور دوستوں کے درمیان ہوتی، لیکن اگر اس کا چہرہ اس بیماری کی بعد بگڑ جاتا یا آنکھیں چلی جاتیں، تو کیا ہوتا؟ گیتا، جو زندگی بھر اپنی ہی شرطوں پر چلنے کی عادی تھی، کس طرح زندگی کے ساتھ اتنا بھیانک سمجھوتہ کر لیتی۔

بان گنگا کا شمشان جہاں گیتا کو نذر آتش کیا گیا، موت سے دس برس پہلے ہی اس نے اس شمشان کے ساتھ بنے ہوئے مندر میں اپنا ہاتھ اپنے محبوب کے ہاتھ میں زندگی بھر کے لئے دیا تھا اور مرتے دم تک پیار نبھانے کی قسم کھائی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھیں ہی اس قسم کو دوہرا رہی تھیں۔ اس نے ٹوٹ کر شمی کپور کو چاہا تھا، پیار کیا تھا۔ وہ ایک ہی وقت میں بیوی تھی، دوست تھی، ماں تھی اور ایک مخصوص فاصلہ برقرار رکھتے ہوئے اپنے شوہر کے کھلنڈرے پن کو دیکھا کرتی تھی۔ شمی کے پیار میں بھی والہانہ پن تھا۔ جتنے دن گیتا بالی بیمار رہی، شمی کپور نے اپنی سدھ بدھ بھول کر اس کی تیمارداری کی۔ اس کی بیماری کے دوران شمی کپور نے دل کی گہرائیوں سے اس کے لئے دعائیں مانگیں جو قسمت کی چوکھٹ پر جا کر بے اثر ہو گئیں...... اور اس طرح وہ دونوں بولتی آنکھیں ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گئیں۔ صرف ان آنکھوں کی زبان سے کہے گئے الفاظ کی بازگشت ہی سیلولائڈ پر باقی رہ گئی ہے۔

گیتا بالی نے اپنی موت سے پہلے راجندر سنگھ بیدی کا مشہور ناول ''ایک چادر میلی سی'' پر فلم بنانے کا اعلان کیا تھا اور اس کہانی کو ''رانو'' کے نام سے شروع کر کے

اس کا کافی حصہ فلمایا تھا۔ مگر شاید قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ گیتا بالی کا یہ خواب شرمندۂ تعبیر ہو۔ اس کہانی کے مرکزی کردار ''رانو'' کو گیتا بالی نے اپنے اس قدر قریب محسوس کیا تھا کہ وہ خود کو ہر وقت رانو ہی تصور کرتی رہی تھی اور پوری طرح اس کردار میں اپنے آپ کو ملوث کر لیا تھا۔ بدقسمتی کہ ''رانو'' مکمل ہونے سے پہلے ہی رانو مر گئی اور اس طرح ایک جیتی جاگتی رانو کا ایک ناول کے کردار رانو کو جیتی جاگتی حیثیت میں لوگوں کے سامنے پیش کرنے کا خواب، خواب ہی رہ گیا۔ بعد میں اِس کہانی کو ''ایک چادر میلی سی'' کے ہی نام سے بنایا اور اس میں رانو کا کردار ہیما مالنی نے ادا کیا۔

OO

رحمٰن

ہندوستانی فلموں میں جہاں ہیرو کا بہت اعلیٰ قسم کا کردار ہوتا ہے اور وہ تمام برائیوں سے پاک وصاف ہوتا ہے، وہیں ایک کردار ہوتا ہے بُرے آدمی کا کردار، جس میں وہ تمام برائیاں ہوتی ہیں جن کے سہارے وہ فلم کے آخر تک ہیرو پر طرح طرح کی آفتیں توڑتا رہتا ہے اور فلم کے اختتام میں وہ اپنے انجام کو پہنچتا ہے۔ اس کے علاوہ کچھ کہانیوں میں ایک کردار ایسا بھی ہوتا ہے جو بُرا تو نہیں ہوتا، مگر انجانے میں ہی کچھ غلط حرکتیں کر بیٹھتا ہے، یا ویلن جیسا دکھائی دیتا ہے مگر غلط فہمیاں دور ہوتے ہی وہ ہیرو اور ہیروئین کے لئے ایک بے مثال قربانی پیش کرتا ہے اور دونوں کے راستے سے ہٹ جاتا ہے۔ اس طرح فلم کے اختتام تک وہ ہیرو کے مقابلے میں کہیں زیادہ داد وصول کر لیتا ہے اور خود ہیرو بن جاتا ہے۔

اپنے زمانے کے مشہور اداکار اور لمبے عرصے تک کریکٹر آرٹسٹ کے طور پر فلموں سے وابستہ رہے رحمٰن نے بھی کئی فلموں میں اسی طرح کے کردار ادا کئے۔ یہی وجہ ہے کہ ان فلموں میں ہیرو کے مقابلہ میں وہ زیادہ پسند کئے گئے۔ رحمٰن نے سب سے پہلے پیارے لعل سنتوشی کی فلم ''ہم ایک ہیں'' میں کام کیا۔ یہ فلم ایسی تھی کہ اس فلم میں کئی نئے چہروں کو چانس دیا گیا تھا۔ ان میں رحمٰن کے علاوہ دیوآنند اور گرودت کے نام قابل ذکر ہیں۔ یہ تینوں ہی نام ایسے ہیں کہ جنہوں نے آگے چل کر بہت نام کمایا۔ گرودت نے اپنی قابلیت اور فنکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے ہندوستانی فلم انڈسٹری میں اپنا ایک یادگار مقام چھوڑا ہے۔ دیوآنند نے ہیرو کے طور پر کامیابی کی

انتہائی منزلوں کو چھونے کے ساتھ ساتھ فلم میکنگ میں بھی کئی اچھی فلموں کی تخلیق کی ہے ...... اور رحمٰن...... انہوں نے تو "ہم ایک ہیں" سے ہی عوام کی پسندیدگی اور مقبولیت حاصل کر لی تھی اور آخر تک وہ فلم بینوں کے پسندیدہ اداکار کی حیثیت سے اپنی روایت کو برقرار رکھے رہے۔

رحمٰن ایرانی الانسل تھے اور وہاں کے شاہی خاندان سے ان کا تعلق تھا۔ جب وہ بمبئی فلم نگری میں آئے اور پہلی فلم میں کام شروع کیا اس وقت ان کی عمر ۳۰ر سال تھی اور یہ بات ان کے انتقال سے لگ بھگ ۳۶ر سال پہلے کی ہے۔ اس طرح ۱۹۴۸ء میں بنی اس فلم کے بعد سے آخری دم تک پورے ۳۶ر سال رحمٰن اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کے بل بوتے پر ہندوستانی عوام کے دلوں پر راج کرتے رہے۔ ان کی آواز میں بھی جادو تھا اور کہیں بھی سُن کر یہ بات آسانی سے کہی جا سکتی ہے کہ وہ رحمٰن کی آواز ہے۔ اسی طرح ان کے مکالمے ادا کرنے کا بھی اپنا ہی ایک الگ انداز تھا، جو اُن کا اپنا تھا۔

فلم "ہم ایک ہیں" کے بعد جب بابوراؤ پئی پربھات فلم کمپنی سے علیحدہ ہوئے تو انہوں نے رحمٰن کو اپنی فلموں میں کئی چانس دیے۔ اس کے ساتھ ہی گرودت نے اپنی ہر فلم میں رحمٰن کو ضرور چانس دیا۔ گرودت کی فلم "پیاسہ" کے اُس پبلشر کو لوگ بھلا نہیں سکتے جو گرودت کی محبوبہ (مالا سنہا) کا شوہر بھی ہے اور گرودت کی کتاب کا پبلشر بھی۔ ایک طرف وہ حسد کی آگ میں جلتا ہے کیوں کہ اس کی بیوی مالا سنہا اپنے محبوب شاعر کو بھلا نہیں پائی ہے اور دوسری طرف وہ اس شاعر کی کتاب سے کروڑ پتی بننے کے خواب بھی دیکھ رہا ہے اور اس کام کے لئے گرودت کی جان تک کے پیچھے پڑ جاتا ہے۔ اداکار رحمٰن نے اس مشکل کردار کو اس خوبی سے نبھایا ہے کہ گرودت کے بعد اگر کسی کا نام باقی رہتا ہے تو وہ صرف رحمٰن کا ہی ہو سکتا ہے۔

اسی طرح گرودت کے ساتھ رحمٰن کی یادگار فلم "چودھویں کا چاند" ہے جس میں رحمٰن نے اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے ایک منفی کردار کو اس حُسن و خوبی سے پیش کیا کہ لوگ ہیرو کے ساتھ ساتھ رحمٰن کو بھی یاد رکھ پاتے ہیں۔ فلم "پالکی" میں بھی رحمٰن نے

نواب صاحب کے کردار کو اس خوبی سے ادا کیا ہے کہ فلم بینوں کی ساری ہمدردیاں اپنے دامن میں بھر لی ہیں۔ فلم ''صاحب بیوی اور غلام'' میں بھی رحمٰن نے ایک یادگار کردار ادا کیا ہے۔ فلم ''وقت'' کے کردار چنائے سیٹھ کو لوگ ابھی تک بھولے نہیں ہیں......! اس طرح رحمٰن نے ہندوستانی فلموں کو کئی اچھے اور یادگار کردار دیے ہیں۔ ان کی مشہور فلموں میں ''یہ راستے ہیں پیار کے، درپن، دل دیا درد لیا، شکار'' اور ''ابھیلاشا'' وغیرہ بھی شامل ہیں۔

رحمٰن کی آخری دنوں کی چند فلموں میں ''چاچا بھتیجا، آہستہ آہستہ'' اور ''دل آخر دل ہے'' میں بھی ان کے کام کو کافی سراہا گیا ہے۔ فلم ''آہستہ آہستہ'' کی تکمیل کے دوران ہی ان کی صحت خراب رہنے لگی تھی۔ اس فلم میں رحمٰن نے ایک ایسے پروفیسر کا کردار ادا کیا ہے جس نے ایک ایسی لڑکی (پدمنی کولہاپوری) کو گود لیا ہوا ہے جو ایک طوائف کی لڑکی ہے...... یہی فلم اُن کی تقریباً آخری فلم ہے۔

آخری دنوں میں رحمٰن کو کینسر جیسے موذی مرض نے گھیر لیا تھا جس کی وجہ سے وہ اپنی زیر تکمیل فلموں کے لئے بھی وقت نہیں دے پا رہے تھے۔

OO
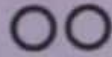
منّا ڈے

مغربی بنگال کے مرکزی شہر کلکتہ کے ایک مہذب خاندان کے پورن چندر جی کے یہاں یکم مئی ۱۹۱۹ء کو گلوکار وموسیقار منا ڈے کا جنم ہوا۔ ان کی والدہ کا نام مہامایا ڈے تھا اور منا ڈے کا گھر کا نام پربودھ چندر ڈے تھا۔ منا ڈے کے ذہن پر بچپن سے ہی اپنے چچا سنگیت آچاریہ کے۔سی۔ڈے کا زبردست اثر تھا۔ منا ڈے نے ابتدائی تعلیم قریب کے ہی ایک چھوٹے سے اسکول اندو بابور پاٹھ شالہ میں حاصل کی۔ بعد ازآں انہوں نے اسکوٹش چرچ کالج میں داخلہ لے لیا اور پھر وِدیا ساگر کالج سے گریجویشن کیا۔ اپنے طالب علمی کے زمانے سے ہی منا ڈے کو باکسنگ اور کشتی میں بڑی دلچسپی تھی۔

کولکاتہ کے وِدیا ساگر کالج سے گریجویٹ ہونے کے بعد پربودھ چندر ڈے ایک دوراہے پر کھڑے تھے۔ گھر والوں کی خواہش تھی کہ ان کا بیٹا قانون کی تعلیم حاصل کرے جبکہ خود منا ڈے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنا چاہتے تھے۔ آخر ان کے والد پورن چندر ڈے کو بیٹے کی خواہش کے سامنے نرم ہونا پڑا اور شدید ناراضگی کے ساتھ انہوں نے منا ڈے کو موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کی اجازت دے دی اور ان کے چچا کے۔سی۔ڈے کی شاگردی میں ان کی تعلیم شروع ہو گئی۔ پہلے ہی دن ان کے ہاتھوں میں تان پورہ پکڑا دیا گیا اور آواز کا ریاض بھی شروع ہو گیا۔

کے۔سی۔ڈے یعنی کرشنا چندر ڈے نیو تھیئٹر کے اسٹار گلوکار، موسیقار فنکار تھے۔ پربودھ چندر کو ''منّا'' نام انہوں نے ہی دیا تھا۔ باٹھلا اور رویندر کی شکلوں میں

سنگیت کولکاتہ کے لوگوں کی نسوں میں بہتا تھا۔ کے۔سی ڈے راگوں میں نغمگی لانے کے لیے مشہور تھے، یہی چیز بعد میں مناڈے کو وراثت میں ملی۔ ''تیری گٹھری میں لاگا چور مسافر......'' اور ''بابا من کی آنکھیں کھول......'' کے۔سی۔ڈے کے دل کی آواز تھی۔ جب مناڈے ''لاگا چنری میں داغ چھپاؤں کیسے، گھر جاؤں کیسے......'' اور ''ندیا چلے، چلے رے دھارا......'' گاتے ہیں تو اس میں ایسے ڈوب جاتے ہیں جیسے وہ کوئی گیت نہیں گا رہے ہوں بلکہ کسی کی عقیدت میں بھجن گا رہے ہوں۔

نیو تھیٹر ٹوٹنے کے بعد ۱۹۴۰ء میں کے۔سی ڈے نے بمبئی کا رُخ کیا۔ مناڈے بھی ان کے ساتھ بمبئی آ گئے، جہاں مناڈے موسیقار ایچ۔ پی۔ داس کے معاون بن گئے۔ ۱۹۴۳ء میں انہیں پہلا بریک فلم ''رام راجیہ'' میں ملا۔ پرکاش پکچرس کے وجے بھٹ نے اس فلم کے لیے کے۔سی۔ ڈے سے گانے کی فرمائش کی، لیکن انہوں نے پلے بیک دینے سے منع کر دیا اور ساتھ ہی مناڈے کی سفارش کی۔ موسیقار شنکر راؤ کو مناڈے پر یقین نہیں تھا، مگر چند آڈیشن ٹیسٹ کے بعد مناڈے کی صلاحیتوں کا اعتراف کر لیا گیا۔

مناڈے جب اسکوٹش چرچ کالج میں زیر تعلیم تھے، تب سے ہی ان کو گانے کا شوق ہو گیا تھا اور وہ اپنے چچا سے باقاعدہ گانا سیکھنے کی مشق بھی کیا کرتے تھے۔ کے۔ سی۔ ڈے (کرشنا چندر ڈے) اور استاد دبیر خان سے گانے اور موسیقی کی تعلیم حاصل کرنے کے دوران ہی مناڈے نے اپنے کالج کی طرف سے تین سال تک تین مختلف کالجوں کے گلوکاری کے مقابلوں میں حصہ لیا اور انعامات سے نوازے گئے۔

۱۹۴۲ء میں مناڈے اپنے چچا کے۔سی۔ ڈے کے ساتھ جب بمبئی آئے تھے تو پہلے پہل ان ہی کے اسسٹنٹ کے طور پر اپنی عملی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد وہ موسیقار سچن دیو برمن کے اسسٹنٹ ہو گئے۔ برمن دا بھی بنگال سے ہی تعلق رکھتے تھے اور ان کی اپنی الگ ہی شناخت بھی قائم ہو چکی تھی۔ اُن کے علاوہ بھی مناڈے نے کئی موسیقاروں کے معاون کے طور پر کام کیا۔ موسیقار کے طور پر آزادانہ کام شروع کرنے کے بعد انہوں نے کئی ہندی فلموں کی موسیقی ترتیب دی اور اسی کے

ساتھ وہ کلاسیکل ہندوستانی موسیقی کی تعلیم استاد امان علی خاں، اور استاد عبدالرحمٰن خان سے حاصل کرتے رہے۔

۱۹۴۳ء میں مناڈے نے سب سے پہلے فلم ''تمنا'' سے فلمی پلے بیک گانے کا باقاعدہ کام شروع کیا۔ اس فلم میں کے۔ سی۔ ڈے کی موسیقی تھی اور پہلا گانا مناڈے نے ثریا کے ساتھ گایا تھا۔ یہ گانا کافی مقبول ہوا تھا۔ اس کے بعد سچن دیو برمن کی موسیقی میں فلم ''مشعل'' کے لیے ایک نغمہ ''اوپر گگن وشال'' مناڈے نے سولو گایا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی فلم ''مشعل'' میں جب مناڈے نے اپنی آواز کا جادو جگایا تو یہ فلم بعد میں بنگالی اور مراٹھی میں بھی بنائی گئی اور مناڈے نے ہی گانے ریکارڈ کرائے۔ ۱۹۵۲ء میں فلم ''امر بھوپالی'' کے گانوں سے ایک باصلاحیت گلوکار کے طور پر مناڈے کی پہچان بنی۔

مناڈے نے بھیم سین جوشی کے ساتھ بھی ایک دوگانا ''کیتکی گلاب جوہی'' ریکارڈ کرایا۔ کشور کمار کے ساتھ مناڈے نے کئی مقبول گانے گائے۔ خاص طور پر فلم ''پڑوسن'' کا گانا ''ایک چتر نار کر کے سنگھار......'' اور فلم ''شعلے'' کا گانا ''یہ دوستی ہم نہیں توڑیں گے......'' کشور کمار کے ساتھ گائے ہوئے گانوں میں سب سے زیادہ مقبول ہوئے۔ مناڈے نے بنگالی فلموں کے لیے ہیمنت کمار کے ساتھ بھی کئی گانے ریکارڈ کرائے اور دوسرے بنگالی موسیقاروں کے ساتھ بھی انہوں نے بنگالی فلموں کے لیے اپنی آواز کا استعمال کیا۔ ایک بنگالی فلم ''سندھیا بیلا'' کے لیے مناڈے نے لتا منگیشکر کے ساتھ دوگانا ''کے پرتھوم کاچے ایسے چی'' ریکارڈ کرایا جو کافی مقبول ہوا۔ مناڈے کی آواز میں اور ان کی موسیقی میں رابندرا سنگیت کی جھلک نمایاں طور پر دیکھی جا سکتی ہے۔ انہوں نے ہندوستانی کلاسیکی گائیکی کا استعمال ہندی فلموں کے نغموں میں بہترین انداز میں کیا ہے۔ مناڈے نے اپنی عمر کے آخری پڑاؤ تک آتے آتے تقریباً چار ہزار سے زائد فلمی نغمے ریکارڈ کرائے ہیں۔

۸/ دسمبر ۱۹۵۳ء کو ان کی شادی کیرل کے متوسط خاندان کی لڑکی سلوچنا

کمارن سے ہو گئی۔ ۱۹؍اکتوبر ۱۹۵۴ء کو ان دونوں کے یہاں ایک لڑکی کا جنم ہوا، جس کا نام انہوں نے شورو ما رکھا اور پھر ۲۰؍جون ۱۹۵۸ء کو دوسری لڑکی کی پیدائش ہوئی تو اس کا نام سمجا رکھا گیا۔

مناڈے کو صبح جلدی اُٹھنے کی عادت بچپن سے ہی تھی جو آخر تک قائم رہی۔ صبح صادق میں اُٹھنے کے بعد وہ ٹہلنے کے لیے چلے جاتے تھے اور پھر واپس آکر چائے پیتے تھے اور پھر دو تین گھنٹے ریاض میں لگ جاتے تھے۔ وہ سبزی خور تھے مگر اچھے بنے ہوئے کھانے کے شوقین تھے۔ اسی طرح لباس کے معاملے میں بھی ان کو بنگالی لباس زیادہ پسند تھا اور سر پر ٹوپی پہننا وہ خاص طور پر پسند کرتے تھے۔ اس کے علاوہ کلکتہ شہر انہیں بہت پسند تھا۔ وہاں کی طرز زندگی اور وہاں کے تیوہار ان میں ایک نیا جوش بھر دیتے تھے۔

مناڈے تقریباً پچاس سال بمبئی کی فلمی دنیا میں بڑی عزت واحترام کی زندگی گزارنے کے بعد کافی عرصہ سے بنگلور میں مستقل سکونت اختیار کیے ہوئے تھے۔ حالانکہ انہوں نے رابطے کے لیے کلکتہ کا پتہ بھی دے رکھا تھا۔ مناڈے کافی عرصے تک بڑے پیمانے پر دنیا بھر میں موسیقی کے پروگرام کرنے جاتے رہے اور اِس طرح وہ نہ صرف ہندوستانی موسیقی کو دُنیا بھر میں پھیلا رہے تھے بلکہ ہندوستان کا نام بھی روشن کر رہے تھے۔

مناڈے نے اپنی مادری زبان بنگالی میں اپنی سوانح بھی تحریر کی ہے جو ''جبونر جلسا گھورے'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہو چکی ہے۔ یہ کتاب انگریزی میں ''میموریز کم الائیو'' (Mamories come alive) کے نام سے اور ہندی میں ''یادیں جی اُٹھیں'' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔ مراٹھی میں شائع اس کتاب کا عنوان ''جبونر جلسا گھورے'' ہی ہے۔ اسی نام سے مناڈے کی زندگی پر ایک دستاویزی فلم ۲۰۰۸ء میں نمائش کے لیے پیش کی جا چکی ہے۔

۱۹۴۲ء میں اپنی فلمی زندگی کا آغاز کرنے والے مناڈے نے ۱۹۴۳ء میں

شہنشاہ جذبات دلیپ کمار کی پہلی فلم ''جوار بھاٹا'' کے لیے بھی گانے ریکارڈ کرائے تھے۔ اس کے علاوہ ان کے گانوں سے سجی مقبول فلموں میں ''مہاکوی کالی داس (۱۹۴۴ء)، گیت گووند (۱۹۴۷ء)، آوارہ (۱۹۵۱ء)، دو بیگھہ زمین (۱۹۵۳ء)، پرنیتا (۱۹۵۳ء)، بوٹ پالش (۱۹۵۴ء)، شری چار سو بیس (۱۹۵۵ء)، کابلی والا (۱۹۶۱ء)، وقت (۱۹۶۵ء)، تیسری قسم (۱۹۶۶ء)، اُپکار (۱۹۶۷ء)، پالکی، پڑوسن، میرے حضور، نیل کمل (۱۹۶۷ء)، ایک پھول دو مالی (۱۹۶۹ء)، میرا نام جوکر، آنند (۱۹۷۰ء)، ریشما اور شیرا (۱۹۷۱ء)، باورچی (۱۹۷۲ء)، ہندوستان کی قسم، ستیم شیوم سندرم (۱۹۷۸ء)، عبداللہ، کرانتی (۱۹۸۰ء)، لاوارث (۱۹۸۱ء)، پرہار (۱۹۹۰ء) وغیرہ شامل ہیں۔

منا ڈے کے گائے ہوئے سب سے مقبول نغموں میں چند نغمے، جن سے ان کی پہچان بنی ہوئی ہے، درج ذیل ہیں۔

''اے میری زہرہ جبیں......'' (فلم: وقت)، ''اے میرے پیارے وطن......'' (فلم: کابلی والا)، ''سُر نہ سجے......'' (فلم: بسنت بہار)، ''اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو......'' (فلم: میرا نام جوکر)، ''جوڑی ہماری جمے گا کیسے جانی......'' (فلم: اولاد)، ''قسمیں وعدے پیار وفا سب......'' (فلم: اُپکار)، ''نہ تو کارواں کی تلاش ہے......'' (فلم: برسات کی رات)، ''اوپر گگن وشال......'' (فلم: مشعل)، ''پردہ اُٹھے سلام ہو جائے......'' (فلم: دل ہی تو ہے)، ''تو پیار کا ساگر ہے......'' (فلم: سیما)، ''جھنک جھنک توری باجے پایلیا......'' (فلم: میرے حضور) وغیرہ وغیرہ۔

یہ بھی حقیقت ہے کہ فلمی دنیا میں منا ڈے کو وہ مقام حاصل نہ ہو سکا جس کے وہ حقدار تھے اور جو دوسرے گلوکاروں کو کسی نہ کسی وجہ سے حاصل ہو گیا۔ ان کو بہت کم اہمیت دی گئی جبکہ انہوں نے ایسے مشکل گیت بھی بڑی عمدگی اور فنکارانہ چابکدستی سے ریکارڈ کرائے ہیں جو دوسرے فنکار ادا کرنے سے قاصر رہے، لیکن بعض موسیقاروں کے ذریعہ کئی دہائیوں تک تقریباً فراموش کر دیے گئے گلوکار منا ڈے نے

کبھی کوئی شکوہ نہیں کیا۔ وہ ایسے لوگوں کو ہمیشہ یاد رکھتے تھے جنہوں نے انہیں یاد رکھا اور ان لوگوں کا نام بھی عزت واحترام سے لیتے تھے جنہوں نے وقت بدلنے کے ساتھ نگاہیں پھیر لیں۔

مناڈے اپنے زمانے کے گلوکاروں میں سب سے زیادہ باصلاحیت گلوکار تھے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس دَور کے تین بڑے ہیرو کی تکڑی دلیپ کمار، دیو آنند اور راج کپور میں سے صرف راج کپور نے ہی اپنے لیے ان کی آواز کا استعمال زیادہ کیا، وہ بھی صرف اس لیے کہ اُن دِنوں مکیش فلموں میں ہیرو بننے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے، تب شنکر جے کشن نے مناڈے کی آواز میں راج کپور کے لیے گیت ریکارڈ کیے۔ گیت سُپر ہٹ ہوئے۔ ان میں فلم ''چوری چوری'' کے یہ گیت ''یہ رات بھیگی بھیگی......'' اور ''آجا صنم، مدھر چاندنی میں ہم......'' اور فلم ''شری چار سو بیس'' کا مشہور گانا ''پیار ہوا اقرار ہوا ہے......'' آج بھی اتنے ہی مقبول ہیں جتنے کل تھے۔ فلم ''میرا نام جوکر'' کا ایک نغمہ ''اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو......'' بھی زبردست ہٹ ہوا تھا۔ یہ اُس فلم کا تھیم سانگ تھا، جس کو سن ہر کوئی یہ کہتا تھا کہ مناڈے کے علاوہ کوئی اور اس گیت کو نہیں گا سکتا۔ شنکر جے کشن کے علاوہ کسی دوسرے نے یہ ہمت نہیں کی کہ وہ ہیرو کے لیے ان کی آواز کا استعمال کرے۔

مناڈے کو اپنی فلمی موسیقی کی خدمات کے اعتراف میں کئی ایوارڈز سے نوازا گیا ہے۔ ۱۹۶۹ء میں فلم ''میرے حضور'' کے نغمے ''جھنک جھنک توری باجے پایلیا......'' کے لیے بہترین مرد گلوکار کا نیشنل فلم ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۰ء میں فلم ''میرا نام جوکر'' کے گیت ''اے بھائی ذرا دیکھ کے چلو'' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں بنگالی فلم ''نشی پدما'' کے گانوں کے لیے نیشنل فلم ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۷۱ء میں ہی حکومت ہند کی طرف سے مناڈے کو ''پدم شری'' سے نوازا گیا۔ ۱۹۸۵ء میں حکومت مدھیہ پردیش نے لتا منگیشکر ایوارڈ سے نوازا۔ ۲۰۰۳ء میں حکومت مغربی بنگال کی طرف سے اُستاد علاء الدین خان ایوارڈ سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۴ء میں رابندر بھارتی یونیورسٹی سے،

۲۰۰۵ء میں بردوان یونیورسٹی سے اور ۲۰۰۸ء میں جادھو پور یونیورسٹی سے مناڈے کو ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگری سے نوازا گیا۔ ۲۰۰۵ء میں حکومت مہاراشٹر نے لائف ٹائم اچیومنٹ ایوارڈ سے نوازا اور حکومت ہند نے پدم وبھوشن سے سرفراز کیا۔

مناڈے کو ۲۰۰۹ء میں حکومت ہند کی طرف سے فلمی دُنیا کا سب سے بڑا اعزاز ۲۰۰۷ء کا دادا صاحب پھالکے ایوارڈ دیا گیا، جو اُن کی زندگی بھر کی فلمی خدمات کا سب سے بڑا اعتراف بھی ہے۔

مناڈے کو ستمبر ۲۰۱۳ء میں ڈائلاسس پر رکھا گیا تھا۔ ان کو کچھ عرصے سے سانس کا عارضہ بھی تھا اور ان کے گردوں نے بھی کام کرنا بند کر دیا تھا۔ بنگلور کے مقامی اسپتال نارائن ہیلتھ سینٹر کے آئی۔سی۔یو۔ میں ۲۴ر اکتوبر کی نصف شب میں تین بج کر پانچ منٹ پر انہوں نے آخری سانس لی اور اس دنیائے فانی سے نجات حاصل کر لی۔ انہوں نے تقریباً ۹۴ر برس کی عمر پائی۔ مناڈے نے ۲۰۰۶ء میں فلم ''عمر'' کے لیے آخری بار اپنی آواز میں گیت ریکارڈ کرایا تھا۔ مناڈے کی اہلیہ سلوچنا کا گزشتہ برس بنگلور میں ہی انتقال ہوا تھا۔

○○

جگجیت سنگھ

ہندوستانی موسیقی کا جادو پوری دنیا پر برسوں سے چلتا آیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غیر منقسم ہندوستان میں بھی یہاں کی موسیقی کو غیر ممالک میں مقبولیت حاصل رہی ہے۔ بادشاہوں کے زمانے میں بھی موسیقی کے مقابلے اور پروگرام ہوا کرتے تھے اور چھوٹے موٹے راجے رجواڑے اور نوابین بھی موسیقی، رقص اور شاعری کے دلدادہ ہوا کرتے تھے۔ شہنشاہ اکبر اعظم نے تو اپنے نورتنوں میں ایک رتن کے لیے فن موسیقی کے استاد تان سین کا انتخاب کیا تھا۔ حد تو یہ ہے کہ ہماری ہندوستانی فلموں کی کامیابی کی ایک بڑی گارنٹی فلم کی موسیقی اور اس کے نغمے ہوا کرتے تھے۔ ایک زمانے میں جب نوشاد علی کی موسیقی سے بجی فلم ''رتن'' نمائش کے لیے پیش ہوئی تو اس کے نغموں کی مقبولیت کی وجہ سے فلم کی آمدنی بوریوں میں بھر کر فلمساز کے پاس جایا کرتی تھی۔ ہندوستانی موسیقی کو عالمی مقبولیت حاصل کرانے میں اس کا سب سے بڑا ساتھ دیا قوالی اور غزل گائیکی نے...... اور غزل گائیکی میں جو چند نام گزشتہ چند دہائیوں میں سب سے زیادہ مقبول رہے ان میں بیگم اختر، استاد مہدی حسن اور غلام علی کے بعد جگجیت سنگھ کا نام لیا جا سکتا ہے۔

جگجیت سنگھ ۸ر فروری ۱۹۴۱ء کو صوبہ راجستھان کے سری گنگانگر میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد شری امر سنگھ دھیمن سرکاری ملازم تھے جو پڑوس کے صوبہ پنجاب کے دلہ گاؤں کے رہنے والے تھے۔ جگجیت سنگھ کی والدہ بچن کور کا تعلق اوٹالن گاؤں سے تھا۔ ان کے دو بھائی اور چار بہنیں تھیں اور یہ سب سکھ مذہب کو مانتے تھے۔

جگجیت سنگھ نے ابتدائی تعلیم سری گنگانگر کے خالصہ ہائی اسکول میں حاصل کی اور گورنمنٹ کالج، سری گنگانگر سے انٹرمیڈیٹ کرنے کے بعد جالندھر کے ڈی۔اے۔وی۔ کالج سے گریجویشن کیا۔ انہوں نے تاریخ کے مضمون سے ہریانہ کی کروکشیتر یونیورسٹی سے پوسٹ گریجویشن کیا۔ ان کے دادا ان کو آئی۔ اے۔ ایس۔ افسر بنانا چاہتے تھے، مگر خدا نے ان کو موسیقی کی دنیا میں نام پیدا کرنے کے لیے چن لیا تھا اور اس کے لیے ان کو بہترین سریلی آواز عطا کی تھی۔

ایک بار وہ اپنی بہن کے پاس چرو ضلع کے ساہوا گاؤں گئے ہوئے تھے۔ وہاں ایک سادھو نے ان کی آواز سن کر اُن کے بہنوئی رتن سنگھ سے کہا تھا کہ اگر ان کا نام جگ پریت سنگھ کی بجائے جگجیت سنگھ کر دیا جائے تو یہ گائیکی میں عالمی شہرت حاصل کرے گا۔

جگجیت سنگھ نے بچپن میں ہی پنڈت چھگن لعل شرما سے موسیقی کی تعلیم حاصل کرنی شروع کر دی تھی، جو گنگانگر میں بخشی ٹائپ کالج کے پہلے منزلے پر موسیقی کا ایک اسکول چلاتے تھے۔ وہاں دو برس تک انہوں نے خیال، ٹھمری اور دھروپد جیسے ہندوستانی موسیقی کے ابتدائی سبق سیکھے اور ریاض کیا۔ بعد میں سائینا گھرانے کے استاد جمال خان صاحب سے مزید تعلیم حاصل کی، جو استاد مہدی حسن خاں کے دُور کے رشتہ دار تھے اور ٹھاکر دت شرما کی پان کی دُکان پر تعلیم دیا کرتے تھے۔

۱۹۷۸ء میں کناڈا میں مقیم ایک پروگرام آرگنائزر اشوک سنگھ نے ایک سرکاری پروگرام کے لیے فیض احمد فیض کی شاعری کو ان کی موجودگی میں ہی پڑھنے کے لیے پاکستان کی مقبول غزل گلوکارہ منی بیگم کو دہلی مدعو کیا تھا۔ یہ پروگرام حالانکہ سرکاری تھا مگر وزارت خارجہ کے جوائنٹ سکریٹری ڈاکٹر اندو پرکاش سنگھ کے مکان واقع ذاکر حسین روڈ کے لان میں چل رہا تھا۔ فیض احمد فیضؔ نے اپنی کئی غزلیں سنائیں اور پھر منی بیگم نے فیضؔ کی کئی غزلیں ان کی موجودگی میں گائیں۔ درمیان میں انہوں نے ایک وقفہ لینا چاہا تو اشوک سنگھ نے بمبئی سے آئے اپنے ایک دوست جگجیت سنگھ کو فیضؔ

کی غزل پڑھنے کے لیے مائک پر مدعو کرلیا۔ سامعین کے لیے یہ ایک نیا نام تھا مگر جب جگجیت سنگھ نے غزل پڑھی تو ماحول بدل چکا تھا۔ اس خوبصورت نوجوان سے غزل سن کر لوگ اتنے متاثر ہوئے کہ فرمائشیں ہونے لگیں اور چار غزلوں کے بعد ہی منی بیگم کو دوبارہ مورچہ سنبھالنے کا موقع ملا، اور منی بیگم نے کہا کہ جگجیت سنگھ کی آواز میں فیضؔ صاحب کو سننا اچھا لگا۔

پروگرام کے آخر میں فیضؔ صاحب نے خود جگجیت سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے کہا کہ یہ نوجوان غزل گائیکی میں بہت بلندیوں تک جائے گا...... اور فیض صاحب کی یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

جگجیت سنگھ ۱۹۶۵ء میں ممبئی گئے اور اپنی سچی لگن، محنت، ریاض اور پُرخلوص رویے سے کامیابی کی طرف گامزن ہو گئے۔

۱۹۶۷ء میں جگجیت سنگھ نے چترا کے ساتھ مل کر گائیکی کی جوڑی بنائی اور جگجیت سنگھ چترا سنگھ کے نام سے گاتے رہے۔ دو سال کے اس تعلق کو انہوں نے دسمبر ۱۹۶۹ء میں شادی میں تبدیل کرلیا اور یہ ہندوستان کی پہلی کامیاب میاں بیوی والی مقبول ترین غزل گائیکی جوڑی بن گئی۔ ۲۸ر جولائی ۱۹۹۰ء کو جگجیت سنگھ کے اکلوتے جوان بیٹے وِویک کا ایک سڑک حادثے میں انتقال ہو گیا۔ اس کے بعد چترا سنگھ نے پبلک پروگرام میں حصہ لینا چھوڑ دیا مگر جگجیت سنگھ برابر پروگرام کرتے رہے۔ ان دونوں کی ایک ساتھ گائی ہوئی غزل البم ''سم ون سم وہیئر'' تھی۔

غزل گائیکی کے ساتھ ساتھ جگجیت سنگھ نے فلموں میں پلے بیک سنگنگ کے لیے بھی جدوجہد شروع کر دی اور ۱۹۶۶ء میں پہلی بار فلم ''زخم جو آپ کی عنایت ہے'' کے لیے ایک گیت گایا۔ اس کے بعد فلم ''بہروپی'' کے لیے بھی گلوکاری کی اور ۱۹۷۳ء میں فلم ''اوشکار'' کے لیے ''بابل مورا نیہر چھوٹو ہی جائے'' گایا۔

۱۹۷۹ء میں انہوں نے کفیل آذرؔ امروہوی کی ایک نظم ''بات نکلے گی تو پھر دور تلک جائے گی'' ریکارڈ کرائی جو بعد میں فلم ''گرہ پرویش'' میں شامل ہوئی۔ اس نظم سے

جگجیت سنگھ کو بے پناہ مقبولیت حاصل ہوئی اور ۱۹۸۰ء میں فلم ''ایک بار کہو'' کے لیے ''کوئی گیسو، کوئی آنچل ہمیں آواز نہ دو'' گایا مگر ان کو سب سے بڑی کامیابی ملی ۱۹۸۱ء میں فلم ''پریم گیت'' کے نغمہ ''ہونٹوں سے چھولو تم، میرا گیت امر کر دو......'' سے۔ اس فلم کی بیک گراؤنڈ موسیقی بھی جگجیت سنگھ نے ہی ترتیب دی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۸۲ء میں ''ستم، ساتھ ساتھ'' اور ''اَرتھ'' فلموں سے تو جگجیت سنگھ نے غزل اور موسیقی کے شیدائیوں کے دلوں پر راج کرنا شروع کر دیا۔ مہیش بھٹ کی ہدایت میں بنی فلم ''اَرتھ'' کے چھ نغموں میں کیفی اعظمی نے بہترین نغمہ نگاری کی تھی اور جگجیت سنگھ نے بہترین گلوکاری۔ یہ نغمے آج بھی دلچسپی سے سنے جاتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء میں جب گلزار کا ٹی۔ وی سیریل ''مرزا غالبؔ'' نشر ہوا تو ایک بار پھر جگجیت سنگھ کے نام کی دھوم مچ گئی۔ اس سیریل کے لیے مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ کی سب غزلیں جگجیت سنگھ کی آواز میں ریکارڈ کی گئی تھیں اور سب کی سب بہت مقبول ہوئیں۔ اس کے بعد ۱۹۹۱ء میں علی سردار جعفری کے سیریل ''کہکشاں'' کے لیے بھی انھوں نے موسیقی ترتیب دی اور گلوکاری بھی کی۔ اسی کے ساتھ ۱۹۹۱ء میں ہی لتا منگیشکر کے ساتھ اُن کی غزلوں کی البم ''سجدہ'' ریلیز ہوئی جو بے حد مقبول رہی۔ اس کے علاوہ ان کی مقبول ترین البمس میں'' A Sound Affair، Beyond Times، آئینہ، In Search، Face to Face، Ecstasies، Eternity، سوز، منتظر، جذبہ، آئینہ'' وغیرہ کافی مقبول رہیں اور عوام و خواص میں بے حد پسند کی گئیں۔

جگجیت سنگھ نے اردو، ہندی، پنجابی، گجراتی، سندھی اور نیپالی زبانوں میں بہت سے نغمے گائے، مگر ان کی خاص شناخت اُردو غزل گائیکی میں رہی۔ ان کے فلمی اور غیر فلمی البمس کی تعداد ستر سے زائد ہے۔ ان کی گائی ہوئی غزلوں میں ''سرکتی جائے ہے رُخ سے نقاب آہستہ آہستہ......، کل چودھویں کی رات تھی، شب بھر رہا چرچا ترا......، یہ دولت بھی لے لو، یہ شہرت بھی لے لو......'' وغیرہ بہت مقبول ہوئیں۔ انھوں نے مرزا غالبؔ کے علاوہ فراقؔ گورکھپوری، قتیلؔ شفائی، فیض احمد فیضؔ، امیرؔ

مینائی، کفیل آذر امروہوی، شاہد کبیر، سدرشن فاکر، ندا فاضلی، ذکا صدیقی، نذیر باقری، فیض رتلامی، اور راجیش ریڈی جیسے شاعروں کی غزلیں بڑے خوبصورت اور دلکش انداز میں گائی ہیں۔

۲۰۰۳ء میں جگجیت سنگھ کو حکومت ہند کی جانب سے پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا گیا۔ جنوری ۱۹۹۸ء میں جگجیت سنگھ کو دل کا دورہ پڑا تھا۔ اس کے بعد انہوں نے سگریٹ نوشی ترک کر دی تھی۔ اکتوبر ۲۰۰۷ء میں دورانِ خون کی پرابلم کی وجہ سے ان کو اسپتال میں داخل ہونا پڑا تھا۔ ۲۳ر ستمبر ۲۰۱۱ء کو جگجیت سنگھ کو برین ہیمرج کی وجہ سے باندرہ کے لیلاوتی اسپتال میں داخل کرایا گیا تھا، جہاں وہ دماغ کی سرجری کے بعد آئی۔ سی۔ یو۔ میں داخل رہے، مگر ان کی حالت میں کوئی خاطر خواہ افاقہ نہ ہو سکا اور آخرکار ۱۰ر اکتوبر بروز پیر ۷۰ر برس کی عمر میں اُنہوں نے داعی اجل کو لبیک کہا اور اپنے خالق حقیقی سے جا ملے۔ فنون لطیفہ کی دنیا اُداس ہو گئی۔ ایک خوبصورت، دلکش آواز ہم سے جدا ہو گئی۔ اپنی ریشمی آواز سے غزلوں میں روح پھونکنے والا فنکار اس دُنیا سے رُخصت ہو گیا۔

OO
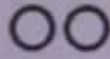
راجہ مہدی علی خاں

ہندوستانی سینما کی تاریخ میں ایسے چند ہی نغمہ نگار ہوئے ہیں جنہوں نے اپنے معیاری نغموں سے ہمیشہ کے لئے اپنا نام فلمی تاریخ میں درج کرا دیا ہے۔ نغمہ نگار راجہ مہدی علی خاں بھی ان چند میں سے ایک ہیں۔ حالانکہ انہوں نے بہت کم گیت لکھے ہیں، اور کم عمری میں ہی وہ اس جہانِ فانی سے چلے بھی گئے، مگر جو نغمے انہوں نے ہماری فلموں کو دیے، ان میں شاعری کے معیار اور موسیقی کے پیمانوں میں الفاظ کی نشست و برخاست بے مثال ہے۔ راجہ مہدی علی خاں کے لکھے ہوئے بیشتر نغموں نے لوگوں کے دلوں پر اپنی الگ ہی چھاپ چھوڑی ہے۔

راجہ مہدی علی خاں غیر منقسم ہندوستان کے پنجاب صوبے کے کرم آباد گاؤں میں ایک زمیندار خاندان میں ۲۲ر ستمبر ۱۹۲۲ء کو پیدا ہوئے۔ ان کی ننیھال لاہور کے پاس ایک گاؤں وزیر آباد میں تھی، جہاں ان کی پیدائش ہوئی۔ راجہ مہدی علی خان کے نانا وزیر آباد گاؤں کے ایک بہت بڑے اور بااثر زمیندار تھے۔ اس لئے بعد میں ان کے نام پر گاؤں کا نام بدل کر کرم آباد رکھ دیا گیا تھا۔ راجہ مہدی علی خاں کی والدہ ہیبے صاحبہ نہایت علم دار اور صاحب دیوان شاعرہ تھیں۔ لہٰذا راجہ مہدی علی خان کی گھٹی میں ہی اردو شاعری شامل ہو گئی تھی۔ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال کے بقول راجہ مہدی علی خاں کی والدہ ہیبے صاحبہ اپنے دور کی شاعرات میں سب سے بہتر شعر کہنے والی خاتون ہیں۔ راجہ مہدی علی خاں کے ایک ماموں مولانا ظفر علی خاں کانگریس کے ایک اہم کارکن تھے اور دوسرے ماموں حامد علی خاں ایک ماہر تعلیم کی

حیثیت سے معاشرے میں کافی مقبول تھے۔ لہٰذا راجہ مہدی علی خاں کی پرورش خالص ادبی ماحول میں ہوئی تھی جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے محض دس برس کی عمر میں بچوں کے لئے ایک رسالے کا اجراء کیا۔

راجہ مہدی علی خاں تقسیم وطن سے قبل ہی دہلی آگئے جہاں انہوں نے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت اختیار کر لی۔ یہی وہ دور تھا جب اردو کے مشہور افسانہ نگار سعادت حسن منٹو سے ان کی دوستی گہری ہو رہی تھی۔ سعادت حسن منٹو بمبئی چلے گئے اور وہاں مختلف فلمسازوں کے لئے فلمی کہانیاں اور ان کے ڈائیلاگ وغیرہ لکھنے لگے۔ کچھ عرصہ بعد سعادت حسن منٹو کے کہنے پر ہی راجہ مہدی علی خاں بھی بمبئی چلے گئے۔

اس زمانے میں دینا ناتھ مدھوک، قمر جلال آبادی، پنڈت اِندر اور نیل کنٹھ تیواری پہلے سے ہی بطور نغمہ نگار اپنے قدم جمائے ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی راجندر کرشن، مجروح سلطانپوری، شکیل بدایونی اور پریم دھون بھی اپنی جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ ایسے وقت میں اپنی پہلی ہی فلم ''شہید'' کے ایک ہی گانے سے راجہ مہدی علی خاں نے اپنی فلمی نغمہ نگاری کی صلاحیت کا سکہ جما دیا۔ وہ نغمہ تھا...... ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہو......''۔

گزشتہ صدی کی پانچویں دہائی ہندوستانی فلم انڈسٹری نے کے لئے کئی معاملات میں بڑی اہم رہی ہے۔ اسی دور میں فلم انڈسٹری سے اردو کے کئی بڑے ادیب اور شاعر وابستہ ہوئے تھے اور وہاں کا ماحول ادبی لحاظ سے بڑا خوشگوار ہو گیا تھا۔ کمال امروہوی، سعادت حسن منٹو، وجاہت مرزا، امان اللہ خاں جیسے ادیب بھی فلمی دنیا میں اپنے قدم جما چکے تھے۔ ۱۹۴۰ء میں ہمانشو رائے کے انتقال کے بعد دیویکا رانی بمبئی ٹاکیز کو سنبھال نہیں پائیں اور ان کے خاص لوگوں میں سے ایس۔ مکھرجی، اشوک کمار، رائے بہادر چنّی لال، وغیرہ نے اپریل ۱۹۴۳ء میں الگ ایک کمپنی بنا کر فلمستان کی بنیاد ڈالی۔ اِس نئی کمپنی کے لئے نئی ہیروئینوں، ہیرو، ادیبوں، گیت

کاروں اور ہدایتکاروں کی تلاش شروع ہو گئی۔ نغمہ نگار پردیپ بھی بمبئی ٹاکیز چھوڑ گئے اور ان کی جگہ بھگوتی چرن ورما الٰہ آباد سے نریندر شرما کو لے آئے۔ ادھر ششدھر مکرجی نے گوپال سنگھ نیپالی کو شامل کر لیا۔ سعادت حسن منٹو بھی دہلی کی ملازمت چھوڑ کر بمبئی میں فلمستان سے وابستہ ہو گئے۔

کچھ عرصے کے بعد منٹو نے راجہ مہدی علی خاں کو بھی بمبئی بلا لیا۔ ان دنوں منٹو کی کہانی پر فلمستان والے فلم ''آٹھ دن'' بنا رہے تھے۔ اس سے قبل منٹو کی ہی کہانی پر ۱۹۴۴ء میں ''چل چل رے نوجوان'' بن کر ریلیز ہو چکی تھی جس کے سبھی نغمے پردیپ نے لکھے تھے۔ فلم ''آٹھ دن'' کے گانے قمر جلال آبادی اور گوپال سنگھ نیپالی کو لکھنے کے لئے دئے گئے۔ اس فلم کے کچھ کرداروں کا انتخاب نہیں ہوا تھا۔ لہٰذا سعادت حسن منٹو، راجہ مہدی علی خاں اور اوپندر ناتھ اشک نے وہ کردار ادا کئے۔ اسی زمانے میں فلم ''شہید'' کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔ اس فلم کے ہدایتکار رمیش سہگل اور موسیقار غلام حیدر تھے۔ مرکزی کردار میں دلیپ کمار اور کامنی کوشل کے ساتھ چندر موہن تھے۔ اس فلم میں سات گانے تھے۔ لہٰذا چار گانے راجہ مہدی علی خاں کو لکھنے کے لئے دئے گئے۔ باقی گیت قمر جلال آبادی اور نخشب جارچوی کے حصے میں آئے۔

راجہ مہدی علی خاں کے گانوں میں ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہوں'' اور ''آجا بے دردی بلما کوئی رو رو پکارے'' بے حد مقبول ہوئے اور ''وطن کی راہ'' والے نغمے نے تو دھوم ہی مچا دی۔ کشمیر سے کنیا کماری اور بنگال سے راجستھان تک اس گانے کی گونج سنی گئی۔ اس گانے کو سنتے ہی جوش آجاتا تھا۔ آج بھی قومی تہواروں کے موقع پر یہ گانا ضرور سنائی دیتا ہے اور صدابہار فلمی نغموں میں اس گانے کو خاص مقام حاصل ہے۔ اس ایک ہی گانے سے راجہ مہدی علی خاں کی پہچان کامیاب نغمہ نگاروں میں ہونے لگی۔

۱۹۴۷ء میں فلمستان کی ایک دوسری فلم ''دو بھائی'' بھی زیر تکمیل تھی۔ اس فلم

کے سبھی گیت راجہ مہدی علی خاں نے لکھے تھے۔ گیتا رائے کی آواز میں ''میرا سندر سپنا ٹوٹ گیا'' گانا کافی مقبول ہوا تھا۔ اس کی موسیقی ایس۔ ڈی۔ برمن دا نے ترتیب دی تھی۔ اس کے بعد ۱۹۵۰ء تک راجہ مہدی علی خاں نے تقریباً دس فلموں میں نغمہ نگاری کی۔ ۱۹۴۸ء میں ''ودیا''، ''ضدی''، ۱۹۴۹ء میں فلم ''کمل'' اور ۱۹۵۰ء میں فلم ''بھائی بہن، مانگ، مغرور، مقدر، نردوش، سنگرام'' اور ''آنکھیں''۔

۱۹۵۱ء میں فلم ''مدہوش'' ریلیز ہوئی جس میں موسیقار مدن موہن نے ''میری یاد میں تم نہ آنسو بہانا'' گانے کو ترتیب دے کر یادگار بنا دیا۔ اس فلم سے مدن موہن کے ساتھ راجہ مہدی علی خاں کی جوڑی بن گئی اور پھر کئی بہترین اور معیاری نغموں سے فلمی دنیا سرشار ہوئی۔ فلم ''مدہوش'' کے گیارہ سال بعد ۱۹۶۱ء میں فلم ''اَن پڑھ'' میں ایک بار پھر مدن موہن اور راجہ مہدی علی خاں ایک ساتھ ہوئے۔ اسی جوڑی نے فلمی دنیا کو کئی بے حد کامیاب نغمے دئے۔ ۱۹۶۲ء میں ''اَن پڑھ''، ۱۹۶۴ء میں ''وہ کون تھی''، ۱۹۶۶ء میں ''دلہن ایک رات کی''، اِن سبھی فلموں کا سنگیت مدن موہن نے دیا تھا اور نغمے راجہ مہدی علی خاں نے تحریر کئے تھے۔

فلمی نغموں میں سچویشن کے مطابق موسیقار کی دھن پر دلی جذبات کی عکاسی کرتے ہوئے نغمہ نگاری کرنا ایک نہایت مشکل عمل ہوتا ہے جسے راجہ مہدی علی خاں نے بڑی ہی خوبصورتی سے نبھایا ہے۔

راجہ مہدی علی خاں کے بے حد کامیاب فلمی نغموں میں ''پوچھو ہمیں، ہم اُن کے لئے کیا کیا نذرانے لائے ہیں......'' (فلم ''مٹی میں سونا'')، ''جب چھائے کبھی ساون کی گھٹا......'' (فلم ''ریشمی رُمال'')، ''آپ یوں ہی اگر ہم سے ملتے رہے......'' (فلم ''ایک مسافر ایک حسینہ'')، ''آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے قابل مجھے......'' (فلم ''اَن پڑھ'')، ''جو ہم نے داستاں اپنی سنائی......'' (فلم ''وہ کون تھی'')، ''اگر مجھ سے محبت ہے مجھے سب اپنے غم دے دو......'' (فلم ''آپ کی پرچھائیاں'')، ''تو

جہاں جہاں رہے گا میرا سایہ ساتھ ہوگا......" (فلم "میرا سایہ")، "آخری گیت محبت کا سنا لوں تو چلوں......" (فلم "نیلا آکاش") وغیرہ گیت آج بھی اپنی تازگی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔

راجہ مہدی علی خاں نے اپنے بیس برس کے فلمی سفر میں تقریباً ۷۵ر فلموں کے لئے نغمہ نگاری کی۔ راجہ مہدی علی کی صحت خراب رہنے لگی۔ ابھی وہ صرف ۴۴ر برس کے ہی تھے کہ ۲۷ر جولائی ۱۹۶۶ء کو آخری وقت آگیا اور انہوں نے داعیٔ اجل کو لبیک کہا۔ فلمی دنیا کو اپنی شاعری سے منور کرنے والا یہ بہترین نغموں کا تخلیق کار اپنے خالقِ حقیقی سے جاملا۔

○○

سرینڈر

اپنے وقت کے مقبول ہیرو اور گلوکار سرینڈر ناتھ کا جنم ۱۹۰۷ء میں پنجاب کے ضلع بٹالہ میں ہوا تھا۔ سرینڈر کا تعلق اس دور کے فنکاروں میں تھا جس میں پرتھوی راج، چندر موہن، اشوک کمار، موتی لعل، ایشور لعل، پریم ادیب، جال مرچینٹ، ای۔ بلیموریہ، اور ڈی۔ بلیموریہ تھے۔ ان دنوں پلے بیک سسٹم کا رواج شروع نہیں ہوا تھا۔ اس لئے فلمی ستارے اپنے گانے خود ہی گایا کرتے تھے، لیکن سرینڈر کو فن موسیقی پر مکمل عبور حاصل تھا، اور نامور گلوکار سہگل کے ساتھ ہی سرینڈر کا نام بھی لیا جاتا تھا۔ ان دنوں چند ایک ہی تو جانے پہچانے گلوکار تھے۔ سہگل، کے۔ سی۔ ڈے، پنکج ملک وغیرہ۔ ان ہی میں سرینڈر کا نام شمار کیا جاتا تھا۔

سرینڈر نے ابتدائی تعلیم بٹالہ میں حاصل کی اور لاہور سے وکالت پاس کر کے وہیں پریکٹس شروع کر دی۔ اتفاق سے پروڈیوسر لالہ آلوکی ناتھ کی نظر سرینڈر پر پڑی۔ لالہ جی سرینڈر کی اداکاری اور گانے سے بہت متاثر ہوئے، اور بمبئی بلا لیا، جہاں لالہ جی نے سرینڈر کا تعارف ساگر مووی ٹون سے کرایا۔ بس اس کے بعد سرینڈر کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کی فرصت نہیں ملی۔ شروع میں ساگر مووی ٹون نے چند برس تک سرینڈر کو ڈھائی سو روپے ماہانہ تنخواہ پر ملازم رکھا۔ یہ ۱۹۳۶ء کی بات ہے، سرینڈر نے اپنی اولین فلم ساگر مووی ٹون کی تخلیق ''منموہن'' سے خود کو بطور سنگر ایکٹر کے طور پر روشناس کرایا۔ اس فلم کے ہدایتکار محبوب خان تھے۔ ہیروئن کا رول اس وقت کی سحر طراز حسینہ بِبّو نے ادا کیا تھا۔ ان کے علاوہ یعقوب، آشالتا، پلیسی پٹیل بدھوا ایڈوانی، ضیا سرحدی، سہری راجہ

اور قائم علی وغیرہ نے بھی فلم میں کام کیا تھا۔

اس برس سریندر نے ساگر مووی ٹون کی فلم ''ڈکن کوئین'' میں بھی کام کیا۔ اس فلم کو بھی محبوب خان نے ڈائیریکٹ کیا تھا اور ہیروئین اس زمانے کی شوخ و شنگ حسینہ ارونا دیوی تھیں۔ ''ڈکن کوئین'' کی کامیابی سے محبوب خان کے ساتھ ساتھ سریندر اور ارونا دیوی کو بھی کافی شہرت ملی۔ دھیرے دھیرے سریندر کا نام زبان زد خاص و عام ہو گیا۔ اس عظیم فنکار کے گائے ہوئے نغمے گھر گھر میں گنگنائے جانے لگے۔ سریندر کی بطور گلوکار کامیابی کو دیکھتے ہوئے ۱۹۵۸ء میں ساگر مووی ٹون نے ایک موسیقی ریز فلم ''گراموفون سنگر'' بنائی۔ ڈی۔ سی۔ ڈیسائی اور آر۔ ٹھاکر کی مشترکہ ڈائرکشن میں تیار کی گئی اس فلم میں بِبّو نے ایک مرتبہ پھر ہیروئین کا رول ادا کیا۔ فلم اور فن کے شیدائی لگ بھگ بیس برس تک سریندر کے نغموں اور اداکاری سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ ان بیس برسوں میں سریندر نے ساٹھ سے زیادہ فلموں میں کام کیا۔ جن میں سے اکثر فلمیں یادگار ثابت ہوئیں، جن میں ''اعلان، انوکھی ادا، برہمچاری، بھرتری ہری، اور انمول گھڑی'' کا نام خاص طور سے لیا جا سکتا ہے۔ ''انوکھی ادا'' اور ''انمول گھڑی'' کے نغمے کافی مقبول ہوئے، جن میں 'کیوں یاد آ رہے ہیں گزرے ہوئے زمانے' اور 'آواز دے کہاں ہے' تو آج بھی بے حد مقبول ہیں۔ ملکۂ ترنم نور جہاں کے ساتھ فلم ''انمول گھڑی'' میں گایا ہوا گانا 'آواز دے کہاں ہے' کو سن کر تو آج بھی سڑک پر چلتے ہوئے لوگوں کے قدم یک بیک رُک جاتے ہیں اور دل کی دھڑکن بڑھ جاتی ہے۔ ایک بار مختصر دورے پر گلوکارہ نور جہاں پاکستان سے بھارت آئی تھیں تو خرابیٔ طبیعت کے باوجود پرستاروں کے اصرار پر نور جہاں نے فلم ''انمول گھڑی'' کا یہ نغمہ...... ''آواز دے کہاں ہے'' اپنی مخصوص سحر آفریں آواز میں سنایا تھا۔ افسوس کا مقام ہے کہ اس موقع پر جب نور جہاں سے یہ نغمہ سریندر کی سنگت میں گانے کو کہا گیا تو اُس نے معذوری ظاہر کر دی اور تنہا ہی گانے کی خواہش ظاہر کی۔ فلم ''بھرتری ہری'' میں سریندر کے ایک گانے...... '''بھکشا دیدے ری میا'' کو بھی دائمی مقبولیت حاصل ہے۔

بطور گلوکار اداکار سریندر کی آخری فلم ۱۹۵۴ء میں ریلیز ہوئی جو این۔ پی۔ فلمز کی تخلیق ''مہاتما کبیر'' تھی۔ اس فلم کے ہدایت کار گجانن جاگیردار تھے اور سلوچنا نے ہیروئین کا رول ادا کیا تھا۔ ۶۲-۱۹۶۰ء میں سریندر نے کریکٹر رول ادا کرنے شروع کر دیئے تھے۔ اُن دنوں سریندر کی فلم ''گیت گایا پتھروں نے'' کافی پسند کی گئی، مگر وی۔ شانتارام نے مذکورہ فلم میں جو رول دیا تھا وہ سریندر کے مزاج اور پسند کے مطابق نہیں تھا۔ اس لئے ۱۹۶۳ء میں سریندر نے ہندی فلموں سے سنیاس لے لیا، اور ایک 'ایڈورٹائیزنگ فرم پرفورمنس پروڈکشنز' شروع کر دی۔ مذکورہ کمپنی کے لئے مہندر بترہ نے ایک فلم بنائی تھی ''ابھی تو جی لیں''۔ بطور ایکٹر یہ سریندر کی آخری فلم تھی جو ۱۹۷۳ء میں مکمل ہو گئی تھی، لیکن کچھ وجوہات کی بنا پر آج تک ریلیز نہیں ہو پائی۔ اس فلم میں ہیروئین کا رول جیا بھادوری نے ادا کیا ہے۔ دیگر ستاروں میں سمی گریوال، ڈینی، کرن کمار کا نام قابل ذکر ہے۔ اِن کے علاوہ فلم میں سریندر کے بیٹے جیت نے بھی کام کیا ہے۔ سریندر کی تازہ ترین فلم ''انگارے'' تھی۔

اگرچہ سریندر نے اداکاری سے کنارہ کشی کر لی تھی، لیکن گلوکاری سے لگاؤ برقرار رکھا۔ سریندر نے ایک گراموفون ریکارڈ ''سریندر سنگز اگین'' بھی تیار کرایا تھا، جو آٹھ نغموں پر مشتمل ہے۔ ایک اور ریکارڈ کے لئے سریندر کو ۱۸ ستمبر کو کچھ اور بھی گانے ریکارڈ کرانے تھے، لیکن قسمت نے یاوری نہ کی، اور ۱۱ ستمبر ۱۹۸۷ء کو دل کا دورہ پڑنے سے جوہو میں واقع رہائش گاہ پر اس بہترین فنکار سریندر کا انتقال ہو گیا۔

○○
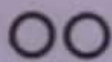
نانا پلسیکر

فلمی دنیا کے مشہور و مقبول کریکٹر آرٹسٹ نانا پلسیکر کا ۱۹۸۴ء میں بمبئی میں کچھ دن کی علالت کے بعد انتقال ہوا۔ ان کی عمر ۷۶ رسال تھی اور وہ ہندوستانی فلموں کے بڑے پُرانے آرٹسٹوں میں سے تھے...... ایک زمانہ تھا جب فلموں میں آنے سے قبل جنگ آزادی کے جیالے پروانوں میں ان کا شمار ہوتا تھا اور وہ ملکی سیاست میں بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتے تھے۔ مگر فلموں میں آنے کے بعد انہوں نے عملی سیاست سے کنارہ کشی اختیار کر لی اور صرف اپنے فلمی کیریئر پر ہی توجہ مرکوز کر دی۔

نانا پلسیکر درحقیقت فلموں کی ہدایتکاری کا بہترین تجربہ رکھتے تھے۔ مگر انہوں نے اس تجربے کو اپنی ذات تک ہی محدود رکھا۔ وہ ہمیشہ اس بات کا خیال رکھتے تھے کہ ان کی فلم کا ہدایتکار ان کی دخل اندازی کا شکار نہ ہو جائے۔ نانا پلسیکر اس بات کو بخوبی جانتے تھے کہ ہدایتکار جہاز کے کپتان کی طرح ہوتا ہے اور ہر حالت میں باقی لوگوں کو اس کا کہنا مان کر چلنا چاہئے۔ یہ بات انہوں نے اس وقت سیکھی تھی جب وہ وی۔ شانتارام کے اسسٹنٹ تھے۔ ایک اچھے فنکار کے ساتھ ساتھ ہدایتکاری کا تجربہ رکھنے والے نانا پلسیکر سے ان کے سبھی ہدایتکار مطمئن تھے کیونکہ وہ کہانی اور منظر کے عین مطابق ریزلٹ پیش کرتے تھے اور فلم کے کردار میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے تھے۔

نانا پلسیکر فلمی دنیا کے بزرگ آرٹسٹوں میں تھے مگر کبھی بھی انہوں نے اپنی بزرگی کو دوسروں پر نہیں لادا۔ انہوں نے مختلف قسم کے رول مختلف ہدایت کاروں کے ساتھ فلمی پردے پر پیش کئے۔ خاص طور پر وی۔ شانتارام، راج کپور، بی۔ آر چوپڑہ، مرحوم

بمل رائے، اور رشی کیش مکھرجی کے ساتھ نانا پلسیکر نے کئی فلموں کے کرداروں کو زندگی بخشی۔ نانا پلسیکر ایک ایسے فنکار تھے جنہوں نے ایک بہت ہی بڑے مالدار آدمی اور بہت زیادہ غریب آدمی کے کردار بڑی خوبصورتی اور حقیقی انداز میں پردۂ سیمیں پر پیش کیئے۔ انہوں نے سادھوں کے کردار بھی نبھائے اور جرائم پیشہ لوگوں کے بھی۔

نانا پلسیکر اس دور کے اعلیٰ درجے کے کریکٹر آرٹسٹ تھے۔ ان کو ہر کردار میں ڈھل جانے میں مہارت حاصل تھی۔ ہندوستانی فلمی دنیا میں وہ اداکاری کے ایک اسکول کی حیثیت رکھتے تھے۔

بہت زمانہ پہلے نانا پلسیکر نے ایک کاسٹیوم فلم ''دھواں دھار'' میں لیلا چٹنس کے ساتھ کام کیا تھا۔ اس فلم کا فلمساز ایک مشہور سیاسی آدمی ڈی۔ پی۔ مشرا تھا۔ یہ اس وقت میں مدھیہ پردیش کے چیف منسٹر تھے۔ یہ لگ بھگ چوتھی دہائی کی بات ہے، جب ہندوستانی فلمیں خاموشی سے آواز کی طرف جا رہی تھیں اور فلموں کو نئی نئی آواز مل رہی تھی۔ اس فلم میں نانا پلسیکر نے ایک نوجوان کا کردار اس طرح ادا کیا تھا کہ فلم بینوں کے ذہن میں آج تک اس کی یاد باقی ہے۔

نانا پلسیکر بمبئی کی مشہور فلم کمپنی ''بمبئی ٹاکیز'' میں مستقل طور پر اداکار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ وہاں ان کے ہدایتکار ایس۔ مکھرجی اور گیان مکھرجی تھے۔ یہیں ۱۹۴۰ء میں نانا پلسیکر نے فلم ''نیا سنسار'' میں کام کیا تھا اور یہ فلم خواجہ احمد عباس نے لکھی تھی جو اُن کی پہلی فلم تھی۔ دوسری جگہ جہاں نانا پلسیکر نے مستقل طور پر اداکار کی حیثیت سے کام کیا وہ تھا شانتارام کا راج کمل کلا مندر، جہاں نانا پلسیکر نے اداکاری کے ساتھ ساتھ ہدایتکاری بھی کی اور وہ شانتارام کے اسسٹنٹ کے طور پر کام کرتے رہے۔

فلم ''قانون'' میں ایک کردار کو بہتر طریقے پر ادا کرنے کے لئے نانا پلسیکر کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ نانا پلسیکر نے فلم ''دائرہ، جس دیش میں گنگا بہتی ہے، دو بیگہ زمین، مُنا، شہر اور سپنا، آسمان محل، پریم پربت'' وغیرہ فلموں میں یادگار کردار ادا کیئے ہیں۔ فلم ''گاندھی'' میں انہوں نے ایک چھوٹا سا کردار ادا کیا تھا۔

فلم ''جس دیش میں گنگا بہتی ہے'' کی شوٹنگ کے دوران نانا پلسیکر نے یونٹ کے لوگوں کو آکر یہ خبر سُنائی کہ اس فلم کی مرکزی کہانی سُن کر اور متاثر ہوکر آچاریہ ونوبا بھاوے لوکیشن پر تشریف لا رہے ہیں۔ یونٹ کے سبھی لوگ بہت خوش ہوئے۔ اس فلم میں پران بھی ایک اہم کردار ادا کر رہے تھے اور یہ فلم ڈاکوؤں کے موضوع پر بن رہی تھی۔ پران نے لوگوں سے کہا کہ وہ ونوبا بھاوے سے ڈاکوؤں کے میک اَپ میں ہی ملاقات کریں گے۔ لوگوں نے انہیں سمجھایا کہ صوفی سنتوں سے اس طرح ملنا ٹھیک نہیں، مگر پران اپنی ضد پر قائم رہے اور ڈاکوؤں کے میک اَپ میں بندوق اپنے کندھے پر ڈال کر اُس مقام پر پہنچے جہاں کے بارے میں بتایا گیا تھا کہ ونوبا بھاوے وہاں قیام کریں گے۔

پران نے ونوبا بھاوے کے سامنے جا کر سر جھکایا، تعظیم کی اور اپنی بندوق زمین پر رکھتے ہوئے کہا...... ''آچاریہ جی، میں اپنے آپ کو آپ کے حوالے کرتا ہوں۔''

''میں تمہاری اس خود سپردگی سے بہت خوش ہوں، اسی میں تمہارا اور تمہارے ساتھیوں کا بھلا ہے کہ اپنے آپ کو قانون کے حوالے کر دو۔ میرے ساتھ کوتوالی چلو۔'' پران کو جواب ملا۔

پران یہ سُن کر گھبرا گئے اور نہایت عاجزانہ انداز میں بولے۔ ''مہاراج مجھے تھانے مت لے جائیے۔ میں اصلی ڈاکو نہیں ہوں۔ میں تو فلم اداکار پران ہوں اور اس نئے طریقے سے آپ کے دیدار کرنے آیا ہوں۔''

''آچاریہ جی اِس طریقے پر کسی کو دیدار نہیں کراتے۔'' انہوں نے جواب دیا۔

''تم اگر فلم اداکار پران ہو تو میں بھی ایک اداکار نانا پلسیکر ہوں......'' آچاریہ ونوبا بھاوے کے میک اَپ میں وہاں بیٹھے نانا پلسیکر نے جواب دیا۔ یہ تھا ان کی زندہ دلی کا ایک نمونہ......۔ نانا پلسیکر نے لگ بھگ ایک سو پچاس فلموں میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔ نانا پلسیکر نے نئے اداکاروں کی مدد سے ایک اکیڈمی بھی قائم کی تھی۔

○○

مدن موھن

کسی مفکر کا قول ہے کہ اس دنیا میں تدبیر کے بعد بھی آدمی تقدیر کا غلام ہے اور یہ حقیقت ہے کہ انسان اپنی تدبیر سے کرنا کچھ چاہتا ہے اور تقدیر کا لکھا کچھ اور ہی ہوتا ہے۔ اس قول کی مثالیں انسانی زندگی کے ہر شعبہ میں مل سکتی ہیں۔ ایسی ہی ایک مثال ہماری فلمی دنیا کے مشہور موسیقار مدن موہن کی بھی ہے۔ ایک مدن موہن ہی کیا؟ فلمی دنیا میں اور بھی کئی ایسی مثالیں موجود ہیں کہ لوگ کچھ سے کچھ بن گئے۔ فلمی دنیا کے مقبول ترین اداکار دادامنی اشوک کمار محض ایک ٹیکنیشین تھے اور بمبئی ٹاکیز کی لیباریٹری میں کام کرتے تھے۔ مگر تقدیر کے ایک فیصلے نے ان کو ملک کا ایک کامیاب ترین ایکٹر بنا دیا۔ مشہور گلوکار مکیش فلموں میں اداکاری کے لئے بمبئی آئے تھے اور بعد میں کامیاب گلوکار کے طور پر زندگی تمام کی۔ اسی طرح پرکاش مہرا فلموں میں گیت لکھنے کے لئے یو۔ پی۔ کے ضلع بجنور سے بمبئی آئے تھے اور بعد میں ایک کامیاب فلمساز اور ہدایت کار کے طور پر اپنی شناخت کرائی۔

یہ فلموں کی رنگین دنیا بھی بڑی عجیب دنیا ہے۔ یہاں کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ ذرا سوچیے، یہ کتنی مضحکہ خیز حقیقت ہے کہ اس جہانِ فلم میں کوئی کہانی کار بننے آتا ہے مگر قسمت اسے فلمساز بنا دیتی ہے۔ پلے بیک سنگر بننے آتا ہے تو موسیقار بن جاتا ہے۔

مقبول موسیقار مدن موہن کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی حادثہ پیش آیا اور یہ حادثہ دلچسپ بھی تھا۔ مدن موہن شروع میں ایک فلمی اداکار بننے کے خواہشمند تھے اور ان میں وہ ساری خوبیاں اور صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں جو ایک کامیاب اداکار کے

لئے ضروری تصور کی جاتی ہیں...... جاذب نظر شخصیت، چہرے کا نفسیاتی اُتار چڑھاؤ، حرکات وسکنات سے احساسات وجذبات کا بھرپور اظہار، مکالموں کی خوبصورت اور پُراثر ادائیگی اور وہ سب کچھ جو ایک کامیاب اداکار کے لئے ضروری ہوتا ہے۔ مگر ان کی ایک اداکار بننے کی خواہش کڑی جد وجہد اور جان توڑ کوششوں کے باوجود بے ثمر ثابت ہوئی اور ان کے سنہرے خواب شرمندۂ تعبیر نہ ہو سکے۔ خواب صرف خواب ہی ثابت ہوئے اور حقیقت نے ان کو وہ بنا دیا جس کا تصور بھی انہوں نے کبھی نہ کیا ہوگا۔

حالانکہ مدن موہن کے والد رائے بہادر چنی لال فلمستان اسٹوڈیو کے مینیجنگ ڈائیریکٹر تھے۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ اسٹار سسٹم کا دور دور تک کوئی وجود نہ تھا اور آج کی طرح فلمسازوں کو فلم اسٹاروں کی جی حضوری میں روز وشب صرف نہیں کرنے پڑتے تھے۔ اس زمانے میں فلمساز ایک بے حد بلند اور باوقار شخصیت ہوا کرتی تھی اور ہر کوئی اسے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھتا تھا اور پھر فلمستان میں تو رائے بہادر چنی لال جی کا کچھ ایسا رعب ودبدبہ تھا کہ اس دَور کے شہرۂ آفاق فلمی ستارے راج کپور، دیوآنند اور اشوک کمار بھی ان سے سہمے سہمے سے نظر آتے تھے۔ لیکن مدن موہن کے ساتھ سب سے بڑی بدقسمتی یہ رہی کہ ان کے والد رائے بہادر چنی لال ان کے اداکار بننے کے سخت ترین مخالف تھے۔ آج کی طرح سٹار سن کا تصور بھی اس زمانے میں نہیں تھا۔

مدن موہن جس کسی فلمساز سے ملاقات کرتے وہ انہیں بڑی عزت اور خلوص کے ساتھ بٹھاتا لیکن جب وہ اپنی تمنا کا اظہار کرتے، اپنے خوابوں کا تذکرہ کرتے تو وہ بڑے خوبصورت انداز میں ٹال جاتے اور مدن موہن کے پلّے سوائے مایوسی اور ناکامی کے کچھ نہ پڑتا۔ وہ کبھی کبھی اس مسلسل ناکامی اور مایوسی سے بڑے دل برداشتہ ہو جاتے اور سوچنے لگتے کہ آخر کیا بات ہے۔ اپنی اس ذہنی اُلجھن کو دُور کرنے کے لئے اُنہوں نے ایک فلمساز سے اس کی وجہ پوچھ ہی لی۔ اس فلمساز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا...... ''مدن جی، آپ کے والد فلمستان کے مینجنگ ڈائیریکٹر ہیں۔ ساری فلمی دُنیا پر اُن کا گہرا اثر ورسوخ ہے لیکن اس کے باوجود وہ آپ کو اداکار بنانے کی بات نہیں

سوچتے؟ تو پھر کوئی دوسرا فلمساز یہ جرأت کس طرح کر سکتا ہے؟
یہ سن کر مدن موہن کو شدید ذہنی تکلیف پہنچی۔ وہ دل شکستہ ہو گئے۔ ان کے سنہرے خواب تنکوں کی طرح بکھر گئے اور انہیں اس بات کا بڑا کربناک احساس ہوا کہ ان کے مینجنگ ڈائیریکٹر والد کی مخالفت اور اختلاف رائے ان کے مستقبل کے رنگین منصوبوں کی تکمیل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔
انہوں نے اپنے والد کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کرنے کی بے انتہا کوشش کی، بہت سر مارا لیکن خاطر خواہ نتائج برآمد نہ ہو سکے۔ ان کے والد ٹس سے مس نہ ہوئے۔ آخر یہ اختلافات اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئے اور نتیجے میں مدن موہن نے اپنا گھر، جہاں انہیں زندگی کی ساری آسائشیں، مسرتیں اور خوشیاں حاصل تھیں، چھوڑ دیا۔
اس انجانے موڑ پر پہنچ کر ان کی زندگی نے ایک نیا اور انوکھا موڑ اختیار کیا۔ گھر سے نکل کر وہ جس ماحول میں پہنچے وہ سُر اور نغمات کا ماحول تھا۔ اچھے اور پایہ کے فنکاروں اور موسیقاروں کی دنیا تھی۔ مدن موہن کی بے چین طبیعت اور الجھی ہوئی ذہنی کیفیت کو اس نغماتی ماحول نے سکون سا بخشا اور آہستہ آہستہ وہ فن موسیقی اور سازوں میں دلچسپی لینے لگے۔ وقت کا پرندہ تیزی سے بلندیوں پر پرواز کرتا رہا اور ایک مدّت گزر گئی۔
اب مدن موہن ایک مکمل موسیقار بن چکے تھے اور ان کی تمام تر دلچسپیاں موسیقی اور سازوں کی دنیا سے وابستہ تھیں۔ چند دن بعد انہیں آل انڈیا ریڈیو، لکھنؤ میں میوزیکل ڈپارٹمینٹ کے انچارج کی حیثیت سے ملازمت مل گئی اور وہ لکھنؤ چلے گئے۔ لکھنؤ کی ملازمت کے دوران انہوں نے بڑی دلجوئی، دلچسپی اور لگن کے ساتھ ذمہ داریوں کو نبھایا۔ ریڈیو کے پروگراموں میں اَن گنت نئی اور خوبصورت تبدیلیاں کیں اور موسیقی کے معیار کو بلند سے بلند تر کرنے میں مصروف ہو گئے۔
کچھ ہی دن بعد اچانک ان کا تبادلہ دہلی کر دیا گیا۔ مدن موہن چند ذاتی وجوہات کے پیش نظر دہلی نہیں جانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ملازمت سے استعفیٰ دے

دیا اور کچھ دن بیکار رہنے کے بعد ملٹری میں ایک آفیسر کی حیثیت سے بھرتی ہو گئے۔
لیکن ایک موسیقار کو جو فطری طور پر آزاد طبع اور خالصتاً تخیلی انسان ہوتا ہے، بھلا ملٹری کا تنگ اور محدود ماحول کیوں کر راس آسکتا تھا؟ کہاں فن کی لامحدود وسعتیں، بلند پروازیاں اور کہاں قدم قدم پر ضابطے، قانون اور ڈسپلن۔ اس منزل پر پہنچ کر وہ پھر بے چین اور مضطرب رہنے لگے۔ پھر ایک دن فلمی دنیا کی رنگین فضاؤں اور جگمگاتی روشنیوں نے اُن کے قلب وذہن کو اپنی طرف متوجہ کر لیا۔ دبی ہوئی چنگاریاں سُلگ اُٹھیں اور مدن موہن تھوڑی سی کشمکش کے بعد ملٹری کی ملازمت کو خیر باد کہہ کر بمبئی لوٹ آئے۔
اب مدن موہن اداکار نہیں، موسیقار بننا چاہتے تھے اور ان کا یہ شوق بھی انتہا کو پہنچ کر جنون کی صورت اختیار کر چکا تھا۔ وہ دن رات نئی، اچھوتی اور سُریلی دھنیں تخلیق کرتے اور مختلف فلمسازوں اور ہدایت کاروں کو سناتے۔ آخر اس میدان میں ان کی کڑی جد وجہد نے رنگ دکھایا اور ان کی ملاقات ایک روز فلمساز وہدایت کار دیویندر گوئل سے ہو گئی، جو اس زمانے میں اپنی پہلی فلم ''آنکھیں'' بنا رہے تھے۔ دیویندر گوئل نے بڑی شدت سے مدن موہن کی تڑپ اور فنکارانہ صلاحیتوں کو محسوس کیا اور ''آنکھیں'' کی موسیقی ان کے سپرد کر دی۔
''آنکھیں'' بنی اور ریلیز بھی ہوئی، مگر کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود مدن موہن کی مسحور کن موسیقی نے عوام کے دلوں کو موہ لیا۔ ''آنکھیں'' فلم کا یہ گیت بے حد مقبول ہوا......

پریت لگا کر میں نے یہ پھل پایا
سُدھ بُدھ کھوئی چین گنوایا

اس طرح مدن موہن کامیاب فلم موسیقار تسلیم کر لئے گئے۔ اب مدن موہن ان راہوں سے گزر چکے تھے جہاں قدم قدم پر کانٹے تھے، مایوسیاں ہی مایوسیاں تھیں، اندھیرے ہی اندھیرے تھے۔ اب اُجالوں کی منزلیں، بہاروں کی حسین وادیاں اور مقبولیت اور کامیاب زندگی کا ایک نیا دور شروع ہو رہا تھا۔

''آنکھیں'' کے بعد مدن موہن نے اپنے منفرد انداز میں رمیش سہگل کی مشہور فلم ''ریلوے پلیٹ فارم'' کی موسیقی ترتیب دی، جس میں ساحر لدھیانوی جیسے مشہور ترقی پسند شاعر نے پہلی بار ان کے ساتھ پُراثر اور معیاری نغمات تحریر کئے۔ ''ریلوے پلیٹ فارم'' کا یہ گیت......

بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارہ
لے کر دل کا اک تارا......

آج بھی فلم بینوں کے ذہنوں میں گونجتا ہے۔

''ریلوے پلیٹ فارم'' کے بعد مدن موہن نے ''آشیانہ، مستانہ، بھائی بھائی، عدالت، دیکھ کبیرا رویا، چھوٹے بابو، اکیلی مت جیئو، وہ کون تھی، اَن پڑھ، حقیقت، نیلا آکاش، آپ کی پرچھائیاں، نیند ہماری خواب تمہارے، میرا سایہ، دُلہن ایک رات کی، غزل، جہاں آرا، نونہال، ہنستے زخم'' وغیرہ بہت سی فلموں میں دل اور روح کی گہرائیوں میں اُتر جانے والی دلنواز اور سحر طراز موسیقی اور اپنے انفرادی انداز سے فلم بینوں کو بہت کچھ دیا۔ ان فلموں کے لگ بھگ تمام گیت عوام وخواص میں یکساں طور پر مقبول ہوئے۔

مت بھول ارے نادان......(مستانہ)
قدر جانے ناموراابالم بیدردی......(بھائی بھائی)
ان کو یہ شکایت ہے کہ......(عدالت)
کون آیا میرے من کے دوارے......(دیکھ کبیرا رویا)
اکیلی مت جیئو......(اکیلی مت جیئو)
جو ہم نے داستاں اپنی سنائی......(وہ کون تھی؟)
اگر مجھ سے محبت ہے......(آپ کی پرچھائیاں)
کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو......(حقیقت)
تو جہاں جہاں چلے گا میرا سایہ......(میرا سایہ)
آپ کی نظروں نے سمجھا پیار کے......(اَن پڑھ)

رنگ اور نور کی بارات کسے پیش کروں...... (غزل)

پھر وہی شام، وہی غم، وہی تنہائی ہے...... (جہاں آراء)

میری آواز سنو...... (نونہال)

تم جو مل گئے ہو تو ایسا لگتا ہے...... (ہنستے زخم)

نغمات کے جادوگر مدن موہن ہندوستانی فن موسیقی کی تمام تر گہرائیوں سے واقف، ایک ایسے موسیقار تھے جو اپنے فن کی کرشمہ سازیوں سے سننے والے کو مسحور کر دیتے تھے۔ فلم کے ماحول، کہانی اور واقعات کے نشیب و فراز کے لحاظ سے موزوں ترین دھنوں کی ترتیب، پس منظر موسیقی میں فنکارانہ کمال اور ہر منظر کو زیادہ سے زیادہ اُبھارنے کے لئے مختلف انداز کے سازوں کا دلکش اور سنجیدہ استعمال مدن موہن کی وہ انفرادی خصوصیت تھی جو ہر کسی کے نصیب میں نہیں ہوتی۔ غرض یہ کہ مدن موہن بلا شبہ ایک بلند پایہ، مکمل اور اچھوتے فلم موسیقار تھے جن کا حیات افروز اور زندگی کی حقیقتوں سے بھرپور فن اُس منزل پر پہنچ چکا تھا جہاں ہر ساز اور سُر اُن کے عظیم موسیقار ہونے کی گواہی دینے لگے تھے۔

مدن موہن نے بعد میں ''اصلیت، چراغ، سودائی، برسات'' اور وسنت جوگلیکر کی فلم ''ایک کلی مسکائی'' کی موسیقی بھی ترتیب دی اور اِن فلموں میں بھی اُن کا جداگانہ انداز اور انفرادی اسلوب، ان کا اپنا مزاج اور اپنا رنگ ہر طرح قائم ہے۔

مدن موہن اپنی زندگی میں بڑے ہی خلیق اور خوش مزاج انسان تھے۔ وہ چھوٹے بڑے کے فرق کے بغیر ہر کسی سے خلوص اور اپنائیت سے یوں ملتے تھے جیسے وہ آپ کے برسوں کے ملاقاتی ہوں۔ ان کے خوبصورت بنگلہ میں داخل ہونے کے بعد بڑی شدت سے یہ احساس جاگتا تھا کہ ہم کسی موسیقار کے نہیں، کسی ملٹری افسر کے گھر میں پہنچ گئے ہیں۔ چاروں طرف سکون اور نظر فریب ترتیب و آرائش۔ جیسے کوئی خاموشی میں سرگوشیاں کر رہا ہو۔

مدن موہن کھیلوں کے بے حد دل دادہ اور شوقین تھے۔ جن دنوں ہندوستان

میں کرکٹ کے ٹیسٹ میچ ہوا کرتے تھے، ان دنوں مدن موہن جی سارا سارا دن ٹرانسسٹر کان سے لگائے گزار دیا کرتے تھے اور کوئی گیت ریکارڈ نہیں کرایا کرتے تھے۔ ایک طرح سے وہ دن ان کا 'ہولی ڈے' ہوا کرتا تھا۔

ایس۔ڈی۔ برمن اور سلیل چودھری مدن موہن کے پسندیدہ موسیقار تھے اور اس پسند کے بارے میں ان کا خیال تھا کہ یہ دونوں فنکار انتہائی حساس جذبات کے مالک ہیں اور فن موسیقی کی تمام تر باریکیوں سے بخوبی واقف ہیں، اور اِن کا اپنا ایک مخصوص انداز ہے جو اِن کی ہر دھن میں جھلکتا ہے اور یہ دونوں ہی فنکار اچھوتی، دلکش اور روح پرور موسیقی ترتیب دینے کی کوشش میں پوری ایمانداری سے لگے رہتے ہیں۔

اسی کے ساتھ ہی مدن موہن مشہور شاعر راجہ مہدی علی خاں کو بھی بہت پسند کرتے تھے اور ان کی زیادہ تر فلموں کے گیت راجہ مہدی علی خاں نے ہی لکھے تھے۔

مدن موہن کے کچھ نغموں کی دُھنیں اُن کے انتقال کی وجہ سے استعمال نہیں ہو سکی تھیں، جو بعد میں فلمساز یش چوپڑہ نے فلم ''ویرزارا'' میں استعمال کیں اور کافی مقبول ہوئیں۔

آج مدن موہن ہمارے درمیان نہیں ہیں۔ ان کی موت ایک حادثہ کے روپ میں ہمارے سامنے آئی اور ہم کو ہندوستان کے ایک عظیم موسیقار سے محروم کر دیا۔ غزل کی موسیقی دینے میں مدن موہن کا کوئی ثانی نہیں تھا اور فلموں میں غزل کا جو ایک نیا انداز مدن موہن نے پیش کیا تھا اس کو دوسرے کئی لوگوں نے اپنانے کی کوشش کی ہے، مگر جو کامیابی مدن موہن کو ملی تھی، وہ آج تک کسی کو نہیں مل سکی۔ ان کی بنائی ہوئی کامیاب دُھنیں آج بھی لوگوں کے ذہن میں محفوظ ہیں اور گونجتی رہتی ہیں۔

OO
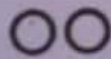
گیتا دت

آزادی سے قبل کے صوبہ بنگال کے ضلع فرید پور کے ایک گاؤں عدلا پور میں ۲۳ نومبر ۱۹۳۰ء کو گیتا رائے کا جنم ہوا۔ یہ علاقہ آج کل بنگلہ دیش میں ہے۔ ان کے والد دیویندر ناتھ چودھری گاؤں کے زمیندار تھے۔ گیتا رائے کی والدہ امیہ رائے چودھری کو موسیقی اور شاعری سے لگاؤ تھا۔ گیتا رائے اپنے دس بہن بھائیوں میں اکیلی ہی ایسی لڑکی تھیں جن کو اپنی ماں کی طرح موسیقی سے خاص لگاؤ تھا۔ اُن کے چھ بھائی اور تین بہنیں تھیں۔ گیتا رائے کی تعلیم اینگلو بنگالی اسکول میں ہو رہی تھی اور اسی کے ساتھ وہ پنڈت ہریندر ناتھ چودھری سے موسیقی کی تعلیم بھی حاصل کر رہی تھیں، جو تقریباً تین سال تک جاری رہی۔

آزادی سے قبل ہی ۱۹۴۲ء میں گیتا رائے کا خاندان بنگال سے بمبئی منتقل ہو گیا اور دادر کی ہندو کالونی میں رہائش اختیار کی۔ یہاں آکر بھی گیتا رائے نے اپنا موسیقی کا ریاض جاری رکھا۔ اُسی بلڈنگ میں موسیقار ہنومان پرساد بھی رہائش پذیر تھے۔ ایک دن بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے انہوں نے گیتا رائے کی سریلی آواز سنی اور وہ اس آواز سے اتنے متاثر ہوئے کہ فوراً گیتا رائے اور ان کے والدین سے ملے اور گیتا رائے کی آواز کی بہت تعریف کی۔ اس کے بعد اکثر وہ گیتا رائے کا ریاض سنتے رہے۔ ۱۹۴۶ء میں موسیقار ہنومان پرساد فلم ''بھگت پرہلاد'' کا میوزک تیار کر رہے تھے۔ تب انہوں نے ایک گانے کے کورس میں گیتا رائے کو شامل کیا اور اس طرح پہلی بار کسی فلمی گانے میں چند لائنیں گانے کا موقع گیتا رائے کو ملا۔ اس کے بعد مشہور موسیقار ایس۔

ڈی۔ برمن کو گیتا رائے کی آواز سننے کا موقع ملا اور انہوں نے فلم ''دو بھائی'' میں گیتا رائے سے گانے ریکارڈ کرانے کا ارادہ کرلیا۔ یہ فلم فلمستان اسٹوڈیو کے لیے بنائی جا رہی تھی، اور اس کے مالک چنی لال جی ایک نئی آواز سے گانے ریکارڈ کرانے کے لیے راضی نہیں تھے، مگر ایس۔ ڈی۔ برمن کے اعتماد کو دیکھتے ہوئے انہوں نے رضامندی دے دی۔ اس طرح گیتا رائے نے پہلی بار فلم ''دو بھائی'' کے لیے ایس۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی میں گانے ریکارڈ کرائے جو بے حد پسند کیے گئے اور برمن دا کا اعتماد صحیح ثابت ہوا۔ بعد میں گیتا رائے ایس۔ ڈی۔ برمن کی پہلی پسند بن گئیں۔ اس طرح گیتا رائے کا فلمی گلوکارہ کے طور پر وہ سفر شروع ہوا جو اگلی تین دہائیوں تک فلمی شائقین کے دلوں کو کبھی گدگداتا رہا اور کبھی اُداسی کے عالم میں اُن کے دل کی ترجمانی کرتا رہا۔

۱۹۴۷ء میں نمائش کے لیے پیش کی گئی فلم ''دو بھائی'' کے گانے ''میرا سندر سپنا بیت گیا'' نے ملک میں دھوم مچا دی تھی اور دوسرے موسیقاروں کو بھی اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ لہٰذا اگلے دو برس میں لگاتار ان کے کامیاب نغموں نے ان کو گلوکارہ راجکماری اور شمشاد بیگم کی صف میں لا کھڑا کیا تھا۔ ۱۹۴۷ء میں انہوں نے موسیقار شیام سندر کے سنگیت پر شمشاد بیگم کے ساتھ ایک دوگانا ریکارڈ کیا..... ''آنکھوں آنکھوں میں دل سے دل کی بات کہہ گئے'' اور اگلے ہی سال گیتا رائے کی آواز موسیقار غلام حیدر کی موسیقی میں دو فلموں ''شہید'' اور ''مجبور'' میں سنائی دی۔

''شہید'' فلم میں اداکارہ کامنی کوشل پر گیتا رائے کا نغمہ ''میں دو دن کی مہمان پیا'' سن کر لوگوں کا دل بھر آیا۔ اسی طرح ۱۹۴۹ء میں بنی فلم ''ناتھ'' میں موسیقار حسن لال بھگت رام کی موسیقی میں گیتا رائے کا ایک گانا ''دُور سے ایک پردیسی آیا'' بھی بہت مقبول ہوا۔ اس کے بعد اگلے کچھ برسوں میں گیتا رائے نے فلم ''امانت، لڑکی، مکھی چوس، پر-ینیتا، پیار، پیار کی باتیں'' اور ''شریمتی جی'' جیسی فلموں میں کئی بہترین نغمے گائے۔ ۱۹۵۰ء میں موسیقار کھیم چند پرکاش نے فلم ''جان پہچان'' کے لیے گیتا رائے سے چھ گانے ریکارڈ کرائے۔ ان میں سے طلعت محمود کے ساتھ گایا دوگانا ''ارمان

بھرے دل کی لگن تیرے لیے ہے'' بے حد مقبول ہوا۔

فلم ''بازی'' کے بعد ۱۹۵۴ء میں فلم ''آر پار'' کے لیے موسیقار او۔ پی۔ نیر نے گیتا رائے کی آواز کی کشش سے بھرپور فائدہ اُٹھایا۔ نیر صاحب اس سے پہلے ہی فلم ''آسمان'' میں گیتا رائے کی گلوکاری کی خوبیوں کو پہچان چکے تھے اور ''جادو بھرے نین'' اور ''دل ہے دیوانہ......'' جیسے نغمے ریکارڈ کرا چکے تھے۔ فلم ''آر پار'' کے لیے او۔ پی۔ نیر نے گیتادت سے بہت ہی شوخی بھرے اور جذباتی گیت گوائے۔ ''یہ لو میں ہاری پیا...... ہوں ابھی میں جواں رے دل...... جا جا جا بے وفا......'' جیسے نغموں میں گیتادت نے ثابت کر دیا کہ وہ صرف غمزدہ گانے سنانے کے لیے ہی نہیں ہیں۔

اس کے بعد او۔ پی۔ نیر اور گیتادت کا ساتھ ایک بار پھر فلم ''مسٹر اینڈ مسز ۵۵'' میں اپنا جادو جگا رہا تھا۔ ''ٹھنڈی ہوا کالی گھٹا...... پریتم آن ملو...... نیلے آسمانی......'' اور محمد رفیع کے ساتھ چار دو گانے گیتادت نے گائے تھے۔ ''جانے کہاں میرا جگر گیا جی...... اُدھر تم حسیں ہو...... دل پر ہوا ایسا جادو......'' اور ''چل دیے بندہ نواز'' جیسے گانوں نے مقبولیت کی بلندیوں کو چھوا۔ ۱۹۵۶ء میں ایک بار پھر فلم ''چھومنتر'' میں گیتا دت کی آواز اور او۔ پی۔ نیر کی موسیقی نے دھوم مچائی۔ محمد رفیع کے ساتھ گیتادت کا گایا دوگانا ''غریب جان کے ہم کو نہ یوں مٹا دینا......'' بے حد مقبول ہوا۔ فلم کے دوسرے دو نغمے ''جب بادل لہرایا......'' اور ''رات نشیلی......'' بھی شائقین نے بے حد پسند کیے۔ اس سب کے علاوہ گیتادت کا جو گیت ۱۹۵۶ء میں سب سے زیادہ مقبول ہوا، وہ تھا...... ''اے دل مجھے بتا دے تو کس پہ آ گیا ہے......'' یہ فلم ''بھائی بھائی'' کا نغمہ تھا۔ گیتادت کی آواز کا جادو ۱۹۵۸ء میں بھی قائم رہا۔ فلم ''ہاوڑا برج'' کا گانا ''میرا نام چن چن چو'' اور فلم ''سادھنا'' کا نغمہ ''تورا منوا کیوں گھبرائے'' بھی کافی مقبول رہے۔

پانچویں دہائی کے آخر تک گیتا رائے بنگالی انداز کی گلوکاری کو کلاسیکل موسیقی کے ساتھ ملا کر خوب مقبول ہوتی رہی اور لوگ سوچنے لگے کہ کیا گیتا رائے اسی دُکھ بھری آواز میں ہمیشہ گاتی رہیں گی۔ تبھی گیتا رائے کی آواز کے نئے انداز نے سب کو چونکا

دیا۔ ۱۹۵۱ء میں ہدایتکار گرودت کی فلم ''بازی'' نے سب کی رائے بدل دی اور یہیں سے گیتا رائے کی نجی زندگی اور اس کے ساتھ ہی فنکارانہ زندگی کا رُخ بھی بدل گیا۔ آواز کی جس کشش کو محسوس کر کے موسیقار ایس۔ ڈی۔ برمن نے فلم ''دو بھائی'' کے دُکھ بھرے نغمے گیتا رائے سے گوائے تھے، انہوں نے آواز کی پختگی اور ورائٹی کو دیکھ کر فلم ''بازی'' میں ان سے مستی بھرے اور جذبات کو مہکانے والے گیت ریکارڈ کرائے۔ ''تدبیر سے بگڑی ہوئی تقدیر بنا لے'' ساحر لدھیانوی کے لکھے اس گیت نے دھوم مچا دی۔ ''سنو گجر کیا گائے'' نے سننے والوں پر جادو کا کام کیا۔ ''یہ کون آیا، آج کی رات پیا، دیکھ کے موہے اکیلی برکھا ستائے رے'' اور ''لاکھ زمانے والے'' بھی کافی مقبول ہوئے۔ فلم ''بازی'' کے گانوں نے دھوم مچا دی اور گیتا رائے کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔

فلم ''بازی'' کی تیاریوں کے درمیان ہی گرودت دل و جان سے گیتا رائے پر فریفتہ ہو گئے تھے اور نہ چاہتے ہوئے بھی گیتا رائے کے والدین نے فلمی دنیا میں جدوجہد کر رہے نوجوان گرودت کے ساتھ گیتا رائے کی منگنی کر دی اور اس طرح دونوں کچھ اور نزدیک آ گئے اور اب گرودت کو شادی کی جلدی تھی۔ گیتا رائے خود بھی گرودت کی قابلیت اور شخصیت سے متاثر تھیں۔ فلم ''بازی'' کی کامیابی کے بعد گرودت کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا تھا۔ انہوں نے کھار کے علاقے میں ایک فلیٹ خرید لیا۔ آخر کار منگنی کے تین سال بعد ۲۶ رمئی ۱۹۵۳ء کو گیتا رائے کی شادی گرودت سے ہو گئی اور وہ گیتا رائے کے بجائے گیتا دت کہلانے لگیں۔ ان کی شادی میں فلمی دنیا کی کئی مشہور ہستیاں دیو آنند، وجینتی مالا، نوتن اور موتی لعل جیسے لوگ شامل ہوئے تھے۔

اس زمانے میں گرودت کے مقابلے گیتا دت ذاتی طور پر بھی اور فیملی بیک گراؤنڈ سے بھی زیادہ مضبوط تھیں۔ لہٰذا بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ گرودت نے معاشی طور پر مضبوطی حاصل کرنے کے لیے گیتا دت سے شادی کی ہے۔ حالانکہ گرودت نے اپنی خودداری اور ضمیر کو کبھی نہیں مرنے دیا اور وہ گیتا دت کو بہت

چاہتے بھی تھے۔ ۹؍جولائی ۱۹۵۴ء کو دونوں کے پیار کی نشانی ان کے بیٹے ورون کا جنم ہوا۔ اس کے بعد کچھ عرصے تک گیتا دت اور گرودت کے ازدواجی حالات کافی بہتر رہے۔ گرودت اپنی فلموں میں کافی مصروف ہو گئے تھے اور دھیرے دھیرے وہ گیتا دت اور اپنے گھر کو وقت کم دینے لگے تھے۔ ۱۹۵۶ء میں گرودت نے فلم ''پیاسہ'' بنائی جس کی ہیروئن وحیدہ رحمٰن تھیں۔ وحیدہ رحمٰن اور گرودت کے معاشقے کی خبریں آئے دن اخبارات کی زینت بننے لگیں۔ اس طرح گیتا دت کے گھریلو حالات بھی دن بہ دن خراب ہوتے گئے اور ان کی گلوکارہ کے طور پر گزر رہی زندگی پر بھی اس کا بُرا اثر پڑا۔ ''پیاسہ'' فلم کی بے حد کامیابی سے گرودت اور وحیدہ رحمٰن کو بہت شہرت ملی۔ اس فلم کے گانے حالانکہ گیتادت نے گائے تھے اور بے حد مقبول ہوئے تھے۔ وحیدہ رحمٰن پر فلمائے گئے ساحر کے نغمے ''جانے کیا تو نے کہی جانے کیا میں نے سنی'' اور ''آج سجن موہے انگ لگا لو جنم سپھل ہو جائے'' نے بڑی دھوم مچائی اور گیتا دت کی شہرت میں بھی اضافہ ہوا۔

اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں گرودت کی فلم ''کاغذ کے پھول'' میں بھی وحیدہ رحمٰن ہیروئن تھیں۔ یہ فلم باکس آفس پر ناکام ہو گئی اور لوگوں نے اس فلم کو بھلا دیا، مگر اس میں گیتادت کے گائے ہوئے گانے ''وقت نے کیا، کیا حسیں ستم'' کو نہیں بھلا پائے۔ اسی سال گیتا دت کے گائے ہوئے دوسری فلموں کے بھی کئی گانے مقبول ہوئے۔ ''ننھی کلی سونے چلی، بچپن کے دن بھی کیا دن تھے، تم جیو ہزاروں سال'' یہ تینوں گانے فلم ''سجاتا'' کے تھے جو کافی مقبول ہوئے۔

مگر اس کے بعد ان کی مقبولیت کا گراف آہستہ آہستہ نیچے آنے لگا۔ وہ اپنی گھریلو زندگی سے انتہائی نامطمئن تھیں اور اس کا اثر ان کی گلوکاری پر واضح طور پر پڑ رہا تھا۔ ۱۹۶۰ء میں فلم ''چودھویں کا چاند'' گرودت کی فلم ہوتے ہوئے بھی گیتا دت صرف ایک کورس گانے ''بالم سے ملن ہوگا'' میں ہی سنائی دیں۔ حالانکہ گرودت کی آخری فلم ''صاحب بیوی اور غلام'' میں مینا کماری پر فلمائے گئے گانوں کو گیتا دت کی آواز نے

ہی زندگی بخشی۔ ہیمنت کمار کی موسیقی میں گیتا دت کے گائے نغموں ''کوئی دُور سے آواز دے چلے آؤ''، ''پیا ایسے جیا میں سمائے گیو رے'' اور ''نہ جاؤ سیاں چھڑا کے بیاں'' جیسے گیتوں نے یہ ثابت کر دیا کہ گیتا دت کی آواز کی کشش اب بھی لوگوں کو متوجہ کرنے اور گدگدانے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ حالانکہ اس فلم کے بعد گیتا دت کی آواز بہت کم ہوتی چلی گئی۔ گرودت سے وہ پہلے ہی علیحدہ ہو گئی تھیں اور ۹را کتوبر ۱۹۶۴ء کو گرودت کی خودکشی کے بعد وہ بالکل ہی ٹوٹ چکی تھیں۔

گرودت اپنی گھریلو زندگی اور فلمی زندگی میں تال میل نہیں بٹھا سکے اور انتہائی مایوسی کے عالم میں شراب اور نیند کی گولیاں بڑی مقدار میں استعمال کرنے کی وجہ سے اپنے ہی فلیٹ میں مردہ پائے گئے۔ اپنے بچوں کی پرورش کرنے اور گھر کو باقاعدگی سے چلانے کے لیے گیتا دت کو گلوکاری سے وابستہ رہنا پڑا۔ شوہر کے انتقال کے بعد گیتا دت نے فلم ''اُس کی کہانی، انوبھو'' اور چند دیگر فلموں کے لیے گانے گائے۔ مگر ان کی مقبولیت روز بروز کم ہوتی چلی گئی۔ ان کے گائے ہوئے نغموں سے بجی کچھ دیگر فلمیں اس طرح ہیں...... ''آب حیات، بھول نہ جانا، پولیس، منیم جی، پاکٹ مار، مسافر خانہ، دِلّی کا ٹھگ، شریمتی ۴۲۰، جاگیر، گیسٹ ہاؤس، لاجونتی، ملاپ'' اور ''سن آف انڈیا'' وغیرہ۔

ہیمنت کمار کے ساتھ گائے ہوئے ان کے کئی دوگانے بہت پسند کیے گئے۔ ایک بنگالی فلم ''بدھوورن'' میں گیتا دت نے اداکاری بھی کی۔ یہ فلم کامیاب رہی تھی۔ بمبئی میں بھی ''تیرا ساتھ ہے پیارا'' اور ''اب کہاں جائیں ہم'' جیسی ہندی فلموں میں انھوں نے کام شروع کیا تھا مگر یہ فلمیں مکمل نہ ہو سکیں۔ خود اُن کے شوہر گرودت نے گیتا دت کو لے کر فلم ''گوری'' بنانی شروع کی تھی مگر بعد میں انھوں نے اس فلم کو ادھورا ہی چھوڑ دیا۔ اس طرح ایک اداکارہ کے طور پر گیتا دت فلم شائقین کے سامنے آتے آتے رہ گئیں۔

عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ جب دو ساتھی فنکار جیون ساتھی بن جاتے ہیں تو

زندگی بہت حسین ہو جاتی ہے۔ مگر کبھی کبھی اس کے نتائج بالکل مختلف روپ میں دنیا کے سامنے آتے ہیں۔ گیتادت اور گرودت کے روپ میں یہ حقیقت کچھ زیادہ ہی بھیانک روپ میں سامنے آئی اور ایک دردناک انجام کو پہنچی، اور گیتادت اپنے ہی گائے ہوئے گانے کے درد میں ڈوبتی چلی گئیں...... "میری پریم کہانی ختم ہوئی، میرے جیون کا سنگیت گیا، میرا سندر سپنا بیت گیا۔"

۲۰ر جولائی ۱۹۷۲ء کو غموں اور دکھوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے گیتادت نے بھی اپنی سانسوں کی ڈور کو توڑ دیا اور دنیاوی زندگی سے مکتی حاصل کر لی۔

OO

ننده

عروس البلاد ممبئی کے ایک ایسے گھرانے میں ننده کا جنم ہوا جو پہلے ہی سے فلمی صنعت سے جڑا ہوا تھا۔ اُن کے والد ماسٹر ونائک کرناٹکی اپنے زمانے کے مراٹھی فلموں کے مشہور و مقبول فلمساز اور ہدایتکار تو تھے ہی، ساتھ میں اداکار بھی تھے۔ اسی خاندان میں فلمساز، ہدایتکار و اداکار وی۔ شانتارام، بھال جی پنڈارکر اور بابوراؤ پنڈارکر جیسے فلمی دُنیا کے مشہور و معروف فنکار بھی تھے۔ ماسٹر ونائک فلمی دُنیا سے تعلق جوڑنے سے پہلے ایک اچھے اُستاد کی حیثیت سے پہچانے جاتے تھے اور یہی وجہ تھی کہ اُن کے خاندان میں تعلیم، علم و ادب اور اخلاقی قدروں کی بڑی اہمیت تھی۔ جب ۸؍جنوری ۱۹۳۹ء کو ماسٹر ونائک کے یہاں ننده کا جنم ہوا تو بڑی خوشیاں منائی گئیں۔ ایسے ہی ادبی اور مہذب ماحول میں ننده کا بچپن گزرا۔

ایک دن اچانک ماسٹر ونائک نے اپنی لاڈلی ننده کو بلا کر کہا کہ تمہیں ایک فلم میں لڑکے کا کردار ادا کرنا ہے۔ معصوم ننده کو یہ بات کچھ عجیب سی لگی کہ وہ جب لڑکی ہے تو لڑکے کا کردار کیوں ادا کرے؟ بلکہ وہ تو فلموں میں اداکاری کرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اُس کا خیال تھا کہ جس طرح نیتاجی سبھاش چندر بوس کی معاون کیپٹن لکشمی بائی ہیں، اُسی طرح کی ایک شخصیت ایک دن ننده کو بننا ہے۔ حالانکہ ماسٹر ونائک نے اپنی بیٹی میں نہ جانے کب اداکارانہ صلاحیتوں اور فنکاریوں کو بھانپ لیا تھا۔ ان کے اصرار پر ننده کی والدہ مناکشی دیوی نے ننده کو سمجھایا اور تب جا کر ننده نے پہلی بار اپنے بال چھوٹے چھوٹے کٹوا کر اور عجیب سا میک اپ کرا کے لڑکے کا کردار فلم ''مندر'' میں کیا۔

اتفاق کی بات یہ ہے کہ اس فلم کی تکمیل کے دوران ہی نندہ کے والد ماسٹر ونائک کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے فرائض نے نندہ کو باقاعدہ فلمی اداکارہ بنا دیا اور فلم میں لڑکے کا رول کرنے والی نندہ گھر کی ذمہ داریوں کو نبھانے کے لیے گھر کا ایک بیٹا بن گئی۔

گھر کے مالی حالات دن بہ دن کمزور ہوتے چلے گئے۔ شیواجی پارک کے جس بنگلے میں یہ لوگ رہتے تھے، وہ فروخت ہوگیا اور گاڑی بھی بیچنی پڑی۔ نندہ کی سب سے چھوٹی بہن اس وقت چھ ماہ کی تھی اور یہ لوگ تاڑدیو میں نندہ کی خالہ کے گھر منتقل ہو گئے۔ اس کے ساتھ ہی نندہ نے باقاعدہ چائلڈ آرٹسٹ کے بطور فلموں میں کام کرنا شروع کر دیا۔

ابتداء میں نندہ نے فلم ''جگّو، شنکر آچاریہ، انگارے'' اور ''جاگرتی'' میں چائلڈ آرٹسٹ کے بطور کام کیا اور ساتھ ہی ریڈیو اور اسٹیج پر بھی پروگرام کرنے لگی۔ نندہ کے چچا وی۔ شانتارام نے ان لوگوں کی کافی دیکھ بھال کی اور خاص طور پر نندہ کی پڑھائی مکمل کرانے میں بڑا تعاون دیا۔

ایک بار نندہ کے خاندان میں شادی کی کوئی تقریب تھی۔ وہاں نندہ کو وی۔ شانتارام نے ایک ہیروئن کے روپ میں پہلی بار دیکھا اور نندہ کی والدہ سے کہا کہ کل اس کو ساڑی پہنا کر اسٹوڈیو لانا۔ اگلے ہی دن وی۔ شانتارام نے نندہ سے تعلیم جاری رکھنے اور مکمل کرنے کی شرط کے ساتھ ہی اپنی فلم ''طوفان اور دیا'' کے لیے بطور ہیروئن منتخب کر لیا۔ اس فلم میں راجندر کمار ہیرو تھے اور یہ فلم ۱۹۵۶ء میں نمائش کے لیے پیش ہوئی۔ راج کمل کی اس فلم کے ہدایتکار پربھات کمار تھے۔ نندہ کی پہلی ہی فلم کامیاب ثابت ہوئی، لہٰذا اُن کو باہر کی فلموں کے آفر بھی آنے شروع ہو گئے تھے۔ اُنہوں نے اپنے چچا وی۔ شانتارام سے کیے ہوئے وعدے کے خلاف تعلیم درمیان میں ہی چھوڑ دی۔ نندہ کے خیال سے گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا اُن کے لیے زیادہ ضروری تھا۔

۱۹۵۶ء میں ہی ''طوفان اور دیا'' کے ساتھ نندہ کی دو اور فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ ''شطرنج'' اور ''دیوگھر''۔ مگر ''طوفان اور دیا'' کی کامیابی نے نندہ کو پلٹ کر دیکھنے کا موقع نہیں دیا۔ لہٰذا ۱۹۵۷ء میں ان کی چار فلموں کی نمائش ہوئی۔ ''ششی گوپال، لکشمی، بھابی'' اور ''بندی''۔ ان چاروں فلموں میں فلم ''بھابی'' کو بڑی کامیابی ملی اور اس طرح نندہ اپنا کیریئر کے ساتھ ساتھ اپنے خاندان کو بھی چلانے میں کامیاب ہوتی جا رہی تھیں، اور اب سلور اسکرین پر لوگ ان کو پہچاننے لگے تھے۔ فلم ''بھابی'' کے لیے نندہ کو بہترین معاون اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ دیا گیا۔ ۱۹۵۸ء میں نندہ کی صرف ایک فلم ''دلہن'' ریلیز ہوئی، مگر اس کے اگلے برس ۱۹۵۹ء میں سات فلموں کی نمائش ہوئی۔ ''برکھا، ذرا بچ کے، قیدی نمبر ۹۱۱، پہلی رات، نیا سنسار، دھول کا پھول'' اور ''چھوٹی بہن''۔ فلم ''چھوٹی بہن'' ایل۔ وی۔ پرساد کی فلم تھی اور اس فلم کا ایک گانا ''بھیا میرے راکھی کے بندھن کو نبھانا......'' بے حد مقبول ہوا تھا۔ اس فلم میں اداکار بلراج ساہنی کی چھوٹی اندھی اور جوان بہن کے کردار میں نندہ کی بے حد تعریف ہوئی اور وہ راتوں رات اسٹار بن گئیں۔ اس کے ساتھ ہی بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''دھول کا پھول'' بھی کامیاب ہوئی اور اس کا فائدہ بھی نندہ کو ملا۔ فلم ''چھوٹی بہن'' نندہ کے لیے میل کا پتھر ثابت ہوئی۔

۱۹۶۰ء میں نندہ کی پھر سات فلمیں نمائش کے لیے پیش ہوئیں۔ ان میں ''اُس نے کہا تھا، قانون، کالا بازار، جو ہوا سو بھول جاؤ، چاند میرے آجا، اپنا گھر'' اور ''آنچل''، فلموں کی ریلیز نے نندہ کو ایک بار پھر شہرت اور مقبولیت کی طرف گامزن کیا۔ فلم ''کالا بازار'' میں نندہ نے دیوآنند کی چھوٹی بہن کا کردار ادا کیا تھا، جو بے حد پسند کیا گیا۔ شوٹنگ کے دوران دیوآنند نے نندہ سے کہا تھا کہ تم ضرور ایک دن بلندی پر جاؤ گی۔ اگلے برس ۱۹۶۱ء میں نندہ کی دو فلمیں ''چار دیواری'' اور ''امر رہے یہ پیار'' ریلیز ہوئیں۔ حالانکہ ''چار دیواری'' میں نندہ کا کردار بہت عمدہ تھا مگر یہ دونوں فلمیں ہی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکیں۔ ۱۹۶۲ء میں ریلیز چار فلموں میں ''مہندی لگی

میرے ہاتھ، عاشق، ہم دونوں'' اور ''اُمید'' میں سے دیوآنند کے ساتھ فلم ''ہم دونوں'' نے بے حد کامیابی حاصل کی۔ یہ فلم نندہ کے لیے ایک خوشگوار موڑ ثابت ہوئی اور وہ ایک اچھی بہن سے اچھی بیوی بن گئی۔ اس فلم میں دیوآنند کا ڈبل رول تھا۔ فوجی کردار میں دیوآنند کی بیوی بنی نندہ، اور ساحر لدھیانوی کے نغمے اور او۔ پی۔ نیر کی موسیقی سے بجی اس فلم کے گانے بے حد مقبول ہوئے۔ اس فلم نے کامیابی کے جھنڈے گاڑ دیے۔ خاص طور پر ہندوستانی افواج کے تینوں شعبوں میں یہ فلم بے حد مقبول ہوئی۔ خصوصی طور پر لفافے میں پرساد ڈال کر بھیجنے والا منظر ہمارے فوجی جوانوں کو بہت جذباتی کر گیا۔ اس برس فلم ''عاشق'' میں نندہ راجکمار کی بیوی بنیں۔ راجکمار نے کہا کہ تم اتنی چھوٹی عمر میں بھی کافی پختہ اداکاری کر لیتی ہو۔ ان فلموں کی کامیابی سے نندہ چھوٹی بہن کی امیج سے باہر نکلیں، مگر اگلے ہی برس فلم ''آج اور کل'' میں بڑی بہن کے کردار میں پھر دکھائی دیں۔ اس فلم میں سنیل دت ان کے ہیرو تھے۔ ۱۹۶۴ء تک وہ اپنی امیج بدلنے کے لیے جدوجہد کرتی رہیں مگر کامیابی کے ساتھ ان کا کیریئر چلتا رہا۔

۱۹۶۵ء نندہ کے فلمی کیریئر کا ایک اور اچھا سال رہا۔ اس برس ان کی چھ فلمیں، ''گمنام، تین دیویاں، محبت اس کو کہتے ہیں، جب جب پھول کھلے، بے داغ'' اور ''آکاش دیپ'' ریلیز ہوئیں۔ فلم ''مہندی لگی میرے ہاتھ'' کے بعد ''گمنام'' اور ''جب جب پھول کھلے'' میں نندہ کو مکمل طور پر ایک رومانی ہیروئن بننے کا بہترین موقع ملا تھا۔ ششی کپور کے ساتھ فلم ''جب جب پھول کھلے'' بے حد کامیاب فلم تھی اور اس فلم میں آنند بخشی کے کئی گیت بے پناہ مقبول ہوئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی فلم ''تین دیویاں'' میں دیوآنند کے ساتھ نندہ نے ہیروئن کا کردار ادا کیا، اور فلم ''آکاش دیپ'' میں دھرمندر کے ساتھ بھی نندہ کو پسند کیا گیا۔ کل ملا کر یہ سال ۱۹۶۵ء نندہ کے لیے زبردست کامیابی لایا تھا۔ اس کے اگلے ہی برس ۱۹۶۶ء میں ششی کپور کے ساتھ فلم ''نیند ہماری خواب تمہارے'' میں نندہ نے پھر ایک رومانٹک ہیروئن کا کردار بخوبی ادا

کیا اور فلم کامیاب ہوئی۔

۱۹۶۹ء میں بی۔آر۔ چوپڑہ کی فلم ''اتفاق'' میں وہ راجیش کھنہ کے ساتھ نظر آئیں۔ یہ بالکل الگ طرح کی فلم تھی۔ اس فلم میں کوئی گانا نہیں تھا اور پوری فلم ایک ہی سیٹ پر فلمائی گئی تھی۔ اس کے ساتھ ہی جتندر کے ساتھ رومانٹک جوڑی میں فلم ''دھرتی کہے پکار کے'' بھی اسی برس آئی اور کامیاب ہوئی اور نندہ کی مقبولیت میں اضافہ ہوا۔ ۱۹۷۰ء میں رمیش بہل کی فلم ''دی ٹرین'' میں راجیش کھنہ کی ہیروئن کے طور پر نندہ نے اپنی اداکاری سے فلم بینوں کو متاثر کیا۔

۱۹۷۱ء میں فلم ''ادھیکار'' اور ۱۹۷۲ء میں منوج کمار کے ساتھ فلم ''شور'' کے کرداروں کو بھی بے حد پسند کیا گیا۔ ۱۹۷۳ء میں ونود مہرہ اور رنجیت کے ساتھ فلم ''نیا نشہ'' میں نندہ بطور ہیروئن آخری بار دکھائی دیں۔ اس فلم میں منشیات کے جال میں پھنسی ایک جوان لڑکی کا کردار نندہ نے ادا کیا۔ یہ فلم اپنے دَور سے آگے کی کہانی بیان کرتی تھی، لہٰذا زیادہ لوگوں کو اپیل نہ کر سکی اور ناکام رہی۔ اس کے ساتھ ہی نندہ فلموں سے دُور ہوتی چلی گئیں۔ اس کے بعد فلم ''چھلیا، اصلیت، جرم اور سزا، پرائشچت، قاتل کون'' اور ۱۹۸۱ء میں فلم ''آہستہ آہستہ'' میں بھی نندہ دکھائی دیں۔ مگر ۱۹۸۲ء میں راج کپور نے نندہ کو فلم ''پریم روگ'' میں کریکٹر ایکٹر کے طور پر اداکارہ پدمنی کولہاپوری کی ماں کا کردار بڑی خوبصورتی سے ادا کرایا۔ اس کے بعد ۱۹۸۳ء میں فلم ''مزدور'' میں دلیپ کمار کی بیوی کا کردار ادا کر کے انہوں نے اپنی ایک دیرینہ خواہش کی تکمیل کی۔ ۱۹۹۱ء میں ''اور ڈھول بجتا رہا''، اور ۱۹۹۵ء میں فلم ''دیا اور طوفان'' میں نندہ آخری بار دکھائی دیں۔ انہوں نے کل ملا کر سرسٹھ فلموں میں اپنی اداکارانہ صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا۔

اداکارہ نندہ نے اپنی تمام زندگی مجرد ہی گزاری۔ سب سے پہلے فلم ''جب جب پھول کھلے'' کی تکمیل کے دوران فلم کے ہدایت کار سورج پرکاش کا جھکاؤ نندہ کی طرف ہوا تھا اور انہوں نے باقاعدہ نندہ کی والدہ میناکشی تک یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ نندہ سے

شادی کرنا چاہتے ہیں۔ مگر ان دنوں نندہ اپنا کیریئر بنانے اور گھریلو ذمہ داریوں کو نبھانے میں بے حد مصروف تھیں، لہٰذا انہوں نے اس رشتہ کو ٹال دیا۔ فلم ''پریم روگ'' سے قبل جب نندہ نے فلموں میں ہیروئن کے بطور کام کرنا بند کر دیا تھا تب راج کپور کے یہاں ایک تقریب میں نندہ کی ملاقات مشہور فلمساز و ہدایتکار منموہن ڈیسائی سے ہوئی اور وہ نندہ کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے۔ حالانکہ منموہن ڈیسائی شادی شدہ تھے اور ان کے بچے بھی تھے، مگر وہ نندہ کو دل سے چاہنے لگے تھے۔ اداکارہ وحیدہ رحمٰن اور ہدایتکار ریش جوہر کی کوششوں سے دونوں نے شادی کا فیصلہ بھی کر لیا اور ۱۹۹۲ء میں دونوں کی منگنی بھی ہو گئی، مگر ہوتا وہی ہے جو قدرت چاہتی ہے۔ ۱۹۹۴ء میں منموہن ڈیسائی کی بالکنی سے گرنے پر موت واقع ہو گئی اور نندہ کا دلہن بننے کا خواب چکناچور ہو گیا۔ اس کے ایک برس بعد ہی نندہ کی والدہ کا کینسر کے مرض میں انتقال ہو گیا اور نندہ نے باقی زندگی بھی اکیلے ہی گزار دی۔

نندہ کو سب سے پہلے ۱۹۵۷ء میں فلم ''بھابی'' کے کردار میں بہترین اداکارہ کے لیے ''فلم فیئر ایوارڈ'' کے لیے نامزد کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۰ء میں فلم ''آنچل'' میں بہترین اداکارہ کے لیے معاون اداکارہ کا فلم فیئر ایوارڈ سے نندہ کو نوازا گیا۔ بعد ازآں ۱۹۶۹ء میں فلم ''اتفاق'' اور ۱۹۸۱ء میں فلم ''آہستہ آہستہ'' اور آخر میں ۱۹۸۲ء میں فلم ''پریم روگ'' میں بہترین اداکاری کے لیے معاون اداکارہ کے طور پر نندہ کو فلم فیئر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔

اداکارہ نندہ کی سب سے زیادہ دوستی نرگس، وحیدہ رحمٰن اور آشا پاریکھ سے رہی۔ ان کے علاوہ سادھنا، مالا سنہا، شکیلہ، جیس جلیل، اور آخر میں سائرہ بانو سے بہت قریب رہیں۔ نندہ نے بہت سادگی سے زندگی بسر کی، وہ دولت کے پیچھے بھاگنے والوں میں سے نہیں تھیں بلکہ اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے میں ہی زندگی گزار دی۔ شوٹنگ کے دوران ہمیشہ وقت کی پابندی کے علاوہ سیٹ پر اپنے ساتھی اداکاروں کے ساتھ تعاون کرتی تھیں اور ایک فنکار کی طرح پیشہ ورانہ تعلق خوبصورتی سے نباہتی تھیں۔ نندہ

نے کئی ایسے اداکاروں کے ساتھ اُس وقت کام کرنا منظور کیا جب ان کی کامیابی کا گراف نیچے جا رہا تھا، مگر بعد میں انہوں نے پھر سے مقبولیت حاصل کی۔ ششی کپور، منوج کمار، جتندر، ونود مہرہ اس کی مثالیں ہیں۔

تقریباً ۷۵ ربرس کی عمر میں ۲۵ رمارچ ۲۰۱۴ء کی صبح سات بجے جب نندہ باتھ روم سے باہر نکلیں، تب انہیں دل کا دورہ پڑا، اور وہ حرکت قلب بند ہو جانے کی وجہ سے انتقال کر گئیں۔ اداکارہ نندہ کو ان کی کئی یادگار فلموں کے لیے ہمیشہ یاد کیا جاتا رہے گا۔

○○

بلراج ساھنی

پنجاب نے جہاں زندگی کے دوسرے شعبوں میں بڑے بڑے فنکار پیدا کئے ہیں، فلمی دنیا کے لئے بھی کئی اہم ستون بخشے ہیں۔ پرتھوی راجکپور، دلیپ کمار، راجکپور، دھرمیندر، راج کھوسلہ، بی۔ آر چوپڑہ، یش چوپڑہ، راجندر سنگھ بیدی وغیرہ کے نام فلمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔ اُسی پنجاب نے، چاہے وہ پاکستان کا پنجاب ہو یا ہندوستان کا پنجاب...... یا ہم یوں کہیں کہ غیر منقسم پنجاب نے ایک بہت بڑے فنکار کو جنم دیا یکم مئی ۱۹۱۳ء کو راولپنڈی میں۔ فلمی دنیا کا یہ اہم ستون تھا بلراج ساہنی۔

بلراج ساہنی کی زندگی کی کہانی بھی اپنے آپ میں ایک عجیب وغریب داستان ہے...... بڑی سادہ سی زندگی، مگر کتنی جدوجہد بھری۔ انہوں نے انگریزی مضمون میں ایم۔ اے کیا۔ ملازمت کرنا بلراج ساہنی کو کبھی پسند نہیں آیا۔ ان کی دلچسپی تجارت کرنے میں تھی۔ لہٰذا انہوں نے ایم۔ اے کرنے کے بعد دو سال تک چھوٹی موٹی تجارت کرنے کے بعد اپنا خیال بدل دیا، اور یہ نتیجہ نکالا کہ تجارت ان کے بس کا روگ نہیں ہے۔ بلراج ساہنی بنیادی طور پر نرم مزاج اور سادہ دل قسم کے ایک سچے انسان تھے۔ ان کو تجارتی لوگوں کے رنگ ڈھنگ اور چالبازیاں بالکل پسند نہیں آئیں۔ لہٰذا انہوں نے تجارت کرنے کا فتور اپنے دماغ سے یکسر نکال دیا۔

تھوڑے ہی دن کی جدوجہد کے بعد بلراج ساہنی کو شانتی نکیتن میں ہندی کے معلم کی حیثیت سے بلایا گیا۔ شانتی نکیتن کا ماحول بلراج کے مزاج کے عین مطابق تھا۔ وہاں پہنچ کر بلراج کے دل نے گواہی دی کہ یہی زندگی ہے جو وہ جینا چاہتا ہے۔ شروع

شروع میں شانتی نکیتن کے پُرسکون ماحول میں بلراج ساہنی کا دل خوب لگا۔ مگر جلد ہی وہ وہاں کی یکسانیت اور موسیقی ریز ادبی ماحول سے اکتا گئے۔ ان کو وہاں کی شانت اور پُرسکون زندگی سے الجھن سی ہونے لگی۔ کیونکہ ان کے دل میں کچھ کر گزرنے کا ارمان جوش مار رہا تھا۔ بلراج ساہنی کے دل میں ملک وقوم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دینے کا جذبہ موجزن تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے ملک کی روح ہندوستان کی آتما اُن کو اپنی طرف بلا رہی ہے۔ ملک وقوم کی اس آواز پر بلراج ساہنی مہاتما گاندی کے پاس وردھا جا پہنچے۔ وردھا پہنچ کر انہوں نے رسالہ ''نئی تعلیم'' کی ادارت اپنے ذمہ لے لی۔ ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے تھے کہ بلراج ساہنی کو بی۔ بی۔ سی لندن سے مراسلہ ملا کہ ان کا انتخاب بی۔ بی۔ سی کی ہندی سروس میں اناؤنسر کی حیثیت سے ہو گیا ہے۔ اس طرح بلراج ساہنی پورے چار برس تک ملک سے باہر رہ کر ملک کی ایک اہم اور نا قابل ستائش خدمت انجام دیتے رہے اور یہ چار برس بلراجِ ساہنی کی زندگی میں بڑے عجیب گزرے اور ان کی زندگی کے لئے اہم بھی۔

یہاں ہندوستان میں چل رہی آزادی کی لڑائی میں شامل نہ ہونا اب ان کے بس کی بات نہ رہی تھی۔ لہٰذا وہ اس جنگِ آزادی میں اپنے ہم وطنوں کے کندھے سے کندھا ملا کر لڑنے کے لئے وطن واپس چلے آئے۔ یہاں آ کر انہوں نے ''لوک ناٹیہ منچ'' کی ذمہ داریاں قبول کر لیں۔ یہ بھی ایک طریقہ تھا عام لوگوں سے وابستہ ہونے اور عام زندگی سے قریب رہنے کا۔ ناٹک یا ڈرامہ کے ذریعہ ایک عام آدمی سے اداکار یا فنکار کا کتنا گہرا تعلق ہوتا ہے، یہ بات بلراج ساہنی کو بہت اچھی طرح معلوم تھی، اور وہ یہی کر بھی رہے تھے۔ ڈراموں سے ان کو اتنا لگاؤ تھا کہ رات دن سوتے جاگتے بس ڈراموں کی ہی باتیں ان کی گفتگو کا موضوع ہوتی تھیں۔ اس کے ساتھ ہی وہ تحریک آزادی میں بھی برابر حصہ لیتے رہے اور ہر طرح سے کانگریس کے ایک اہم اور سرگرم رکن رہے۔ اسی دوران بلراج ساہنی کا ذہن فلموں کی طرف متوجہ ہوا، اور انہوں نے فلموں سے وابستہ ہونے کا مصمم ارادہ کر لیا۔

جب بلراج ساہنی پوری طرح فلموں سے وابستہ ہو گئے اور انہوں نے اپنے آپ کو مکمل طور پر فلموں میں ملوث پایا تو اس زمانے میں چند بڑے اچھے اور قابل فلمساز اور ہدایتکار فلمی دنیا میں موجود تھے۔ یہ بلراج ساہنی کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو ہمیشہ قابل اور سلجھے ہوئے ہدایتکار اور فلمساز ملے۔ یہی وجہ ہے کہ فلمی آسمان پر بلراج ساہنی کا نام اس روشن ستارہ کی طرح جگمگایا جس سے لوگ دشاؤں کا گیان حاصل کرتے ہیں۔

"ہیرا موتی، دو بیگھہ زمین، ہم لوگ، کابلی والا، گرم ہوا، ہنستے زخم، حقیقت" وغیرہ کچھ ایسی فلمیں ہیں جن میں بلراج ساہنی نے اپنی فنی صلاحیتوں سے ان سب کرداروں کو زندگی بخشی جو اِن فلموں میں انہوں نے پیش کئے۔ یہ چند ایسی فلمیں ہیں جن کی وجہ سے بلراج ساہنی کو فلمی تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اس سلسلے کا ایک واقعہ پیش ہے جو بلراج ساہنی نے اپنی کتاب "یادیں" میں تحریر کیا ہے، بلراج ساہنی کسی فلم کی شوٹنگ کے لئے چنڈی گڑھ آئے ہوئے تھے۔ آؤٹ ڈور کا کام تھا اور فلم کا سارا یونٹ ایک رات کسی امیر دوست کے گھر پارٹی میں مصروف تھا۔ بڑے زوروں کی محفل جمی ہوئی تھی۔ پنجابی مہمان نوازی، پنجابی حسن، پنجابی ہنسی مذاق اپنے شباب پر تھا۔ مارچ کے مہینے کا بے حد سہانہ موسم تھا۔ دن بھر تمام یونٹ نے شوالک پہاڑیوں کے آنچل میں شوٹنگ کی تھی اور بڑے حسین شاٹ لئے تھے۔ اسکاچ کے گھونٹ بھرتے ہوئے دن بھر کی تھکاوٹ میں بھی بڑا سرور محسوس ہو رہا تھا۔ ڈرائنگ روم بھی دوشیزاؤں سے دہک رہا تھا۔ ایسے ماحول میں بلراج ساہنی کے ایک دوست نے آکر کان میں کہا۔ "بلی! باہر ایک آدمی کھڑا ہے تم سے ملنے کے لئے۔ ذرا ایک منٹ باہر جا کر اُسے درشن دے آؤ۔"

"یہ نہیں ہوگا۔" بلراج نے کہا۔ "آج کے دن میں ساری ڈیوٹیاں ادا کر چکا ہوں۔ اب اپنے نجی وقت پر مجھے مکمل اختیار حاصل ہے اور اس کا پورا پورا مزہ لینا چاہتا ہوں۔ تم اس سے کہہ دو کہ کل صبح مجھے ہوٹل میں آکر ملے۔"

"میری درخواست ہے بلی۔ وہ شام پانچ بجے کے پہلے سے ہی میری کوٹھی پر

تھا اور اب اس کوٹھی کے باہر کھڑا ہے۔" دوستوں میں سب ان کو بلی کہتے تھے۔

دوست کی اس درخواست پر بلراج ساہنی بڑی بے دلی کے ساتھ باہر آئے۔ دودھیا چاندنی میں چمک رہے سیمنٹ کے فرش پر کھڑے کچھ لوگوں کی ٹولی کے ساتھ بگھی پر پلاسٹک کے پُتلے کی طرح اوم پرکاش بیٹھا ہوا تھا۔ بلراج کو دیکھ کر اس نے فوجی ڈھنگ سے سلام کیا، جس کا مطلب بلراج ساہنی سمجھ نہ پائے۔ ان کو یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اتنے لوگوں میں ان کو کس سے ملنا ہے۔ قریب جا کر وہ ان سب لوگوں سے ہاتھ ملانے لگے، اور اوم پرکاش بگھی پر بیٹھا ہوا ہی بولا۔ "کیا ہم بھی میجر رَن وِیر سنگھ صاحب کے ساتھ ہاتھ ملا سکتے ہیں؟" اتنا کہہ کر وہ کھلکھلا کر ہنس پڑا۔

بلراج ساہنی کو حیرت ہوئی تھی اور اس کو بغیر ٹانگوں کے دیکھ کر ہمدردی بھی۔ ایک خیال ان کے دماغ میں یہ بھی آیا کہ یہ لوگ کہیں ان کے ساتھ مذاق تو نہیں کر رہے۔

"کون میجر رن ویر سنگھ؟" بلراج ساہنی نے حیرت سے پوچھا۔

"حقیقت" کے رن ویر سنگھ، اور کون؟" وہ پھر اسی طرح ہنسا۔

اب بلراج جی کو یاد آیا کہ فلم "حقیقت" میں انہوں نے ایک فوجی میجر رن ویر سنگھ کا کردار ادا کیا تھا۔ حالانکہ بات کافی پُرانی ہو گئی تھی مگر اس وقت اوم پرکاش کے ان الفاظ سے بلراج جی کو خوشی ضرور ہوئی تھی۔

"میں نے تین بار دیکھی تھی صاحب وہ پکچر۔ چوتھی بار اپنی ماں کو ساتھ لے کر دیکھنا چاہتا تھا، مگر میرے پاس پیسے نہیں تھے۔" اوم پرکاش نے پھر کہا۔

"اتنی زیادہ پسند آئی تمہیں۔" بلراج جی نے رسمی طور پر پوچھا۔

"کیسے نہ آتی صاحب، ہم بھی تو لڑے ہیں چینیوں کے ساتھ۔ آپ میجر ٹھہرے، ہم ایک معمولی سپاہی سہی۔"

اس کی طنزیہ ہنسی اور لکڑی کی ٹانگوں کی اصلیت جان کر بلراج جی حیرت زدہ رہ گئے۔ ایک فوجی جوان جس نے جنگ میں دونوں ٹانگیں کھوئی تھیں، اُن سے ملنے کے لئے چار گھنٹے سے انتظار کر رہا تھا۔ ان کو بڑی شرمندگی محسوس ہوئی۔

''تم نے مجھے اطلاع کیوں نہیں دی کہ تم فوجی جوان ہو؟'' بلراج ساہنی نے پوچھا۔
''بتا کر ملنے میں نہیں، بلکہ مل کر بتانے میں مزہ ہے میجر صاحب۔'' اس نے کہا۔
''مجھے بار بار میجر کہہ کر شرمندہ نہ کرو، خدا کا واسطہ ہے۔'' بلراج ساہنی نے عاجزی سے کہا۔

''آپ اپنی قیمت ہمارے دل سے پوچھیے۔'' اوم پرکاش نے کہا۔ اس کی باتوں میں کتنی حقیقت تھی، کتنی ایکٹنگ تھی، بلراج جی کو اندازہ نہیں ہو رہا تھا۔

ایکٹنگ میں بھی مجبوری کا جزو ہوتا ہے۔ عورت ہمارے سماج میں مجبور ہے، اس لئے اپنی خواہشوں کو تہوں میں لپیٹ کر رکھتی ہے۔ وہ اپنی ہار میں بھی جیت کا مزہ لینے کی کوشش کرتی ہے۔ بلراج بھی اگر اس وقت مجبور نہ ہوتے تو بغیر ہچکچاہٹ اس بہادر نوجوان کو پوری عزت کے ساتھ پارٹی میں اندر لے جاتے اور اس سے ہاتھ ملانا ہر کسی کے لئے فخر کی بات ہوتی۔ اس کی بدولت پارٹی کو چار چاند لگ جاتے۔ مگر وہ صرف ایسا سوچ سکتے تھے کیونکہ اپنی سوچ پر عمل نہ کرنے کے لئے وہ مجبور تھے۔ اپنے جذبات کو قابو میں کرتے ہوئے انہوں نے جوان سے اتنا ہی کہا۔ ''میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتانا۔''

''وہ تو ابھی بتائے دیتا ہوں۔ آپ منظور کریں گے؟ میرا گھر یہاں سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہے۔ ذرا چل کر میری ماں سے مل لیجئے، آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔'' اوم پرکاش نے بلا تکلف کہہ دیا۔

بلراج جی اسی وقت اپنی رنگین اور پُرشباب پارٹی چھوڑ کر دوستوں کے منع کرنے کے باوجود اس جوان کے ساتھ اس کی خوشی کے لئے اس کے گھر روانہ ہو گئے۔

بلراج جی کی زندگی میں اس قسم کے ہزاروں واقعات بھرے پڑے ہیں جن کو قلمبند کرنے کی نہ تو یہاں گنجائش ہے اور نہ ہی ضرورت۔ کیونکہ وہ ہر لحاظ سے ایک نیک دل اور سادہ لوح انسان تھے، اور ایسے ہی کردار انہوں نے فلمی پردے پر اپنی فنکارانہ صلاحیتوں سے اُجاگر کئے تھے۔

فلموں سے وابستہ ہوکر بھی بلراج ساہنی کی دیش بھگتی اور قوم پرستی میں کوئی کمی نہیں آئی۔ انہوں نے اپنے ہم خیال لوگوں کے ساتھ مل کر عوام کے درمیان خدمت خلق کا کام جاری رکھا۔ ان کے ساتھیوں میں راجندر سنگھ بیدی، خواجہ احمد عباس، کیفی اعظمی اور رشی کیش مکرجی کے نام خاص طور پر لئے جا سکتے ہیں۔ بلراج ساہنی نے ان دنوں ایسی ہی فلموں میں کام کیا۔ ''گرم کوٹ، فٹ پاتھ، وقت'' اور ''حقیقت'' وغیرہ فلموں کی کہانی مکمل طور پر سچائی سے بھری زندگیوں کی ہی کہانیاں تھیں۔ اسی لئے ان فلموں کو نہ صرف ہندوستان میں بلکہ غیر ممالک میں بھی شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ ان فلموں کو فلم بینوں کے ہر طبقہ نے سراہا۔ سماجوادی ممالک میں شاید پہلی بار ان ہی فلموں نے نمائندگی کی اور ان فلموں سے ہندوستان کی عزت افزائی ہوئی۔ حالانکہ ان فلموں نے تجارتی نقطہ نگاہ سے کوئی خاص کامیابی حاصل نہیں کی۔ بلراج ساہنی نے پھر بھی اپنی آخری سانسوں تک ہار نہیں مانی اور ہمیشہ اس کوشش میں لگے رہے کہ ایسی فلموں میں کام کریں جن میں دولت کمانے کا مقصد نہ ہوکر انسانیت کی قیمت اور اہمیت کو ترجیح دی گئی ہو۔

اس سلسلے میں ایک واقعہ اور یاد آیا۔ اُن دنوں ترلوک جیٹھلی ''گودان'' بنانے کی تیاری میں تھے۔ انہوں نے ہیرو کے کردار کے لئے بلراج جی سے رابطہ قائم کرنا چاہا۔ اتفاق سے اُس وقت بلراج ساہنی شہر سے باہر گئے ہوئے تھے۔ اُن کی غیر موجودگی میں سکریٹری نے یہ پیشکش ٹھکرادی۔ ہار کر جیٹھلی نے کسی دوسرے اداکار کو اس کردار کے لئے سائن کرلیا۔

بلراج جی جب واپس آئے تو انہیں اس بات کا علم ہوا۔ ان کو بہت افسوس ہوا۔ دراصل بلراج ساہنی کو پریم چند کے ناول ''گودان'' کا یہ کردار ''ہوری'' بہت پسند تھا۔ اس کردار کے ساتھ بلراج جی نے ہندوستان کے غریب عوام اور ان کی تڑپ کو دل سے محسوس کیا تھا۔

بلراج ساہنی اپنی آمدنی کا ایک مخصوص حصہ ہمیشہ غریبوں اور ضرورتمندوں میں

تقسیم کیا کرتے تھے۔ بلراج جی نے فلمی کرداروں میں بھی ورائیٹی ملتی ہے۔ ''دو بیگھہ زمین'' میں رکشہ چلانے والے کا کردار، ''تلاش'' میں ایک کروڑ پتی تجارتی آدمی کا کردار اور ''سنگھرش'' میں گنپتی پرساد کا کردار، جس کی آنکھوں میں ہر وقت نفرت اور بدلے کی آگ بھڑکتی رہتی ہے، ''کابلی والا'' کا بھولا بھالا پٹھان جس کی نگاہیں محبت اور خلوص و ہمدردی سے ہمیشہ بوجھل رہتی ہیں۔ ''گرم ہوا'' میں جوتے بنانے والے ایک مسلم کاریگر کا کردار کون بھلا سکتا ہے۔ ''حقیقت'' میں میجر کا کردار اور اسی طرح کے بہت سے مختلف کردار جن کو بلراج ساہنی نے زندگی بخشی۔ وہ اپنے آپ کو کردار میں اتنا ملوث کرلیا کرتے تھے، کہ بلراج ساہنی کا پردے پر کہیں نام ونشان نہیں ملتا تھا۔ صرف کردار ہی رہ جاتا تھا۔

بلراج ساہنی کی شخصیت کا ایک روشن پہلو یہ بھی ہے کہ وہ ایک بہترین اور سلجھے ہوئے ترقی پسند مصنف بھی تھے۔ انہوں نے ہندی، انگریزی اور پنجابی ادب کو بہت یادگار تخلیقات بخشی ہیں۔ ''میری غیرجذباتی ڈائری، یورپ کے واسی، میرا پاکستانی سفرنامہ'' اور ''یادیں'' کافی مقبول کتابیں ہیں۔ فلم اور اسٹیج کے موضوع پر بھی انہوں نے ''سنیما اور اسٹیج'' اور ''میری فلمی آتم کتھا'' تصنیف کیں۔

اس میں دو رائے نہیں ہو سکتیں کہ بلراج ساہنی اداکاری کی دنیا میں ایک ایسا خلاء چھوڑ گئے ہیں جس کو پُر کرنا برسوں تک ہندوستانی فنکاروں کے بس کی بات نہیں۔

○○

سنجیو کمار

کبھی کبھی وقت کی رفتار اتنی تیز ہوتی ہے کہ پیچھے مڑ کر دیکھنے کی مہلت ہی نہیں دیتی اور جب کچھ لمحوں کے لئے ذرا سی مہلت ملتی ہے اور ہم پیچھے مڑ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ارے! یہ تو ایک دور گزر گیا۔ ایک یگ بیت گیا۔ کچھ لوگ اپنے آپ میں ہی ایک پورا دَور ہوتے ہیں مگر وہ جب ہمارے درمیان ہوتے ہیں تو ہمیں اس بات کا احساس کم ہی ہوتا ہے کہ ہم ایک دور کے ساتھ، ایک یگ کے ساتھ رہ رہے ہیں...... اور جب وہ ہمارے درمیان نہیں رہتے تو ہمیں ایک ڈر، ایک خوف کا احساس ہوتا ہے کہ کتنے چپکے سے، کتنے دھیمے سے ایک پورا دُور ہمارے درمیان سے کھسک گیا، رخصت ہو گیا۔

ایسی ہی ایک شخصیت ہماری فلمی دنیا سے اچانک غائب ہو گئی، ایسا لگتا ہے جیسے قدرت کے مضبوط ہاتھوں نے ہماری سب کی کھلی آنکھوں کے سامنے سے اس کا اغوا کر لیا ہو۔

ابھی کل کی سی بات لگتی ہے کہ ایک آواز کی گونج سارے ہندوستان میں سنائی دی تھی۔ ''شعلے'' کے ٹھاکر کی گرجدار آواز...... ''گبّر سے کہنا، رام گڑھ والوں نے اس کے کتوں کے آگے ہڈی ڈالنا بند کر دیا ہے۔'' اور اس کے ساتھ ہی ''آندھی'' فلم کی وہ نرم اور محبت کے جذبے سے سرشار آواز...... ''اس بار اماوس کچھ زیادہ ہی لمبی ہو گئی ہے۔'' یہ تضاد نہیں بلکہ ایک عظیم فنکار کی اداکارانہ صلاحیتوں کا منہ بولتا ثبوت ہے...... اور وہ عظیم فنکار تھا سنجیو کمار...... ہاں یہ کل ہی کی بات لگتی ہے کہ سنجیو کمار اپنی بے پناہ

اداکارانہ صلاحیتوں کے ساتھ ہندوستانی پردۂ فلم پر نمودار ہوا تھا اور پھر پورن ماسی کے چاند کی طرح پورے فلم آکاش پر چھا گیا تھا۔ مگر اماوس کی ایک ہی کالی رات نے اس چاند کو ہم سے چھین لیا...... ۶ر نومبر ۱۹۸۵ء کی اماوس کتنی ظالم ثابت ہوئی تھی۔

۹ر جولائی ۱۹۳۷ء کو گجرات کے سورت شہر میں ہری زری والا کا جنم ایک ایسے خاندان میں ہوا، جو یوں تو متوسط تھا مگر ایسا نہیں کہ یہ کہا جائے بہت بڑے خاندان میں ایسا ہوا ہو، ایسا بالکل نہیں تھا۔ عام بچوں کی طرح ان کی بھی تعلیم ہوئی اور اسی تعلیمی دور میں ہی ہری زری والا کو اسٹیج کا شوق پیدا ہو گیا۔ لہٰذا اپنے اداکاری کو جوہر عوام کے سامنے پیش کرنے کے لئے انہوں نے کئی اسٹیج پروگراموں میں حصّہ لیا مگر یہ بھی اتنا آسان نہیں تھا۔ سب سے پہلے ہری زری والا کی حیثیت اسٹیج پر صرف یہ تھی کہ سین شروع ہونے سے پہلے پردہ اٹھا دیا اور سین ختم ہونے پر پردہ گرا دیا۔ اسی دوران ایک گجراتی ڈرامہ اسٹیج پر پیش کیا جا رہا تھا کہ اس کا ایک اہم اداکار وہاں نہیں پہنچ سکا۔ ہری زری والا نے ڈرامے کے ہدایتکار سے خواہش ظاہر کی کہ اگر وہ اجازت دیں تو اس غیر حاضر اداکار کا کردار وہ خود ادا کر دیں۔ مگر اس ہدایتکار نے ان کو جھڑک دیا۔ اس وقت اس ہدایت کار کو کیا معلوم تھا کہ وہ مستقبل کے ایک عظیم فنکار کو جھڑک رہا ہے۔

اپنی اس پہلی ناکامی پر ہری زری والا کافی روئے تھے مگر وہیں سے ایک عزم، ایک حوصلہ ان کے اندر پیدا ہو گیا، ایک تحریک ملی اس نوجوان کو۔ پھر ایک مستقل جدوجہد کے بعد انہوں نے گجراتی اور ہندی ڈراموں میں اپنا ایک مقام بنا کر فلموں کے لئے جدوجہد شروع کر دی اور کئی فلموں میں جونیئر آرٹسٹ کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد سب سے پہلے ہومی واڈیا کی فلم ''نشان'' میں ہم نے اس نوجوان کو ہیرو کی حیثیت سے سنجیو کمار کے نام سے پہچانا۔

فلم ''سنگھرش'' کے اس پنڈت گھرانے کے نوجوان بھائی کو لوگ بھولے نہیں تھے کہ فلم ''کھلونا'' میں ایک پاگل کا کردار ادا کر کے سنجیو کمار نے سب کو چونکا دیا۔ اپنی بے پناہ اداکارانہ صلاحیتوں کی وجہ سے سنجیو کمار نے ثابت کر دیا کہ بہترین اداکار ہونے

کے لئے کسی کا بھی اسٹار ہونا ضروری نہیں ہے۔ اداکار اور اسٹار دو مختلف زاویے ہیں۔ لہٰذا فلم ''کوشش'' اور ''دستک'' میں بہترین اداکاری کے لئے ان کو نیشنل ایوارڈ سے نوازا گیا، اور گلزار جیسے باصلاحیت ہدایتکار نے اُن کو اپنی فلموں کے بہترین کرداروں میں پیش کیا۔ ''موسم، آندھی، کوشش، پریچے، انگور، اور نمکین'' وغیرہ اس کی مثالیں ہیں۔

۱۹۷۴ء میں جب میں نے کمال امروہوی سے امروہہ کے ان کے گھر کے آنگن میں انٹرویو کرتے ہوئے معلوم کیا کہ آپ کا پسندیدہ اداکار کون ہے؟ تو ان کا برجستہ جواب تھا...... ''اداکاری کے لحاظ سے اشوک کمار اور ان کے بعد سنجیو کمار......'' حالانکہ کمال امروہوی نے اپنی کسی بھی فلم میں سنجیو کمار کو ہیرو نہیں لیا مگر وہ سنجیو کمار کی اداکارانہ صلاحیتوں کے قائل تھے۔ یہ بات بھی شاید کم ہی لوگوں کو معلوم ہے کہ فلم ''پاکیزہ'' میں سلیم احمد خاں کا کردار پہلے سنجیو کمار کو ہی دیا گیا تھا، جسے بعد میں راجکمار نے ادا کیا۔

سنجیو کمار نے اپنی ۴۸ سالہ زندگی کے دن بڑی جدوجہد میں گزارے تھے، اور والد کی موت کے بعد تو یہ جدوجہد اپنی تمام تر ذمہ داریوں کے ساتھ کچھ زیادہ ہی بڑھ گئی تھی۔ دس بہن بھائیوں کی ذمہ داری کچھ کم تو نہیں ہوتی مگر قدرت کی مہربانیاں بھی ساتھ تھیں اور ماں کی دُعائیں بھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب سنجیو کمار کی کامیابیوں کا دور شروع ہوا تو ان کو پیچھے مڑ کر دیکھنے کا بھی وقت نہیں ملا۔ وہ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور ماں کو ہمیشہ ساتھ ہی رکھتے تھے۔ پانچ سال قبل ہی اسی تاریخ ۶ رنومبر کو سنجیو کمار کی ماں کا انتقال ہوا تھا اور اس حادثہ نے سنجیو کمار کو توڑ کر رکھ دیا تھا۔ کچھ ہی دنوں بعد اپنے چھوٹے بھائی بابا کی اچانک موت سے وہ بالکل بکھر گئے تھے اور ایک دم تنہا ہو گئے تھے اور آخر کار یہ تنہائی ہی ان کی زندگی کا سب سے بڑا مرض ثابت ہوئی اور وہ دل کے عارضہ میں مبتلا ہو گئے۔ کچھ ہی دن پہلے وہ نیویارک میں اپنے دل کا علاج کرا کر واپس ہندوستان آئے تھے اور ان کی صحت یابی کی خوشی میں فلمساز وہدایتکار آر۔ کے۔ نیر نے ہوٹل سن اینڈ سینڈ میں ایک شاندار پارٹی کی تھی اور لوگوں نے دیکھا تھا کہ وہ موت سے پنجہ لڑا کر اور موت کو شکست دے کر کتنے خوش تھے، ہاں یہ ضرور ہوا تھا کہ اسی پنجے

بازی کے چکر میں ان کا ساٹھ پونڈ وزن کم ہو گیا تھا اور یہ اندازہ لگانا مشکل ہو رہا تھا کہ یہ وہی سنجیو کمار ہیں جنھوں نے ''ترشول'' میں امیتابھ بچن کے باپ کا کردار ادا کیا ہے۔

سنجیو کمار کی اداکاری میں گرودت کا اثر کافی تھا اور وہ اس بات کو مانتے بھی تھے۔ یہی وجہ تھی کہ گرودت کے انتقال کے بعد مرحوم کے۔آصف کے سامنے ''محبت اور خدا'' کے ہیرو کا مسئلہ آیا تو انہوں نے بلا جھجک سنجیو کمار کا انتخاب کر لیا، اور کتنی عجیب بات ہے کہ پالی ہل کے اسی بنگلہ میں گرودت نے اپنی زندگی کی آخری سانس لی تھی...... اور اس سے بھی عجیب بات یہ ہے کہ کے۔آصف نے ''محبت اور خدا'' شروع کی تھی تو گرودت اس کے ہیرو تھے۔ فلم تھوڑی ہی بنی تھی کہ گرودت کا انتقال ہو گیا اور سنجیو کمار اس عظیم فلم کے ہیرو منتخب ہوئے۔ اس کے فوراً بعد ہی فلم کے کیمرہ مین کا انتقال ہو گیا اور اس کے بعد اس خواب کی تعبیر دیکھنے والے کے۔آصف خود اس جہان فانی سے رخصت ہو گئے۔ کافی دنوں کے انتظار کے بعد جب فلم کو پھر سے بنانے کا ارادہ کیا تو کے۔آصف مرحوم کی دونوں بیواؤں میں جھگڑا ہو گیا اور فلم رُک گئی۔ کافی عرصہ بعد فلم ''تیری مہربانیاں'' کے فلمساز کے۔سی۔بوکاڈیا نے سارے معاملات طے کرنے کے بعد اس فلم پر کام کرنا شروع کیا تو سنجیو کمار ہارٹ اٹیک کا شکار ہو گئے، اور جب موت کے منہ سے واپس آ کر سنجیو کمار نے اس فلم کی تھوڑی سی ڈبنگ شروع کی ہی تھی کہ موت کے ظالم ہاتھوں نے ہم سے اُس عظیم فنکار کو چھین لیا...... کیا یہ سب اتفاقات تھے یا قدرت کو ان اتفاقات کے پیچھے کچھ اور ہی منظور تھا......؟

سنجیو کمار کی والدہ کی خواہش تھی کہ وہ اپنی زندگی میں سنجیو کمار کی بیوی کا مسکراتا ہوا چہرہ دیکھ لیں۔ مگر ان کی یہ خواہش ان کی زندگی میں تو کیا، سنجیو کمار کی زندگی میں بھی پوری نہ ہو سکی۔ ابھی سنجیو کمار پندرہ برس کے ہی تھے کہ ایک لڑکی سے ان کی منگنی کر دی گئی مگر چھ ماہ بعد ہی یہ رشتہ ٹوٹ گیا۔ فلمی دنیا میں کامیابی حاصل کرنے کے بعد سنجیو کمار نے اداکارہ ہیما مالینی سے پہلا پیار کیا مگر بات شادی تک نہ پہنچ سکی۔ اس کے بعد جے شری ٹی، نیتا مہتا، شوبھنا سنگھ اور سلکھشنا پنڈت سے ان کے رومانس کی خبریں آتی رہیں مگر

شادی اُن کی قسمت میں نہیں تھی۔ اس لئے وہ کنوارے ہی اِس دُنیا سے رُخصت ہو گئے۔

سنجیو کمار اپنے آپ میں نہایت ہی ملنسار، خلیق اور مخلص قسم کے انسان تھے۔ انہوں نے خود اپنی زندگی میں بہت سی مصیبتوں کا سامنا کیا مگر دوسروں کے دکھ درد میں ہمیشہ کام آئے اور ایک مثالی انسان ہونے کا ثبوت دیا۔ انہوں نے زندگی میں کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہا اور وقت پڑنے پر ہمیشہ لوگوں کی مدد کی۔

ایک بار فلم "چہرے پہ چہرہ" کی آؤٹ ڈور شوٹنگ کے لئے یونٹ کے تمام لوگ گوا جا چکے تھے۔ عین وقت پر فنانسر نے دھوکہ دے دیا اور کہا کہ تم گوا جاؤ اور میں وہیں پیسہ لے کر آتا ہوں۔ اس بات سے مایوس ہو کر فلمساز نے شوٹنگ کینسل کرنے کا پروگرام بنایا مگر جب یہی بات سنجیو کمار کو معلوم ہوئی تو انہوں نے پروڈیوسر سے کہا کہ تم گوا جاؤ، شوٹنگ شیڈیول کینسل نہیں ہوگا۔ یہ شیڈیول لگ بھگ چھ لاکھ روپے کا تھا۔ پروڈیوسر کے پاس دو لاکھ روپے تھے، وہ لے کر پروڈیوسر چلا گیا۔ اگلے روز سنجیو کمار ڈھائی لاکھ روپے لے کر گوا پہنچ گئے اور کہا کہ آرٹسٹوں کی قسطیں دینے کی ضرورت نہیں ہے۔ ساڑھے چار لاکھ میں شوٹنگ مکمل کرلو۔ اس طرح اس فلم کے میک اپ کے سلسلہ میں لندن جانے کی بات آئی تو سنجیو کمار نے اس سفر کا خرچہ خود اپنے ذمہ لے لیا۔

اس طرح کی اور بھی کئی مثالیں ہیں مگر سنجیو کمار جیسے کتنے ہیں فلم انڈسٹری میں؟

سنجیو کمار کی پہچان اسٹار کے طور پر کبھی نہیں رہی بلکہ شروع سے ہی ان کو ایک بہترین ایکٹر، ایک سمجھدار اداکار کے طور پر پہچانا گیا۔ ان کی اداکارانہ صلاحیتوں کی بنا پر ہی لوگوں نے انہیں دلیپ کمار کے برابر کا اداکار مانا ہے۔ انہوں نے ایک ہی فلم "نیا دن نئی رات" میں نو مختلف قسم کے کردار ادا کر کے فلم بینوں پر یہ ثابت کر دیا تھا کہ ان میں اداکاری کی بے پناہ صلاحیت موجود ہے۔

سنجیو کمار اب نہیں ہیں مگر جن کرداروں کو انہوں نے اپنی اداکاری سے زندگی بخشی ہے وہ ایک لمبے عرصے تک سنجیو کمار کی یاد کو لوگوں کے دلوں سے بھلانے نہیں دیں گے۔

OO

محمد رفیع

محمد رفیع ۲۴؍دسمبر ۱۹۲۴ء کو ضلع امرتسر کے کوٹلہ سلطان سنگھ نامی ایک قصبہ میں پیدا ہوئے، جو اَب پاکستان میں ہے۔ ان کے والد کا نام حاجی علی محمد اور والدہ کا نام اللہ رکھی تھا۔ محمد رفیع کے دادا بڑے مذہبی قسم کے انسان تھے۔ وہ دن ہندوستان کی تاریخ کا ایک عظیم دن تھا، اور کوئی نہیں جانتا تھا کہ آج کے دن پیدا ہونے والا یہ بچہ ایک دن ساری دنیا میں اپنے نام کی دھوم مچا دے گا اور پوری کائنات اس کی آواز کے سحر میں کھو جائے گی۔ محمد رفیع کو بچپن میں ہی گانے کا شوق پیدا ہو گیا تھا۔ محمد رفیع کچھ بڑے ہوئے تو قدرت نے اُن سے وہ کام لینا شروع کر دیا جس کے لئے ان کو اس دنیا میں بھیجا گیا تھا۔ ابھی ان کے بچپن ہی کا زمانہ تھا کہ ایک فقیر اکثر ان کے محلے میں بھیک مانگتا ہوا گزرتا تھا اور بڑی درد بھری آواز میں نعت یا منقبت پڑھا کرتا تھا۔ رفیع بڑے غور سے اس فقیر کو سنتے تھے اور کبھی کبھی اس کی آواز کو دہراتے ہوئے اس کے پیچھے دور تک نکل جاتے تھے۔ محمد رفیع کے تایا نے جب ان کا یہ رنگ دیکھا تو ہمت افزائی کی اور صوفیوں کی محفلوں میں نعت و منقبت گانے کی اجازت دے دی۔ اس سلسلے میں ان کے بڑے بھائی محمد شفیع نے بھی ان کی بہت ہمت افزائی کی اور ان کو ایسے مواقع فراہم کرتے رہے جن میں وہ ریاض بھی جاری رکھ سکے۔ حالانکہ ان کے والد حاجی علی محمد، محمد رفیع کے گانے کے شوق کے بالکل خلاف تھے۔ تایا اور بھائی کی مدد سے انہوں نے موسیقی کی ابتدائی تعلیم پہلے فیروز نظامی سے حاصل کی اور بعد میں استاد وحید خاں سے باقاعدہ شرف تلمذ حاصل کیا۔

محمد رفیع کا بچپن کافی حد تک لاہور میں گزرا تھا۔ وہیں کسی محفل میں محمد رفیع ایک درد بھرا نغمہ گا رہے تھے۔ اُس محفل میں اتفاق سے اس زمانے کے مشہور موسیقار شیام سندر بھی موجود تھے۔ وہ محمد رفیع کی آواز سے بے حد متاثر ہوئے اور انہوں نے محمد رفیع کے تایا سے یہ خواہش ظاہر کی کہ ہم اس آواز کو فلمی گانوں میں پیش کرنا چاہتے ہیں۔ لہٰذا محمد رفیع نے ۱۸ برس کی عمر میں شیام سندر کی موسیقی میں پنجابی فلم ''گلِ بلوچ'' کے لئے زینت بیگم کے ساتھ پہلا نغمہ ۲۸ فروری ۱۹۴۱ء کو لاہور میں ریکارڈ کرایا، لیکن اس گیت کو زیادہ مقبولیت حاصل نہ ہو سکی۔ کچھ دنوں تک محمد رفیع نے لاہور کے آل انڈیا ریڈیو میں ملازمت بھی کی، مگر ۱۹۴۳ء میں انہوں نے مقبول اداکار الناصر کے مشورے پر ملازمت ترک کر کے بمبئی کا رُخ کیا اور ۱۹۴۴ء میں محمد رفیع بمبئی کی فلمی دنیا میں داخل ہو گئے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب آواز کی دنیا میں کندن لال سہگل اور طلعت محمود جیسے منجھے ہوئے گلوکاروں کا سکہ چلتا تھا اور لوگ ان کی آوازوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ محمد رفیع خود بھی کے۔ ایل۔ سہگل سے بے حد متاثر تھے۔ ایک بار ۱۹۳۸ء میں لاہور ہی میں کے۔ ایل۔ سہگل کا ایک اسٹیج پروگرام ہو رہا تھا۔ درمیان میں لاؤڈ اسپیکر خراب ہونے کی وجہ سے پروگرام کے منتظم پیارے لعل سود نے ۱۴ برس کے محمد رفیع کو اسٹیج پر گانے کے لئے بلا لیا۔ رفیع نے اپنے گانے سے تھوڑی ہی دیر میں سامعین کو متاثر کر دیا۔ اسٹیج پر موجود سہگل نے خود رفیع کے گانے سے متاثر ہو کر انہیں شاباشی دی اور دعا بھی دی کہ تم ایک دن بہت بڑے گلوکار بنو گے۔

محمد رفیع نے بمبئی آ کر ۱۹۴۴ء میں شیام سندر کی ہی موسیقی میں فلم ''گاؤں کی گوری'' کے لئے پہلی مرتبہ گیت ریکارڈ کرایا۔ حالانکہ یہ گیت بھی زیادہ مقبول نہ ہو سکا۔ موسیقار نوشاد علی ۱۹۴۴ء میں ایک فلم ''پہلے آپ'' کا میوزک تیار کر رہے تھے۔ اس فلم میں ایک گانا فوجی پس منظر کا تھا۔ وہ وقت دوسری عالمی جنگ عظیم کا پُرآشوب دور تھا۔ محمد رفیع اور شیام بھی اس گانے کے کورس میں تھے۔ اس زمانے میں ڈبنگ اور مکسنگ کی

تکنیک نہیں تھی، لہٰذا ہر طرح کی آوازیں ریکارڈنگ کے وقت ہی نکالنی ہوتی تھیں۔ بمبئی کے چور بازار سے ملٹری کے بہت سے جوتے منگوائے گئے اور تقریباً دس دن تک اس گانے کی ریہرسل ہوئی۔ کئی لوگوں کے پیروں میں چھالے پڑ گئے اور جس دن وہ گانا ریکارڈ کیا گیا تو محمد رفیع کے پیروں سے بھی خون چھلکنے لگا۔ مگر فن کے لیے ہر طرح کی جدوجہد کرنے والے محمد رفیع کے چہرے پر شکن تک نہ آئی۔ اس گانے کے بول تھے......

ہندوستان کے ہم ہیں ہندوستان ہمارا ہے
ہندو مسلم ہم دونوں کی آنکھوں کا تارا ہے

اس کے بعد اگلے ہی برس کے۔ آصف کے ماموں، فلمساز نذیر احمد کی فلم ''لیلیٰ مجنوں'' میں محمد رفیع نے نہ صرف گیت گایا، بلکہ اداکاری بھی کی۔ بعد ازآں فلم ''سماج کو بدل ڈالو'' اور ''جگنو'' میں انہوں نے گلوکاری بھی کی اور دلیپ کمار کے ساتھ اداکاری بھی کی۔ فلم ''جگنو'' میں ملکۂ ترنم نور جہاں کے ساتھ ان کا گایا نغمہ...... ''یہاں بدلہ وفا کا بے وفائی کے سوا کیا ہے'' اتنا مقبول ہوا کہ محمد رفیع نے اداکاری کا جنون سر سے اُتار پھینکا اور اپنی ساری توجہ گلوکاری کی طرف موڑ دی۔ ۱۹۴۶ء میں ریلیز ہوئی فلم ''انمول گھڑی'' میں محمد رفیع کا گایا ہوا نغمہ...... ''تیرا کھلونا ٹوٹا بالک'' نے محمد رفیع کی شہرت میں چار چاند لگا دیے۔ اس فلم میں ملکۂ ترنم نور جہاں ہیروئن تھیں اور وہ اپنے گانے خود ہی گایا کرتی تھیں۔

مہاتما گاندھی کی شہادت کے بعد محمد رفیع نے ایک پرائیویٹ ریکارڈنگ کمپنی کے لیے راجندر کرشن کا لکھا نغمہ...... ''سنو سنو اے دنیا والو، باپو کی یہ امر کہانی......'' کچھ اس انداز سے گایا کہ کے۔ایل سہگل اور پنڈت پلسیکر بھی حیران رہ گئے۔ اس نغمہ کی موسیقی حسن لعل بھگت رام نے ترتیب دی تھی، اور محمد رفیع کی آواز نے اس نغمہ کے ذریعہ ہندوستانی عوام کے دلوں پر بہت اثر کیا۔ یہ ایک غیر فلمی نغمہ تھا۔

کچھ عرصہ بعد ہی موسیقار نوشاد علی کی دھنوں پر فلم ''بیجو باورا'' میں انہوں نے اپنی آواز کا ایسا جادو جگایا کہ لوگ آج تک اس جادو کے اثر سے نکل نہیں پائے۔

۱۹۵۴ء میں ریلیز ہوئی فلم ''بیجو باورا'' میں نوشاد علی کی موسیقی سے سجے یہ دونوں نغمے ہر زمانے میں یادگار بنے رہیں گے اور ان کی تازگی کبھی ختم نہ ہوگی۔ ''من تڑپت ہری درشن کو آج...... '' اور ''او دنیا کے رکھوالے، سن درد بھرے میرے نالے......'' یہ دونوں بھجن شکیل بدایونی نے تحریر کیے تھے۔ ان میں پہلا بھجن راگ مالکوس اور دوسرا راگ درباری میں تیار کیا گیا تھا۔

چار دہائیوں تک محمد رفیع کی آواز کائنات کے گوشہ گوشہ میں گونجتی رہی۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا کہ نوشاد کی موسیقی میں شکیل بدایونی کا لکھا نغمہ محمد رفیع کی آواز میں مقبول ہونے کی ضمانت بن گیا اور ان تینوں کی ٹیم نے بے شمار کامیاب اور مقبول ترین نغمے ہندوستانی فلموں کو دیے۔ نوشاد کے علاوہ ایس۔ ڈی۔ برمن کی موسیقی میں ترتیب دیئے گئے محمد رفیع کے نغمے بھی بے حد مقبول ہوئے۔ جیسے ''کاغذ کے پھول، گائیڈ، تیرے گھر کے سامنے'' اور ''پیاسا'' وغیرہ فلموں کے گیت آج بھی کانوں میں گونجتے ہیں۔

اداکار شمی کپور کی کچھ فلموں، ''کشمیر کی کلی، برہمچاری'' اور ''تیسری منزل'' کے گانے تو جیسے یادگار بن گئے ہیں۔ اسی طرح راجندر کمار کے لیے انہوں نے فلم ''میرے محبوب، سورج'' اور ''آرزو'' میں یادگار نغمے گائے ہیں۔

درمیان میں کچھ دنوں کے لئے کشور کمار نے نئی نسل کو اپنی طرف متوجہ ضرور کیا، مگر محمد رفیع نے اپنی ثابت قدمی سے اس بات کا ثبوت دے دیا کہ سچے فنکار کے لئے وقت اور حالات کے نشیب و فراز کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ محمد رفیع کیونکہ سچے فنکار تھے، اس لئے وہ اس معمولی تبدیلی سے قطعی دلگیر نہیں ہوئے اور نہ ہی ان کے معمولات میں کوئی فرق آیا اور ان کے ہونٹوں کی مسکراہٹ ایسے وقت میں بھی قائم رہی۔ یہاں تک کہ مرتے وقت بھی ان کی مسکراہٹ نے ان کے ہونٹوں کا ساتھ نہیں چھوڑا، اور جلد ہی انہوں نے ۱۹۷۰ء میں ریلیز ہوئی ناصر حسین کی فلم ''ہم کسی سے کم نہیں'' اور فلمساز وہدایتکار من موہن دیسائی کی فلم ''امر اکبر انتھونی'' سے اپنی موجودگی کا احساس کرایا، اور نغمہ...... ''کیا ہوا تیرا وعدہ......'' کے لیے اس وقت کے صدر جمہوریہ ہند جناب نیلم

سنجیوا ریڈی کے ہاتھوں محمد رفیع کو چاندی کے کمل کے قومی اعزاز سے سرفراز کیا گیا۔

محمد رفیع نے اپنی آواز کی چالیس سالہ زندگی میں ۳۶/زبانوں میں ۳۰/ہزار سے زائد گیت گائے۔ دنیا کے کسی حصے میں ایسا گلوکار پیدا نہیں ہوا، اور وہ ہندوستان کے واحد گلوکار تھے جن کے گائے ہوئے مقبول گیتوں کا فیصد سب سے زیادہ رہا۔ ان کے فن کا دائرہ دھنک کی طرح رنگارنگ اور پُرکشش تھا۔ اگر ان کے مقبول گیتوں کا ہی حوالہ دینا شروع کیا جائے تو ایک کتاب الگ سے تیار ہو سکتی ہے۔ محمد رفیع نے ہندوستان کی کئی علاقائی زبانوں کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی کئی گیت گائے تھے۔

محمد رفیع کی آواز میں بے پناہ لچک تھی۔ ان کا اپنا کوئی مخصوص انداز یا اسٹائل نہیں تھا، بلکہ وہ ہر کسی کے لئے خوش اسلوبی کے ساتھ گا لیتے تھے۔ وہ جس اداکار کے لئے اپنی آواز دیتے تھے، پردۂ سیمیں پر معلوم ہوتا تھا کہ وہ اداکار خود گا رہا ہے۔ ان کی آواز کی یہ خوبی ان کے لئے قدرت کا عظیم ترین عطیہ تھا۔ اداکاروں کی مناسبت سے آواز بدلنے پر اُن کو ملکہ حاصل تھا۔ آواز کی یہ خوبی آج تک کسی گلوکار میں پیدا نہیں ہو سکی۔ محمد رفیع کو اپنی آواز اور الفاظ کی ادائیگی پر مکمل گرفت حاصل تھی۔ سنگیت کی ہر لَے پر انہیں کنٹرول تھا اور سُروں کے نشیب و فراز پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ بڑے بڑے استادِ فن بھی ان کی گائیکی کا لوہا مانتے تھے۔ استاد فیاض خاں نے انہیں ''بے عیب سُروں والا فنکار'' کہا تھا۔

محمد رفیع نے ہر موضوع پر بہترین نغمے گائے ہیں۔ نعت، قوالی، بھجن اور شوخی بھرے عاشقانہ گیت گانے میں ان کا منفرد مقام تھا۔ اس کے علاوہ محمد رفیع نے حب الوطنی کے نغمے جس جذبے سے گائے ہیں، ان کا بھی کوئی ثانی نہیں ہے۔ یہ ایسے نغمے ہیں جن کو سن کر بچے بوڑھے اور جوان، سب حب الوطنی کے جذبے سے سرشار ہو جاتے ہیں۔ آج بھی یوم آزادی اور یوم جمہوریہ پر سب سے زیادہ محمد رفیع کے گائے ہوئے نغمے ہی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ نشر کیے جاتے ہیں۔ ان میں فلم ''مجھے جینے دو'' کا نغمہ...... ''اب کوئی گلشن نہ اجڑے، اب وطن آزاد ہے''، فلم ''سکندر'' کا نغمہ...... ''جہاں ڈال ڈال

پر سونے کی چڑیاں کرتی ہیں بسیرا''، فلم ''آنکھیں'' کا نغمہ...... ''اس ملک کی سرحد کو کوئی چھو نہیں سکتا''، فلم ''شہید'' کا نغمہ...... ''وطن کی راہ میں وطن کے نوجواں شہید ہوں''، فلم ''لیڈر'' کا نغمہ...... ''اپنی آزادی کو ہم ہرگز بھلا سکتے نہیں''، فلم ''جاگرتی'' کا نغمہ...... ''ہم لائے ہیں طوفان سے کشتی نکال کے''، اور فلم ''حقیقت'' کا نغمہ...... ''کر چلے ہم فدا جان وتن ساتھیو!'' بے مثال اور مقبول ترین نغمے ہیں۔

محمد رفیع کے گائے ہوئے گیتوں میں سب سے عجیب اور غیر معمولی گیت وہ ہیں جو انہوں نے اداکار شمی کپور اور مزاحیہ اداکار جانی واکر کے لئے گائے ہیں۔ یہ گیت اتنے پیچیدہ ہیں کہ ان کا گانا ہر کس وناکس کے بس کی بات نہیں۔ ان گیتوں میں شوخی کا انداز بھی بڑا مہذب ہے۔ شمی کپور جیسے کھلنڈرے نوجوان کے ہونٹوں پر یہ گیت ایسے سجتے تھے کہ اس کی اپنی شخصیت کا ایک حصہ معلوم ہوتے تھے۔ دلیپ کمار ہوں یا جانی واکر، شمی کپور ہوں یا محمود، یا جتندر اور امیتابھ بچن یا رشی کپور...... محمد رفیع نے ہر کسی کے لئے الگ الگ انداز میں اپنی آواز کو مولڈ کیا ہے اور گیت سننے والے بہ آسانی یہ پہچان جاتے تھے کہ یہ گیت فلاں اداکار کے لئے گایا ہوا ہے۔ ان گیتوں سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ محمد رفیع گیت گاتے وقت اداکار اور کردار کی نفسیات، اس کے عادات واطوار کا کتنا خیال رکھتے تھے۔ محمد رفیع کے گائے ایسے سبھی گیت بے پناہ مقبول ہوئے ہیں۔ محمد رفیع نے فلمی دنیا کے اس وقت کے تقریباً سبھی بڑے چھوٹے اداکاروں کے لیے نغمے گائے ہیں۔ دلیپ کمار، راجندر کمار، جیتندر، بھارت بھوشن، جانی واکر، شمی کپور، جوائے مکھر جی، اور بسواجیت جیسے اداکار تو رفیع کے گائے نغموں کو ہی ترجیح دیتے ہیں۔ گلوکار کشور کمار کے لیے بھی فلم ''راگنی، باغی شہزادہ'' اور ''شرارت'' میں محمد رفیع نے اپنی آواز دی ہے۔

رفیع کی ایک سب سے بڑی خوبی جو بہت کم گلوکاروں میں ہوتی ہے، یہ تھی کہ وہ بہت جلد گیت کے مزاج کو سمجھ لیتے تھے اور میوزک ڈائرکٹر کی خواہش کے مطابق گیت ریکارڈ کرا دیا کرتے تھے۔ رفیع کی آواز کچھ بھی گانے کے لئے ایسی موزوں تھی کہ کمپوزر کو کبھی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تھی۔ وہ بڑی آسانی سے غزل، گیت، راگ،

بھجن، پاپ سانگ، نغمہ، مرثیہ، قوالی، سہاگ وغیرہ سب کچھ گا سکتے تھے۔
محمد رفیع ایک عظیم گلوکار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک بہترین انسان بھی تھے۔ میوزک ڈائرکٹر چھوٹا ہو یا بڑا، وہ ہر کسی کو تعاون دینے کے لئے ہر وقت تیار رہتے تھے۔ فلمی دنیا جو اپنے اسکینڈلوں کی وجہ سے کافی بدنام ہے، اسی کیچڑ میں رفیع جیسا آبدار موتی بھی تھا، جس کے ساتھ کبھی کوئی اسکینڈل منظر عام پر نہیں آیا۔ نہ کبھی محمد رفیع نے شہرت حاصل کرنے کے لئے گھٹیا اور سستے قسم کے فلمی ہتھ کنڈے استعمال کئے۔ اپنے بیوی بچوں سے محمد رفیع کو بہت محبت تھی۔ وہ فلمی پارٹیوں میں جانے کے بجائے اپنا زیادہ تر وقت اپنے گھر والوں کے ساتھ گزارنا پسند کرتے تھے۔ وہ ایک مذہبی قسم کے نہایت ہی نیک دل انسان تھے اور غریبوں اور حاجت مندوں کی بڑی خاموشی سے مدد کیا کرتے تھے۔ وہ پابندی سے نماز بھی پڑھا کرتے تھے اور ایک بار حج بھی کر آئے تھے۔
محمد رفیع کی شریک حیات بلقیس بیگم نے ایک بار بتایا تھا کہ وہ اپنے کام کے معاملے میں بہت سنجیدہ رہتے تھے اور باقاعدہ ریہرسل کے بعد ہی ریکارڈنگ کرایا کرتے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ وہ اپنا ذاتی ریکارڈنگ اسٹوڈیو قائم کریں۔ وہ کسی اسپتال کے لئے ایک ڈائلاسس مشین بھی عطیہ کرنا چاہتے تھے اور ایک مسجد تعمیر کرانے کی بھی ان کی تمنا تھی۔ مگر وقت نے انہیں مہلت نہ دی اور اُن کی یہ خواہشیں پوری نہ ہو سکیں۔
۱۹۶۷ء میں حکومت ہند کی طرف سے صدر جمہوریہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے محمد رفیع کو پدم شری کے اعزاز سے نوازا...... اور بہترین گلوکار کے لیے پہلی بار ۱۹۶۰ء میں فلم ''چودھویں کا چاند'' کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا، اور پھر ۱۹۶۲ء میں فلم ''سسرال''، ۱۹۶۴ء میں فلم ''دوستی''، ۱۹۶۷ء میں فلم ''سورج''، ۱۹۶۸ء میں ''نیل کمل'' اور ۱۹۷۷ء میں فلم ''ہم کسی سے کم نہیں'' کے لئے محمد رفیع کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ فلم ''دوستی'' کے گیت...... ''چاہوں گا میں تجھے سانجھ سویرے......'' کے لیے بھی اُن کو فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا تھا۔ محمد رفیع کو کل چھ بار فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا، جبکہ ان کے گائے ہوئے بہترین نغموں کی تعداد سینکڑوں میں ہے۔

آج محمد رفیع ہمارے درمیان نہیں ہیں، ان کو رخصت ہوئے کافی عرصہ ہو چکا ہے۔ اس عرصہ میں محمد رفیع کی کمی کا احساس بار بار ہوا ہے، لیکن دُور دُور تک نظر دوڑانے پر بھی محمد رفیع کا نعم البدل ہمیں کوئی دکھائی نہیں دیتا۔ اب کون ہے جو ایک ہی وقت میں عظیم فنکار ہونے کے ساتھ ساتھ بہترین انسان ہونے کا ثبوت بھی دے؟ اب کون ہے جس کی آواز میں غزل کی مٹھاس ہو...... جس کی آواز میں نوجوان عاشق کی اُمنگ ہو...... جس کی آواز میں گیت کا درد ہو...... جس کی آواز میں حب الوطنی کا جوش وخروش ہو...... جس کی آواز میں ایک باغی کی جھلاہٹ ہو...... جس کی آواز میں قوالی کی عقیدت ہو...... جس کی آواز میں بھجن کی شردھا ہو...... جس کی آواز میں پیار کی مدھر راگنیاں ہوں...... اور جس کی آواز ہر دل کی ترجمانی کر سکے......؟

محمد رفیع نے اپنی زندگی میں کئی ایسے درد بھرے گیت بھی گائے ہیں جن کو سن کر آج بھی آنکھیں نم ہو جاتی ہیں۔ جب محمد رفیع فلم ''نیل کمل'' کا گانا...... ''بابل کی دعائیں لیتی جا، جا تجھ کو سکھی سنسار ملے......'' کی ریکارڈنگ کرا رہے تھے تو خود ان کی آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑیاں بہہ رہی تھیں۔ آج بھی کسی بیٹی کی رخصتی کے وقت جب یہ گانا بجتا ہے تو حاضرین کی آنکھوں میں نمی آجاتی ہے۔

دادا مُنی اشوک کمار شروع سے ہی اپنے گانے خود گایا کرتے تھے۔ مگر جب انہوں نے پلے بیک لینا شروع کیا تو سب سے پہلے سی۔ رام چندر کی موسیقی میں فلم ''ساجن'' میں محمد رفیع کا گانا ہی ان کے ہونٹوں کی زینت بنا۔ محمد رفیع نے سب سے زیادہ گانے آشا بھونسلے اور منا ڈے کے ساتھ گائے تھے اور لکشمی کانت پیارے لعل کی موسیقی میں انہوں نے سب سے زیادہ گانے ریکارڈ کرائے تھے۔ شاستریہ سنگیت یعنی کلاسیکل موسیقی پر مبنی جتنے فلمی گانے محمد رفیع نے گائے ہیں، اُتنے کسی دوسرے گلوکار کے حصہ میں نہیں آئے۔ محمد رفیع کے گائے ہوئے تقریباً ۵؍ہزار نغموں کا ایک انتخاب بھی ''میرے گیت تمہارے ہیں'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ محمد رفیع نے سب سے زیادہ دو گانے لتا منگیشکر کے ساتھ گائے تھے۔ مگر گیتا دت اور آشا بھونسلے کے ساتھ گائے ہوئے

دوگانوں کی تعداد بھی کچھ کم نہیں ہے۔

۲۶ر جولائی ۱۹۸۰ء کو محمد رفیع نے موسیقار لکشمی کانت پیارے لعل کی ترتیب دی ہوئی دھن پر فلم ''آس پاس'' کے لئے لتا منگیشکر کے ساتھ اپنی زندگی کا آخری گیت...... ''شہر میں چرچا ہے......'' کی ریکارڈنگ کرائی، اور خلاف معمول موسیقار سے کہا...... ''میں چلوں......''۔ موسیقار لکشمی کانت نے انہیں روک لیا اور جاتے جاتے ایک غزل سنانے کی فرمائش کی۔ محمد رفیع نے غزل سنائی اور پھر بڑے عجیب انداز میں کہا۔ ''اچھا، اب میں چلتا ہوں۔'' ......اور وہ چلے گئے۔ ۳۱ر جولائی ۱۹۸۰ء کی شب میں دس بج کر بیس منٹ پر محمد رفیع کو دل کا دورہ پڑا......اور وہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملے۔ یکم اگست کو جب محمد رفیع کے جنازے کو قبرستان لے جا رہے تھے تو جیسے آسمان بھی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑا۔ ہزاروں آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں اور بارش کے موسم میں لوگ بڑی تعداد میں ان کے جنازے میں شامل ہوئے۔

وقت کا مرہم محمد رفیع سے ہماری جدائی کے زخم کو تو بھر دے گا، مگر آواز کی دنیا کے اس خلاء کو شاید کبھی پُر نہ کر سکے گا جو رفیع کے اس طرح اچانک کم عمری میں ہی چلے جانے سے پیدا ہو گیا ہے۔

آج ہمارے درمیان نہ ہوتے ہوئے بھی ایسا لگتا ہے کہ رفیع اب بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ان کی آواز اب بھی ہمیں ان کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ وہ صرف محمد رفیع کی آواز نہیں، بلکہ ان کی روح ہے جو ہمیشہ زندہ رہے گی۔ کیونکہ روح کو موت نہیں آتی۔ اس لئے محمد رفیع بھی ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ آواز کی دنیا کے بادشاہ کو موت کیسے آسکتی ہے......؟ انہوں نے خود ہی فلم ''جھک گیا آسمان'' کے لیے ساحر کا لکھا نغمہ گایا تھا......

جسم کو موت آتی ہے لیکن
روح کو موت آتی نہیں ہے

OO

راج کمار

۸/اکتوبر ۱۹۲۷ء کو لاہور (پاکستان) میں ایک کشمیری برہمن جاگیشور ناتھ پنڈت کے گھر میں ایک لڑکے کا جنم ہوا۔ ماں باپ نے اس کا نام رکھا کل بھوشن ناتھ سکند۔ نو بہن بھائیوں میں کل بھوشن کا نمبر پانچواں تھا۔ اس وقت اس لڑکے کے ماں باپ یا خاندان والوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ بڑا ہوکر یہ لڑکا واقعی اپنے کل کا بھوشن بنے گا یعنی خاندان کے نام میں چار چاند لگانے والا، خاندان کا نام روشن کرنے والا۔ مگر ایسا ہی ہوا، کیونکہ بڑا ہوکر ہی وہ لڑکا ہندوستانی فلمی دنیا میں راجکمار کے نام سے لگ بھگ ۴۵/برسوں تک اپنے خاندان کا نام روشن کرتا رہا۔

راجکمار نے اپنی گریجویشن تک کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد پولیس میں ملازمت کر لی اور سب انسپکٹر بن گئے۔ راجکمار کو فلمیں دیکھنے اور ان میں کام کرنے کا شوق تو تھا مگر ان کی شکل وصورت عام روایتی ہیرو جیسی نہ تھی۔ لہٰذا نہ تو ان کو فلموں میں کوئی کام دیتا تھا اور نہ ہی وہ خود ایسی کوئی کوشش کر سکے جس سے فلموں میں ان کا داخلہ ہو سکتا۔

فلموں میں راجکمار کا داخلہ کیسے ہوا، اس کی بھی ایک دلچسپ کہانی ہے۔ ہوا یوں کہ اُن دنوں نجم نقوی نام کے ایک فلمساز وہدایتکار ہوا کرتے تھے، جنہوں نے ''پنّا، کنگن، ایکٹریس'' اور ''سمراٹ'' جیسی کامیاب اور سلور جوبلی فلمیں بنائی تھیں۔ نجم نقوی صاحب اتر پردیش کے مردم خیز شہر امروہہ کے رہنے والے تھے اور نہایت دلچسپ انسان تھے۔ ان دنوں نجم نقوی فلم ''رنگیلی'' کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ فلم کی ہیروئن کے لئے مشہور اداکارہ ریحانہ کا انتخاب ہو چکا تھا۔ ایک دن نجم نقوی صاحب کی کار کا

ایکسیڈینٹ ہو گیا اور اُن کا کیس راجکمار کے پاس پہنچ گیا۔ راجکمار ان دنوں ماہم (ممبئی) کے ایک تھانے میں تعینات تھے۔ راجکمار کی بیوی کا نام گائتری تھا اور وہ ایک زمانہ میں ایئر ہوسٹس رہ چکی تھیں۔

نجم نقوی کیونکہ ایک مشہور اور مصروف فلمساز وہدایتکار تھے اور ایکسیڈینٹ کے سلسلے میں کورٹ کچہری کے معاملے سے دور ہی رہنا چاہتے تھے، لہٰذا تفتیش کے دوران نقوی صاحب نے راجکمار سے کہا۔ ''میاں آپ کیا فلموں میں کام کرنا پسند کریں گے؟''

نقوی صاحب کی بات سن کر راجکمار نے شکایتاً ان سے کہا کہ کہتے تو سب ہیں مگر کام کوئی نہیں دیتا۔ نقوی صاحب نے نہایت سنجیدگی سے راجکمار کو اگلے دن اپنے اسٹوڈیو آنے کی دعوت دی۔ وہ راجکمار کی آواز اور ان کے بولنے کے انداز سے متاثر ہو چکے تھے اور اپنا کیس بھی نپٹانا چاہتے تھے۔ لہٰذا ایسا ہی ہوا۔ اگلے دن راجکمار جب نقوی صاحب کے اسٹوڈیو پہنچے تو نجم نقوی صاحب نے فلم ''رنگیلی'' کے لئے ریحانہ کے مقابل ہیرو کے رول کے لئے راجکمار کو سائن کر لیا۔ یہ اتنا بڑا آفر تھا راجکمار کے لئے کہ وہ حیران تھے۔ اس فلم میں ان کا کردار بھی پولس انسپکٹر کا ہی تھا۔ اس طرح راجکمار فلموں سے وابستہ ہو گئے اور نجم نقوی صاحب کا کیس بھی رفع دفع ہو گیا۔

۱۹۵۲ء میں فلم ''رنگیلی'' نمائش کے لئے پیش کی گئی اور فلم کی کامیابی کے ساتھ ہی راجکمار کو پہچان بھی ملی۔ اس کے بعد اسی سال راجکمار کی ایک اور فلم ''لاکھوں میں ایک'' کی نمائش ہوئی اور وہ فلم ناکام ہو گئی۔ اس کے بعد راجکمار کی اگلی دو فلمیں بھی ناکام ہو گئیں اور اس طرح ان کو اپنا فلمی مستقبل اندھیروں میں ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ مگر بھلا ہو دلیپ کمار کا، کہ انہوں نے نہ معلوم کس وجہ سے فلم ''مدر انڈیا'' میں کام کرنے سے انکار کر دیا۔ دراصل محبوب خان ''مدر انڈیا'' میں نرگس کے شوہر کا رول دلیپ کمار کو دینا چاہتے تھے۔ دلیپ کمار کے انکار کے بعد انہوں نے یہ کردار راجکمار کو سونپ دیا۔ حالانکہ فلم میں یہ کردار بہت چھوٹا تھا مگر راجکمار نے اپنی اداکاری اور محبوب خان نے اپنی ہدایتکاری سے اس کردار میں جان ڈال دی۔ اس فلم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ

قائم کیے اور اس کے ساتھ ہی راجکمار کی شہرت اور مقبولیت میں بھی اضافہ ہوا۔

''مدر انڈیا'' کے بعد راجکمار کئی فلموں جیسے ''نوشیروان عادل، نیل منی، شاہی بازار'' اور ''دلہن'' میں پردہ سیمیں پر جلوہ گر ہوئے۔ مگر ان میں سے کچھ ہی فلموں کو تھوڑی بہت کامیابی ملی۔ اس کے بعد ۱۹۵۹ء میں جیمنی کی فلم ''پیغام'' نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے۔ یہ فلم ایس۔ ایس۔ واسن کی ہدایت میں بنی تھی اور اس کے ہیرو تھے شہنشاہ جذبات دلیپ کمار۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور راجکمار کی جوڑی کو فلم بینوں نے بہت پسند کیا اور راجکمار ایک بار پھر شہرت کے آسمان پر چمکنے لگے۔

کمال امروہوی کی فلم ''دل اپنا پریت پرائی'' کی نمائش ۱۹۶۰ء میں ہوئی تھی جس میں مینا کماری، نادرہ کے ساتھ راجکمار کو بھی پسند کیا گیا۔ اس کے بعد ۱۹۶۱ء میں ''گھرانہ''، ۱۹۶۳ء میں ''دل ایک مندر''، ۱۹۶۴ء میں رامانند ساگر کی ''زندگی'' اور ۱۹۶۵ء میں مینا کماری کے ساتھ فلم ''کاجل'' میں راجکمار کو پسند کیا گیا اور یہ فلمیں کامیاب بھی ہوئیں۔

بی۔ آر۔ چوپڑہ کی فلم ''وقت'' ۱۹۶۵ء میں ریلیز ہوئی اور اس فلم نے راجکمار کو ایسی شہرت عطا کی جو بہت کم لوگوں کے نصیب میں آتی ہے۔ اس فلم کے دو مکالمے جو راجکمار نے ادا کیے تھے، عوام میں بے حد مقبول ہوئے اور لوگ سڑکوں پر ان مکالموں کو دوہراتے ہوئے دیکھے گئے۔ اس فلم کی کامیابی سے راجکمار صف اول کے اداکار بن گئے۔ اب فلموں میں راجکمار کی شخصیت کو سامنے رکھ کر کردار لکھے جانے لگے اور اُن کے مکالموں کی ادائیگی کے مخصوص انداز کی طرز پر مکالمے لکھے جانے لگے۔ اب راجکمار کی کامیاب فلموں کا دور شروع ہوا تو ''ہمراز، کاجل، میرے حضور، ہیر رانجھا'' اور ''نیل کمل'' جیسی فلموں نے راجکمار کی شخصیت، شہرت اور مقبولیت کو چار چاند لگا دیے۔

۱۹۷۲ء میں کمال امروہوی کی فلم ''پاکیزہ'' کو عالمی شہرت حاصل ہوئی اور اس فلم نے ہندوستان اور بیرون ملک کے کئی ایوارڈ حاصل کیے۔ اس فلم کے ہیرو تھے راجکمار...... اور راجکمار کی مخصوص مکالمہ ادائیگی نے اس فلم کے کردار میں جان ڈال دی

تھی۔ فلم "پاکیزہ" کے بعد راجکمار کی جو فلمیں آئیں ان میں ایک الگ ہی قسم کے راجکمار نظر آئے۔ انہوں نے وقت کے تقاضوں کو محسوس کر لیا تھا اور اس درمیان فلم بینوں کے مزاج میں جو تبدیلیاں آئی تھیں، ان کے مطابق اپنے کردار کا انتخاب کرنے لگے تھے۔ "دل کا راجہ، ہندوستان کی قسم، ایک سے بڑھ کر ایک، کرم یوگی، بلندی، قدرت، مرتے دم تک، جاں باز، گلیوں کا بادشاہ" وغیرہ ایسی ہی فلمیں تھیں جن میں راجکمار نے اپنی امیج کو بدلا تھا۔

فلم "پیغام" کے بعد کئی لوگوں نے اس بات کی کوشش کی کہ دلیپ کمار اور راجکمار کو پھر کسی فلم میں یکجا کیا جائے۔ مگر یہ موقع آیا لگ بھگ ۳۲ ربرس بعد فلم "سوداگر" کے فلمساز وہدایتکار سبھاش گھئی کے نصیب میں۔ فلم بینوں کی برسوں سے دلی خواہش کی تکمیل جب "سوداگر" کے روپ میں ہوئی تو اس فلم نے زبردست کامیابی حاصل کی۔

"سوداگر" کے بعد راجکمار کی فلموں "پولیس مجرم" اور "ترنگا" نے بھی کامیابی حاصل کی اور اس طرح راجکمار لگ بھگ ۴۵ ربرس تک فلمی دنیا سے جڑے رہے اور فلم بینوں کے دلوں پر راج کرتے رہے۔

فلمی پردے پر پوری آب و تاب کے ساتھ چمکنے والے اس شہرت یافتہ اداکار کی نجی زندگی پر ہمیشہ ایک دبیز پردہ پڑا رہتا تھا۔ دراصل راجکمار نے کبھی فلمی زندگی کو اپنی نجی زندگی میں گڈمڈ نہیں ہونے دیا۔ وہ فلمی پارٹیوں سے ہمیشہ دور رہتے تھے اور عام طور پر ایک سنکی اور بددماغ اداکار کے طور پر لوگ ان کو جانتے تھے۔ مگر راجکمار ایک دلچسپ شخصیت کے مالک تھے۔ اردو اور انگریزی ادب کا مطالعہ کرنا اُن کا محبوب مشغلہ تھا۔ انہیں کتے پالنے کا بھی بے حد شوق تھا۔ راجکمار کا تکیہ کلام تھا...... "جانی"۔ نہ صرف نجی محفلوں میں بلکہ فلموں کے مکالموں میں بھی وہ اپنے اس پسندیدہ لفظ "جانی" کا استعمال کر لیا کرتے تھے۔ ان کے موڈ کا آسانی سے پتہ نہیں لگایا جا سکتا تھا۔ کب کس کو کیا کہہ دیں، اور کس طرح پیش آئیں، اس کا اندازہ لگانا نہایت مشکل تھا۔ ایک بار ایک محفل میں مشہور اداکارہ زینت امان سے راجکمار نے کہا۔ "خوبصورت ہو، فلموں

میں کام کیوں نہیں کرتیں، ہم سفارش کر دیں گے۔"

راجکمار کی شخصیت کے بہت سے پہلو تھے۔ ایک بار پرکاش مہرہ کی ایک فلم میں انہوں نے صرف اس لئے کام کرنے سے انکار کر دیا تھا کہ بقول ان کے پرکاش مہرہ کے بالوں سے ایک خاص قسم کے تیل کی بو ان کو محسوس ہوئی تھی۔ راجکمار سگریٹ پینے کے بہت شوقین تھے۔ حالانکہ آخری دنوں میں بیماری کی وجہ سے اور ڈاکٹروں کی صلاح پر انہوں نے سگریٹ پینا لگ بھگ ترک کر دیا تھا۔ گولف کھیلنا اور سفید پینٹ شرٹ پر سفید جوتے پہننا بھی راجکمار کو بہت پسند تھا۔

چند برس پہلے کی بات ہے کہ فلمساز میہل کمار اپنی فلم "مرتے دم تک" کے لئے راجکمار کی موت کا ایک سین فلمبند کرنے میں مصروف تھے۔ شوٹنگ کے لئے لمبے چوڑے انتظامات کو دیکھ کر راجکمار نے میہل کمار کو پاس بلا کر اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ "جانی...... موت کے لئے اتنی تیاری کیوں؟ جب ہم دنیا سے جائیں گے تو کسی کو کانو کان خبر تک نہیں ہوگی۔" اس طرح انہوں نے اپنے الفاظ کو حقیقت میں ۳ر جولائی ۱۹۹۶ء کو کر دکھایا۔ کیونکہ ان کی موت کی خبر ان کے آخری رسومات کے بعد ہی ساری دنیا کو معلوم ہوئی۔ اپنی شرطوں پر زندگی گزارنے والے راجکمار نے اپنی موت کا انداز بھی اپنی مرضی سے ہی طے کیا۔

انیس امروہوی کی آئندہ پیش کش

باقی رہیں پرچھائیاں

اس کتاب میں شامل ہیں درج ذیل فلمی ہستیوں کی زندگی اور فن سے متعلق مضامین:

۱۔نرگس
۲۔اجیت
۳۔راجندر کمار
۴۔اوم پرکاش
۵۔کنہیالال
۶۔مقری
۷۔آرڈیشر ایرانی
۸۔اے۔آر۔کاردار
۹۔محبوب خان
۱۰۔ثریا
۱۱۔ونود مہرہ
۱۲۔امریش پوری
۱۳۔جلال آغا
۱۴۔کے۔این۔سنگھ
۱۵۔شیام کمار
۱۶۔ مرزا مشرف
۱۷۔منور سلطانہ
۱۸۔پروین بابی
۱۹۔پریا راجونش
۲۰۔ایس ڈی۔برمن
۲۱۔شمی کپور
۲۲۔آر۔ڈی۔برمن
۲۳۔مدن پوری
۲۴۔کیف بھوپالی
۲۵۔آغا
۲۶۔واسطی
۲۷۔مظہر خان
۲۸۔او۔پی۔رلہن
۲۹۔من موہن ڈیسائی
۳۰۔ہمانشو رائے
۳۱۔سپرو
۳۲۔نگار سلطانہ
۳۳۔علی رضا
۳۴۔شکیلہ
۳۵۔پردیپ کمار
۳۶۔ایتا
۳۷۔چترا سین
۳۸۔ستارہ دیوی
۳۹۔پریم ناتھ
۴۰۔راجندر کشن
۴۱۔نخشب جارچوی
۴۲۔غلام محمد
۴۳۔مراد
۴۴۔دیو آنند
۴۵۔اے۔کے۔ہنگل
۴۶۔حبیب تنویر
۴۷۔ایچ۔ایس۔رویل
۴۸۔اخترالایمان
۴۹۔فیروز خان
۵۰۔ راجیش کھنہ
۵۱۔ دویا بھارتی

ANEES AMROHVI
163, 2nd Floor, Street No. - 5,
J - Extension, Laxmi Nagar, Delhi - 110092
Ph: 011-22442572, 09811612373 Email: qissey@rediffmail.com